ISSN : 2394-5567
S.No. 18

Vol.: 6, Issues : 3 & 4
July - Dec. 2019

DABEER

Editor:-
Ahmad Naved Yasir Azlan Hyder

DABEER

July - December 2019

S. No. 18

جلد : ۶، شمارہ : ۳، ۴
جولائی-دسمبر ۲۰۱۹ء

ISSN : 2394-5567
S.No. 18

دبیر

مدیر
احمد نوید یاسر ازلان حیدر

ISSN:- 2394-5567 S.No. 18

بـخـوانـدم یکی مرد هندی دبیر سـخن گوی و گوینده و یادگیر (فردوسیؒ)

دبیر

(بین الاقوامی پیئر ریویوڈ ریفیر یڈ سہ ماہی ادبی و تحقیقی جریدہ)

جلد۔۶ شمارہ۔۳،۴

جولائی۔دسمبر ۲۰۱۹ء

☆ایـڈیـٹـر☆

احمد نوید یاسر ازلان حیدر

Mob. no. 09410478973

☆مراسلت کا پتہ☆

دبیر حسن میموریل لائبریری

۱۲۔چودھری محلّہ (جنوبی)، کاکوری، لکھنؤ۔۲۲۶۱۰۱

dabeerpersian@rediffmail.com

☆ریویو کمیٹی☆

پروفیسر آذرمی دخت صفوی، علی گڑھ

پروفیسر شریف حسین قاسمی، دہلی

پروفیسر عبدالقادر جعفری، الہ آباد

پروفیسر مسعود انور علوی کاکوروی، علی گڑھ

پروفیسر عمر کمال الدین کاکوروی، لکھنؤ

پروفیسر طاہرہ وحید عباسی، بھوپال

پروفیسر مظہر آصف، نئی دہلی

☆مجلس ادارت☆

پروفیسر سید حسن عباس، ڈائرکٹر رضا لائبریری، رامپور

پروفیسر سید محمد اسد علی خورشید، ڈائرکٹر آئی پی آر، اے ایم یو علی گڑھ

پروفیسر علیم اشرف خان، صدر شعبۂ فارسی، ڈی یو، دہلی

پروفیسر سید محمد اصغر، صدر شعبہ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی، صدر شعبۂ فارسی، مانو، حیدرآباد

ڈاکٹر محمد عقیل، صدر شعبہ فارسی، بی ایچ یو، وارانسی

ڈاکٹر افتخار احمد، شعبۂ فارسی، مولانا آزاد کالج، کلکتہ

ڈاکٹر محمد قمر عالم، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ڈاکٹر انجمن بانو صدیقی، شعبہ فارسی، کرامت کالج، لکھنؤ

☆معاون مدیر☆

ڈاکٹر محمد توصیف خان کاکر

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عاطفہ جمال

ریسرچ اسکالر، شعبۂ فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

فہرست مندرجات

	عنوان	مقالہ نگار	صفحہ
۱	اداریہ	ازلان حیدر	۵
۲	مولانا جلال الدین رومی کی عرفانی تعلیمات۔۔۔	پروفیسر علیم اشرف خان	۶
۳	احوال حضرت میر الٰہی	ڈاکٹر واحد احمد	۱۵
۴	عہد اکبری میں سنسکرت تراجم: مختصر جائزہ	ڈاکٹر محمد مبارک حسین	۱۹
۵	صوفیوں اور سنتوں کا آپسی اتحاد	ڈاکٹر نجیبہ اختر	۲۶
۶	فتح اللہ خاں شیبانی: حیات اور شاعری	ڈاکٹر سعد الدین	۳۲
۷	اقبال اور ٹیگور	ڈاکٹر عمر خلیق	۳۸
۸	اقبال سہیل کی فارسی شاعری	محمد یاسر	۴۶
۹	فارسی مراثی کے شعری قوالب: ایک تجزیاتی مطالعہ	علی اصغر	۵۳
۱۰	گرامی جالندہری کی شخصیت اور شاعری	عابد ابراہیم پارا	۶۸
۱۱	ایران میں اردو: تاریخ، تدریس، فروغ	عمران عاکف خان	۷۳
۱۲	سیرت نگاری کی ابتداء اور اہمیت ادب کے آئینے میں	شاہ وید میر	۸۴
۱۳	مرزا غالب کی حبسیہ شاعری	شاہد عالم	۹۰
۱۴	سوامی لکشمن پرشاد کی علوم اسلامیہ میں خدمات	محمد حاذق	۹۸
۱۵	عبدالحمید لاہوری کے پادشاہ نامہ کا اجمالی جائزہ	محمد شعبان	۱۰۸
۱۶	تذکرہ نویسی	محمد خان بیابانی	۱۱۸
	شخصیات		
	فارسی کے اساتذہ سیریز۔۲		
۱۷	پروفیسر غلام مرتضیٰ انصاری: شخصیت اور علمی کارنامے	پروفیسر رضوان اللہ آروی	۱۲۱
۱۸	نواب وقار الملک کی سیاسی خدمات	عدیل احمد	۱۴۷
	دکنیات		
۱۹	خواجہ جہاں: سلطنت بہمنی کا ایک ادب پرور وزیر	محمد احسان	۱۵۸

میراث خطی

۲۰	اودھ کی تہذیب وثقافت کا اہم فارسی مآخذ: انشای لچھمی نراین	ڈاکٹر محمد قمر عالم	۱۶۳
۲۱	تزک آصفیہ کے خطی نسخوں کا تعارف	شازیہ پروین	۱۷۵

چشم بینش

۲۲	مخمس کریمای سعدی	ڈاکٹر احمد حسن ندوی	۱۸۱
۲۳	نجات الرشید: عہد اکبری کی اہم تصنیف (ایک مطالعہ)	محمد سعد ظفر	۱۸۵

English Artilces

1	Relevance of moral values for peaceful co-existance	Prof. Latif Hussain Shah Kazmi	3
2	Parveen Eitsami: A real poetess	Dr. Bilques Bashir	18
3	Hidden treasures of Tagore's Land: collection of Arabic, Persian and Urdu manuscripts of Visva-Bharti	Sabahat Nausheen	23
4	History of Aligarh Heritage-1 Habib Manzil	Tarique Jameel Ansari	36
5	Mirat-ul-Akhbar: A dynamic persian newspaper in colonial India	Farzana Zeeshan	40
6	conditions of women in medieval India: in context of Sufism	Daud Ibrahim	48
7	Bhakti Movement in Awadh: A historical study of jagjivan and satnami tradition	Sadira Shahnaz	53

اداریہ

مصور کائنات کی تخلیقات میں ہر شئے حرف آخر نظر آتی ہے انسانی دماغ اپنی تمام تر لامحدود وسعتوں سے آگے پہنچنے کے بعد بھی خالق کی کسی بھی شئے پر چوں چرا کرنے لایق نہیں۔ جب خالق کائنات نے زمین کو خطوں سے مزین کرنا شروع کیا تو ہر ہر خطہ کو الگ الگ صفات سے آراستہ و پیراستہ کیا گیا، کہیں برفباری کے حسیں مناظر، تو کہیں نظروں کی حدود سے اونچے پہاڑ، کہیں سبزہ زار تو کہیں کوہسار، کہیں انسانوں کا بے پناہ ہجوم، تو کہیں میلوں پھیلا صحرا اور بیابان۔ مگر جب سرزمین ہندوستان پر نظر ڈالئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام خطّوں کی خصوصیات کو لاکر یہاں اکٹھا کر دیا گیا ہے اختلافات میں یکسانیت کی یہ مثال روئے زمین کے کسی دوسرے خطہ میں نظر نہیں آتی یہاں کشمیر میں برفباری کے دلفریب مناظر ہیں تو راجستھان صحرائی علاقہ، دکن میں چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں اور چٹیل میدان ہیں تو اتر پردیش بہار پنجاب سرسبز اپجاؤ زمین کے لئے مشہور اور تو اور الگ الگ جگہ کی اپنی اپنی بولی، اپنے تیوہار، اپنی زبان، اور مذاہب کا ایسا سنگم کہ دیکھتے ہی بنتا ہے۔ آج تک یہاں کے باشندے تمام مختلف مذاہب، تہذیب، زبان ہونے کے باوجود ہندوستان لفظ پر ایسے متفق تھے کہ عالم میں مثال تھے مگر عہد حاضر میں کچھ سیاسی جماعتوں نے اپنی دکان چمکانے اور کرسی بچانے کے لئے دہیرے دہیرے عوام میں مذہبی تشدد کا ایسا زہر گھولنا شروع کیا کہ ہندوستانیت کو مذہبیت کے دروازے پر پہنچا دیا۔ اس پر آشوب دور میں جہاں بہت سارے حالات پر لوگ نوحہ خواں ہیں وہیں مسلم قوم میں ایک الگ تحریک نظر آرہی وہ یہ کہ اس قوم کی مائیں اور بہنیں جن کے بارے میں عام خیال یہ تھا کہ وہ صرف گھر کی زینت ہوتی ہیں اور دنیاوی یا سیاسی چیزوں سے ان کا کوئی لینا دینا نہیں ہوتا انہوں نے حکومت وقت کے سامنے مذہبی تشدد کے خلاف ایسا محاذ کھول رکھا ہے کہ مجاز کے خواب کی تعبیر نظر آرہی ہے:

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

ہندوستان کے مختلف حصوں میں یہ احتجاجی خواتین حکومت کے ناپاک ارادوں کو ناکام بنانے کی کوشش میں سینہ سپر ہیں اور عزم کر چکی ہیں کہ حکومت کی مذہبی تعصب والی سیاست سے سرزمین ہند کو میلا نہ ہونے دیں گی۔ اللہ قوم کی خواتین کو مزید ہمت و حوصلہ عطا کرے اور اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین

ازلان حیدر

پروفیسر علیم اشرف خان
پروفیسر، شعبہ فارسی
دہلی یونیورسٹی، دہلی

مولانا جلال الدین رومی کی عرفانی تعلیمات اور عصر حاضر میں ان کی معنویت

مولانا جلال الدین رومی (۶۷۲۔۶۰۴ھ / ۱۲۷۳۔۱۲۰۷م) ایسے عارف وصوفی ہیں جنھوں نے اپنے عہد میں واقع معاشرے کی بدامنی، بے چینی اور تاریکی کو مٹانے کی عملی کاوش انجام دی۔ اگر اس عہد کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ بات کسی پر پوشیدہ نہیں رہے گی کہ ایران، عراق، مصر، روم، ترکستان اور حجاز کا ایک بڑا حصہ عہد جلال الدین رومی میں اخلاقی تنزلی کا شکار تھا جس کے نتیجہ میں اس عہد کو مورخین نے اخلاقی بنیادوں پر نہایت دیوالیہ عہد قرار دیا ہے۔ مزید برآں انہی نا مساعد حالات میں تاتاری یورشوں نے مسلم مملکتوں میں ویرانی کو اپنا فرض عین بنالیا تھا۔ اسی عہد پر مولانا سید ابوالحسن ندوی کی تاریخ دعوت وعزیمت کے پہلے حصے میں فتنۂ تاتار اور اسلام کی ایک نئی آزمائش کا ذکر اس طرح آیا ہے۔

> ''تاتاری یورشوں نے لگ بھگ سارے اہم مسلم مقبوضات کو پامال کر دیا، ہزاروں شہر اجاڑ دئے، علوم وفنون کے بڑے بڑے مرکز ویران ہو گئے۔ جن بستیوں میں علما وفضلا کا مجمع تھا تشنگان علوم کارواں در کارواں دن رات اترتے تھے وہ سب بے چراغ ہو گئیں، بخارا خاک کا ڈھیر ہو گیا، ساری آبادی تہ تیغ کر دی گئی، سمرقند جل کر راکھ ہو گیا۔ باشندے قتل ہو گئے، بلخ، رے، ہمدان، زنجان، قزوین، مرو، نیشاپور اور خوارزم جیسے عالم اسلام کی پیشانی کے چمکتے ستارے ٹوٹ کر مٹی میں مل گئے، عروس البلاد بغداد دنیائے اسلام کا جگمگاتا تاج ہلاکو کی وحشی اور خونخوار فوج کے ہاتھوں تاراج ہو گیا اور مسلم تہذیب وتمدن کی وہ یادگار جو صدیوں میں بنتے بنتے بنی تھی اچانک گرد وغبار کی طرح اڑ گئی۔ سیکڑوں سال تک جمع ہوتا رہنے والا علوم کا نادر خزانہ چالیس دن میں خاکستر ہو گیا۔ خلافت عباسیہ کا تنہا وارث خلیفہ مستعصم باللہ جو دنیا بھر کے مسلمانوں کی آبرو تھا اور اب صد سالہ مسلم اقتدار کی صرف روحانی علامت بن چکا تھا خیمے میں لپیٹ کر پاؤں سے روندا دیا گیا۔ لاکھوں لاکھوں جانیں

تلف ہوئیں، علوم وفنون کے نایاب خزانوں کی جو بربادی ہوئی اس پر آج تک علمی دنیا ماتم کررہی ہے۔''

(تاریخ دعوت وعزیمت، ج ا، مولانا سید ابوالحسن ندوی، ص ۴۰۰۔۳۷۸)

تیرہویں صدی کے علماء، شعراء، عرفاء اور مشاہیر کا ذکر کرتے ہوئے علامہ شبلی نعمانی اپنی کتاب سوانح مولانا روم میں ان کا ذکر بڑی آب وتاب سے کیا ہے ان کے مطابق۔

''اسلام کا علمی دربار اسی اوج اور شان کے ساتھ قائم رہا۔ محقق طوسی، شیخ سعدی، خواجہ فریدالدین عطار، عراقی، شیخ شہاب الدین سہروردی، شیخ محی الدین ابن عربی، صدرالدین قونیوی، یاقوت حموی، ابن الاثیر، ابن الفارض، عبداللطیف بغدادی، نجم الدین رازی، سکاکی، سیف الدین، محدث ابن الصلاح، ابن النجار، ابن بیطار، ابن حاجب اور شاہ بوعلی قلندر وغیرہ اسی پر آشوب عہد کی یادگار ہیں۔''

(سوانح مولانا روم، شبلی نعمانی، ص ۳۔۲۲)

سطور بالا میں جن مشاہیر کا ذکر ہوا ہے ان میں سے ہر ایک اپنے عہد کے باکمالوں کی فہرست کا طرہ امتیاز ہے اور ان کی علمی کاوشوں کے باعث تیرہویں صدی عیسوی کے معاشرے اور سماج میں ان کی علمی بصیرت کا لوہا مانا گیا۔ اسی پر آشوب دور میں مولانا نے آنکھیں کھولیں اور جو کچھ مثنوی، دیوان غزلیات، فیہ مافیہ اور دیگر حوالوں سے صفحۂ قرطاس پر رقم کیا ہے وہ اس جیٹ رفتار عہد میں جب ساری دنیا ایک گلوبل ولیج بن کر رہ گئی ہو تو اس دور میں بالخصوص مولانا روم کی تعلیمات اور تربیت کی معنویت مزید بڑھ گئی ہے۔ ہمارے معاشرے اور سماج میں درپیش تضادات کا مداوا مولانا کی مثنوی میں بتائے اور سمجھائے راستے پر چلنے کی تلقین ہے جو اشرف المخلوقات کے لئے زندگی گزارنے کا سب سے مناسب اور معقول طریقہ ہے وہ فرماتے ہیں۔

می توانی از رہ آسان شدن بر آسمان
راست باش و راست رو کآنجا نباشد کاستی

مولانا روم کے یہاں مسائل کا واحد حل صرف عشق ہے کیونکہ وہی تمام بیماریوں اور اختلافات کو زائل کرنے کا واحد راستہ ہے، وہ فرماتے ہیں۔

شاد باش ای عشق خوش سودای ما
ای طبیب جملہ علت ھای ما

ای دوای نخوت و ناموس ما
ای تو افلاطون و جالینوس ما

سچ ہے کہ انسان اپنی بخشش کے لئے مذہبی عبادات اور فرائض کی ادائگی میں لگا رہتا ہے مگر مولانا روم کے مطابق انسان کو خدا کی تلاش اپنے دل کے اندر سے کرنی چاہئے کیونکہ یہی وہ جگہ ہے جہاں سے انسان کو تسکین میسر آتی ہے پکار پکار کر کہتے ہیں۔

ای قوم بہ حج رفتہ کجائید کجائید
معشوق ھمین جاست بیائید بیائید
آنانکہ طلبگار خدائید خدائید
حاجت بطلب نیست شمائید شمائید

فروتنی اور تواضع صوفیا کا خاص مشغلہ رہا ہے۔ مولانا روم بھی عارف تھے ان کے مطابق تواضع اور عاجزی کی یہ علامت ہے کہ ہر وہ انسان جو تواضع، عاجزی اور فروتنی کے اعلیٰ مدارج پر پہنچ کر کامیاب و کامران ہوتا ہے تو اس کی مثال ایسی ہے جب کوئی سوار اپنی منزل (کمال) تک پہنچ جاتا ہے تو وہ اپنے مرکب (سواری) کو چھوڑ دیتا ہے جسے مولانا نے شعر میں اس طرح پرویا ہے۔

فروتنی است دلیل رسیدگان کمال
کہ چون سوار بہ منزل رسد پیادہ شود

خدمت خلق کا جذبہ ہر صوفی سلسلے میں اہم رہا ہے۔ مولانا روم بھی انہی صوفیا میں سے تھے جن میں احساس رحم، دلداری اور محبت و اخوت کوٹ کوٹ کر بھرا تھا اور انہیں خدمت خلق میں دلی سکون ملتا تھا۔ مثنوی میں جا بجا اس فکر کے اشعار ملتے ہیں جس سے عہد حاضر میں مولانا روم کی معنویت دو چندان ہو جاتی ہے مثال کے لئے دفتر اول میں یہ شعر۔

رحم خواھی رحم کن بر اشکبار
رحم خواھی بر ضعیفان ابر

یا چھٹے دفتر میں یہ شعر۔

رنج بدخویان کشیدن زیر صبر
منفعت دادن بہ خلقان ھمچو رحم آر

یعنی اگر بدخو اور بداخلاق افراد پر بھی صبر سے کام لیں اور انہیں بادل کی طرح فیض پہنچانے کی کوشش کریں تو یہ

درس آج کے عہد میں بھی لائق تحسین ہے۔مولانا روم نے اپنے عہد میں زندگی کے حقائق کو بہت قریب سے مشاہدہ کیا تھا انہوں نے کشت و کشتار،طوائف الملوک، دھوکا، مکاری،فریب، جفا،بغض، کینہ،حسد اور اسی قبیل کے دیگر حالات سے یہ سمجھ لیا تھا کہ زندگی میں انسان کو اخلاقی بنیادوں پر مستحکم اور استوار ہونا چاہئے ورنہ ایک صالح معاشرے کی تکمیل تقریباً ناممکل امر ہے اسی لئے انہوں نے اپنی مثنوی، دیوان، فیہ مافیہ اور مجالس سبعہ میں جا بجا ایسے اشارے کئے ہیں جن سے ایک عام انسان کی اصلاح ہو اور وہ ایک بہتر انسان بن کر سماج میں مثبت افکار کو مقبول عام کرے جو بالعموم صوفیا کا خاص طریقہ ہے۔مولانا کے عارفانہ خیالات میں آلودہ قلب میں خدا کا مسکن ناممکنات میں ہے کیونکہ جو صاحبدل نہیں مگر نماز پڑھتے ہیں اور ریا کاری کرتے ہیں دراصل ان میں مردم آزادی کا عنصر باطن میں پنہاں ہے تو اس کی نماز مولانا کے نزدیک کسی طرح سے نماز کے زمرے میں شامل نہیں ہے وہ کہتے ہیں۔

اگر نہ روی دل اندر بر ابرت دارم
من این نماز، حساب نماز نشمارم
ز عشق روی تو من رو بہ قبل آوردم
وگر نہ من ز نماز و ز قبلہ بیزارم
مرا غرض ز نماز آن بود کہ پنہانی
حدیث درد فراق تو با تو بگذارم

مولانا روم اپنے حقیقی معشوق کی طلب میں وصال حق کے خواہاں ہیں ان کی اس سعی پیہم میں ان کے دل پر کئی طرح کے احساسات رونما ہوتے ہیں کبھی ان کے یہاں شوق و ذوق،کبھی سوز و گداز موجود ہے۔مولانا روم کے نزدیک وصال وفراق دونوں احساسات کی ترجمانی اس زاوئے سے انجام پاتی ہے کہ لگتا ہے کہ مولانا نے خود کو اس مثالی کام کے لئے باطن سے آمادہ کر لیا تھا جس سے جذبات کی برانگیختگی ٹپکتی محسوس ہوتی ہے اگر ان کے کلام میں غزلوں کے چند اشعار بطور مثال انتخاب کئے جائیں تو یہ بات بآسانی واضح ہو جاتی ہے۔

ای عاشقان ای عاشقان من خان را گوھر کنم
ای مطربان ای مطربان دف شما پر زر کنم

یا یہ شعر۔

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم
چو غلام آفتابم ھمہ ز آفتاب گویم

یا مولانا کی یہ پکار۔

بیایید بیایید کہ گلزار دمیدست
بیایید بیایید کہ دلدار رسیدست

مولانا روم کی غزلیات پر نہایت عالمانہ تبصرہ کرتے ہوئے رضازادہ شفق نے تاریخ ادبیات ایران میں درج کیا ہے۔

''غزلیات میں مولانا کی اہم خصوصیت وہ عاشقانہ جوش وخروش ہے جو ہر پڑھنے والے کے دل کو تڑپا دیتا ہے اور اس کے احساسات کو گرما دیتا ہے۔ بے شبہ ہر غزل محسوسات کی آگ، اس کی بھڑک اور جذب وحال کی زندہ تصویر ہے۔ ان کی بیشتر غزلیں روح سماع اور رقص عارفانہ سے لبریز ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں سرتاسر شور وشوق، جوش وخروش اور سوز عشق کی آگ بھڑک رہی ہے۔ بلاشبہ مولانا جلال الدین سے پہلے ایسے شوریدہ اور تڑپانے والا کلام شیخ عطار اور ان کے بعد سنائی کے سوا کسی کے یہاں نہیں ملتا۔''

(تاریخ ادبیات ایران، رضازادہ شفق، اردو ترجمہ مبارز لادین رفعت، ص۳۷۲)

مولانا روم نے خودشناسی کو انسانی تربیت کے لئے سب سے افضل قرار دیا ہے کیونکہ جب تک انسان خود کو نہیں پہچانے گا وہ خدا کو بھی نہیں پہچان سکتا۔ یہ خودشناسی کی بحث فارسی ادب میں مختلف ادوار میں مختلف انداز سے ہوچکی ہے جس میں سعدی، عطار، سنائی، اور امام غزالی وغیرہ نے اس ضمن میں اپنے افکار بیان کئے ہیں۔ بعد میں یہی خودشناسی علامہ اقبال تک آتے آتے انسان کی تمام شخصیت کا جزو لاینفک بن کر ظاہر ہوئی۔ اسی عنوان کو مولانا نے بھی اپنے انداز میں اس طرح سے سمجھایا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

بیرون ز تو نیست ہر چہ در عالم ہست
از خود بطلب ہر آنچہ خواہی کہ توئی

امام غزالی نے خودشناسی کی جامع تعریف کیمیائے سعادت میں ان الفاظ میں کی ہے۔

اگر خواہی کہ خود را بشناسی، بدانکہ تو را کہ آفریدہ اند، از دو چیز آفریدہ اند۔ یکی این کالبد ظاہر، کہ آن را تن گویند و وی را بہ چشم ظاہری توان دید و یکی معنای باطن، کہ آن را نفس یا جان و دل گویند و آن را بہ بصیرت توان شناخت و بہ چشم ظاہر نتوان

دید وحقیقت تو، آن معنای باطن است۔''

(کیمیای سعادت، امام محمد بن محمد غزالی، تصحیح خدیو جم، ص ۱۰۸)

پس آج کے اس عہد میں جب ممالک اور قوموں کے درمیان اختلافات اور تہذیبوں کے مابین ٹکراؤ کی روایت ملتی ہے اس وقت اگر ہم باطن کے معنی پر غور کرلیں تو تمام اختلافات، تضادات اور کشمکش کی بیخ کنی ممکن ہے۔ تصوف کا ایک درس ہے'' یک در گیر ومحکم گیر'' مولانا روم نے بھی یہی کیا انہوں نے شمس تبریزی کے دست حق پرست پر بیعت کر کے ایک صوفی صافی کی شاگردی اور مریدی اختیار کی اور انہی کے ہو رہے اور جو حاصل کیا وہ سب شمس تبریزی کی قربت اور رہنمائی کا خاصہ تھا۔ اگر ہم عصر حاضر میں زندگی کا تجزیہ کریں تو ہم بھی اس مادی منفعت، گلوبل ولیج اور علم کے بڑے بڑے انکشافات کے جدید زمانے میں کمپیوٹر، فیس بک، سوشل میڈیا اور اس طرح کی نہ جانے کتنی چیزوں کے اس قدر گرویدہ ہو چکے ہیں کہ ہم اپنے خاندان، رشتہ داروں، سماج اور دیگر اہم لوگوں سے منقطع ہو گئے ہیں۔ مولانا روم کی اخلاقی و عرفانی تعلیمات نے افراد کو دنیا کے معاملات سے غیر متعلق اور آزاد کرا کے ایک مثالی انسان اور انہی کے الفاظ میں مرد کامل بنانے کی جو عملی کوشش کی تھی وہ عہد حاضر کی جدید ٹکنولوجی کے ساتھ احساسات، قلبی واردات اور فکر واندیشہ کے ساتھ خود کو پہچانتے ہوئے دنیا کے اس عمل کو بہتر طریقے پر انجام دینے کے جذبے سے سرشار ہو کر مکمل کر سکتے ہیں۔ کیونکہ اگر ہم دنیا کے تضادات، کشمکش اور اختلافات کو دور کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے ہمیں اپنی ذات کو اور خود کو پہچاننا نہایت ضروری ہے۔ اسی بات کو مولانا نے دیوان شمس میں اس طرح ادا کیا ہے۔

مردم بدم زندہ شدم گریہ بدم خندہ شدم
دولت عشق آمد و من دولت پایندہ شدم
گفت کہ سرمست نہ ای رو کہ ازین دست نہ ای
رفتم و سرمست شدم و ز طرب آکندہ شدم

''وحدت'' ہر زمانے میں وقت کی اہم ضرورت رہی ہے اور ہمارا ملک تو کثرت میں وحدت کا مثالی ملک ہے، مولانا روم نے بھی وحدت کی مناسبت کو'' ہمدلی'' سے تعبیر کرتے ہوئے اسے ہم زبانی سے بہتر سمجھا تھا، وہ فرماتے ہیں۔

ای بسا ھندو و ترک ھم زبان
ای بسا دو ترک چون بی گانگان
پس زبان ھمدلی خود دیگر است
ھمدلی از ھمزبانی بھتر است

تیرہویں صدی عیسوی کو ہم تصوف وعرفان کی صدی بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ اس میں مختلف سلسلے تشکیل پاتے ہیں اور بقول خلیق نظامی۔

''اسلامی تصوف کی تاریخ تیرہویں صدی میں ہر اعتبار سے مکمل ہو جاتی ہے حقیقت میں یہ سلاسل اس کے ارتقا اور نشو ونما کی آخری منزل ہیں۔ امام غزالی اور شیخ اکبر کے افکار کے گرد تصوف کی ساری دنیا گردش کرتی رہی۔ ان بزرگوں کی تصانیف کے حاشیوں اور خلاصوں سے باہر نکلنے کی ہمت کسی کو نہ ہوئی، مثنوی مولانا روم نے شاعری کی ساری دنیا کو اپنے اندر جذب کر لیا۔ غرض ہر اعتبار سے تیرہویں صدی میں تصوف کی تحریک معراج کمال کو پہنچ گئی تھی۔''

(تاریخ مشائخ چشت، ج ا، خلیق احمد نظامی، ص ۱۵۲)

علامہ شبلی نعمانی نے سوانح مولانا روم میں مثنوی کی شہرت دوام کا سبب بیان کرتے ہوئے تحریر کیا ہے۔

''فارسی زبان میں جس قدر کتابیں نظم یا نثر میں لکھی گئی ہیں کسی میں ایسے دقیق، نازک اور عظیم الشان مسائل اور اسرار نہیں مل سکتے جو مثنوی میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ فارسی پر موقوف نہیں اس قسم کے نکات اور دقائق کا عربی تصنیفات میں مشکل سے پتہ لگتا ہے۔'' (سوانح مولانا روم، شبلی نعمانی، ص ۶۹)

اس لحاظ سے علما اور ارباب فن نے مثنوی کی طرف تمام اور کتابوں کی نسبت زیادہ توجہ مولانا روم نے بانسری (نے) کو ایک ایسی تشبیہ کے طور پر استعمال کیا ہے جو ایک لامتناہی نیستان سے جدا ہو گئی ہے۔ عالم ارواح ایک ایسا عالم ہے جس میں وحدت اور کثرت دونوں موجود ہیں کیونکہ ہستی کا آغاز اور انجام دونوں ہی اسرار الٰہی کا حصہ ہیں۔ مولانا نے مثنوی میں کئی مقامات پر ارواح کی کثرت اور اس کے معاملات کو سمجھانے کے لئے شعر کا سہارا لیا ہے وہ کہتے ہیں کہ اگر تم ایک مکان میں دس چراغ رکھو اور ہر چراغ الگ الگ شکل کا ہو تو بھی ان سے پھیلنے والی روشنی کو ہم الگ الگ نہیں کر سکتے کیونکہ ان کا نور ایک نا منقسم وحدت کی شکل میں روشنی بن کا ظاہر ہوتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

ده چراغ ار حاضر آری در مکان
هر یکی باشد بصورت غیر آن
فرق نتوان کرد تو در هر یکی
چون بنورش روی آری بی شکی

یہی دس چراغ دس ملک، دس تہذیبیں، دس قومیں، دس مذہب یا کچھ اور بھی ہو سکتے ہیں۔ گویا یہی وہ بنیادی فرق ہے جس کے باعث ہم عہد حاضر میں مختلف قبیلوں، ذاتوں، قوموں، مذہبوں اور افکار و خیالات میں وحدت اور یگانگت کی لو جلا سکتے ہیں جو وقت کی اہم ضرورت ہے۔

مولانا روم نے ایک دوسری مثال ''من وتو'' کی تفریق اور دھوکے کو سمجھانے کے لئے ''سوسیب اور سوآبی'' کو شعر میں استعمال کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ اگر تو سوسیب اور سوآبی کو نچوڑ کر ان کے رس کو یکجا کر دے تو کوئی بھی ان کو الگ الگ نہیں کر سکتا۔ حالانکہ اس جوس میں دونوں پھلوں کا ذائقہ محسوس تو ہوگا مگر ان کو الگ الگ کرنا مشکل امر ہے۔ جو یگانگت اور اتحاد کی دلیل ہوتے ہوئے بھی انفرادی حیثیت کے متحمل ہیں جس کی مثال اس طرح ہے:

گر صد سیب و صد آبی بشری
صد نماند یک شود چون بفشری

مولانا روم کی عملی تعلیم یہ ہے کہ وہ ایسی معنوی ریاضت کرے سے اس میں بصیرت پیدا ہو سکے اور وہ ہر کثرت میں وحدت کی حقیقت کو سمجھنے لائق ہو جائے۔ وہ فرماتے ہیں:

صورت سرکش گدازان کن بزنج
تا ببینی زیر آن وحدت چو گنج

مولانا روم اشرف المخلوقات میں مثالی انسان کے متلاشی ہیں اور انہیں وہ صفات شمس تبریزی میں ملی تھیں جس کے باعث ان پر کچھ راز ہائے سربستہ کشف ہوئے۔ وہ فرماتے ہیں:

دی شیخ چراغ ہمی گشت گرد شہر
کز دام و در ملولم و انسانم آرزوست
از ہمرہان سست عناصر دلم گرفت
شیر خدا و رستم یزدانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

مرزا غالب کے مصرعے ''شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن'' کے مصداق مولانا جلال الدین رومی کی عرفانی مثنوی کی شہرت بھی ساری دنیا میں پھیل چکی ہے مگر اس کے باوجود مولانا روم کی حیثیت ایک ایسے بحر بے پایاں کی ہے جس میں سے بہت کچھ غوطہ زنی سے حاصل کیا جانا اور پر بحث و مباحثہ ہو چاہئے۔

اپنے مقالے کو سعدی کے ایک شعر پر ختم کرنا چاہتا ہوں جس میں انہوں نے پتھر اور گھاس کو انسان پر اس لئے فوقیت دی ہے کہ اگر انسان میں خاصیت نہیں تو اس سے بہتر پتھر اور گھاس ہے:

سنگی و گیاہی کہ درو خاصیتی ہست
از آدمی بہ کہ در و خاصیتی نیست

کتابیات:

۱۔ تاریخ دعوت وعزیمت، جلد اول، مولانا سید ابوالحسن ندوی، لکھنؤ ۱۹۷۸ء

۲۔ سوانح مولانا روم، شبلی نعمانی، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ۱۹۷۰ء

۳۔ تاریخ ادبیات ایران، رضازادہ شفق، اردو ترجمہ مبارز الدین رفعت، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۶۹ء

۴۔ کیمیای سعادت، امام محمد بن محمد غزالی، تصحیح خدیو جم، انتشارات علمی فرہنگی، تہران، ۱۳۶۴ش

۵۔ تاریخ مشائخ چشت جلد اول، خلیق احمد نظامی، ادارۂ ادبیات، دہلی، ۱۹۸۰ء

۶۔ دیوان کبیر، کلیات شمس تبریز، مولانا جلال الدین رومی، نسخہ قونیہ، دو جلد، توضیحات، فیرست و کشف الابیات، توفیق ھ سبحانی، انجمن آثار و مفاخر فرہنگی، تہران، ۱۳۸۶ھ ش

۷۔ حکمت رومی، خلیفہ عبدالحکیم، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور، پاکستان، ۱۹۹۷ء

۸۔ افکار رومی، محمد عبدالسلام، مکتبۂ جامعہ لیمیٹیڈ، نئی دہلی، ۱۹۸۱ء

۹۔ حضرت مولانا جلال الدین بلخی رومی، مسعود انور علوی کاکوروی، کتب خانہ انوریہ، کاکوری، ضلع لکھنؤ، ۲۰۰۷ء

ڈاکٹر واحد احمد
شعبہ فارسی
دانشگاہ کشمیر، کشمیر

احوال حضرت میر الٰہی

مغل دور کے شعراء میں عماد الدّین محمد الٰہی نام کا ایک شاعر گذرے ہیں جو میر الٰہی کے نام سے مشہور تھے۔ان کا شمار کشمیر اور ایران کے مایہ ناز شعراء میں ہوتا ہے۔میر الٰہی کے والد شہنشاہ جلال الدین اکبر جو ایک بڑا علم پرور بادشاہ گذرا ہے کے زمانے میں ہمدان سے ہجرت کر کے ہندوستان چلے آئے تھے اور اس کے دربار میں رسائی حاصل کی تھی۔پھر ہندوستان میں لوگوں کی تربیت اور رشد و ہدایت میں مشغول رہے۔

اس بات کا پہلے بھی ذکر کیا گیا ہے کہ میر الٰہی کا نام عماد الدین تھا جن کی پیدائش بتاریخ ۹۷۳ھ بمطابق ۱۵۶۶ء میں ہمدان میں ہوئی تھی [۱]۔چونکہ ان کے والد صاحب اپنے زمانے کے بلند پایہ عالم و فاضل تھے۔اس لیے میر الٰہی نے ابتدائی تعلیم و تربیت اور رشد و ہدایت کی تعلیم اپنے والد سے ہی حاصل کی۔اس کے بعد کچھ وقت صوفیائے کرام سے اکتساب فیض میں گذارا۔تعلیم حاصل کرنے کے بعد میر الٰہی درس و تدریس اور تالیف و تصنیف میں مشغول ہو گئے۔جس کی وجہ سے ان کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔کچھ مدت تک وہ ایران میں شاہ عباس اول کے دربار سے بھی منسلک رہے لیکن ان کو بھی اپنے باپ کی طرح ایران کی ہوا راس نہ آئی۔اپنے وطن کو خیر باد کہہ دیا اور ہندوستان چلے آئے [۲]۔میر الٰہی عربی اور فارسی زبان پر خاصا عبور رکھتے تھے [۳]۔وہ زمانے کے قدآور شخصیت حکیم شفائی اور آقارضی کے ساتھ شاعرانہ محفلوں میں بیٹھتے تھے۔بالآخر میر الٰہی اپنا رخت سفر ہندوستان کی طرف باندھا [۴] اور مغل دور کے قدآور بادشاہ جہانگیری ملازموں میں شامل ہو گیا [۵]۔میر الٰہی ایران میں قیام کے دوران شکوہی ہمدانی، تقی اوحدی اور حکیم شفائی کا ہم صحبت رہا ہے [۶]۔ہندوستان میں بھی امراء وزراء کی خدمت میں رہ کر آپ کو اعزاز و اکرام نصیب ہوا۔وہ آزاد فطرت درویش فقیر منش انسان تھے [۷]۔چنانچہ اس بات کا اعتراف شمع انجمن کے مصنف نے یوں کیا ہے۔بسیاری خوش خلق و درویش مزاج بود و نزد اکابر معزز و محترم می زیست [۸]

میر الٰہی دنیا کی طرف راغب نہیں تھا بلکہ وہ آخرت کا دلدادہ تھا چونکہ الٰہی تخلص اختیار کرنا اسی بات کی نشاندہی کرتا ہے۔میر الٰہی شاہجہاں کے دور حکومت میں کشمیر میں ۱۰۶۴ھ میں وفات پائی اور شیخ بہاؤالدین گنج بخش کے مزار میں مغرب کی

طرف سپرد خاک کیے گئے ۹۔ میر الٰہی صاحب دیوان شاعر ہیں۔

میر الٰہی کابل میں ظفر خان احسن کے ساتھ رہے۔ جہانگیر کے دربار میں رسائی حاصل کی اور اس کا خاص ندیم و مصاحب مقرر ہوا۔ جب شاہجہاں نے چاہا کہ وہ ظفر خان احسن کو کشمیر کی صوبیداری عطا کرے تو اس نے یوں ارشاد فرمایا ''از ظفر خان ضامن بگیر ند کہ سکنۂ کشمیر را از خود خوش و راضی دارد''۔ میر الٰہی جو دربار میں موجود تھے فی البدیہہ یہ مصرعہ بول اٹھے'' خدا ضامن رسولؐ و چار یارش'' بادشاہ بدیہہ گوئی پر خوش ہوا اور ظفر خان نے احسان شناسی سے کام لیتے ہوئے شاہجہاں کی خدمت میں عرض کیا کہ میں میر الٰہی کو اپنے ساتھ کشمیر لے جاؤں۔ شاہجہاں نے ظفر خان کی یہ خواہش قبول کر کے میر الٰہی کو اجازت دی۔ میر الٰہی ظفر خان کے ساتھ کشمیر آیا ۱۰ اور وہ بہت مدت تک کشمیر میں رہا ۱۱۔ میر الٰہی در کشمیر بخوشی می گزرانید و بہ سیر باغ و گلستان و مناظر کشمیری پرداخت و در وصف کشمیری مثنوی سرود'' ۱۲۔ میر الٰہی نے دیوان کے علاوہ'' تذکرۃ الشعراء'' بھی تصنیف کیا تھا جس کا ذکر پیر غلام حسن کھویہامی نے کیا ہے ۱۳۔ میر الٰہی نے ایک اور کتاب'' تذکرہ خزینہ گنج الٰہی'' تصنیف کی تھی جس میں چار سو شعراء کا تذکرہ کیا تھا ۱۴۔ میر الٰہی نے کشمیر میں ۱۰۵۰ھ میں ایک باغ لگایا تھا جو باغِ الٰہی کے نام سے مشہور ہوا ۱۵

میر الٰہی مذہبی اور اسلامی علوم پر مکمل عبور رکھتے تھے اس کے علاوہ وہ صوفیانہ اور عارفانہ عقاید سے بخوبی واقف تھے کیونکہ انہوں نے اپنے دور کے سب سے اعلیٰ کشمیری روحانی شخصیت بابا نصیب الدین غازیؒ سے اکتساب فیض کیا تھا ۔انہوں نے روحانی میدان میں بڑا کمال حاصل کیا تھا اور ان کے اخلاق اعلیٰ مرتبہ کے ہیں اور فن سخنوری میں وہ بڑا کمال رکھتے تھے چنانچہ تذکرۂ شعرای کشمیر کے مصنف حسام الدین راشدی نے یوں لکھا ہے:

''میر الٰہی کہ رابطہ با فیض الٰہی دارد طراز سخن بسیار تازہ اشعارش بلند آوازہ لطف کلامش از قیاس افزون و جزالت الفاظش از خیال بیرون است۔ در قصیدہ قصہ ہای نیکوی کند و در غزل معنی بر جستہ می نمود۔ استعارہ و تازہ گوئی را بمرتبہ کمال رسانیدہ..... بیشتر در تازگی ادا و نزاکت و استعارہ می گوید'' ۱۶

شمع انجمن میں درج ہے:

'' کلامش لطافت و عذوبتی دارد'' ۱۷

بزرگان و سخن سرایان ہند میں بیان کیا گیا ہے:

''در سخن وری نیز شاعری با سلیقہ و نازک خیال و استاد بشمار می رفت اشعارش بسیار رود یو انش بخصوص در ہند مشہور بود'' ۱۸

تذکرہ راشدی میں مذکور ہے:

''بہ سخن وری است درست سلیقہ ذات شریفش درکمال تقدیس نمودہ'' ۱۹

مجمع النفائس میں درج ہیں:

''غرض کہ دردستی مضمون وزبردستی زبان وتازگی خیال میر مذکور مسلم الثبوت است و ہمہ باستادی اوقایل اند'' ۲۰

دکتر محمد اسلم خان لکھتے ہیں:

''درکابل ہمراہ ظفر خان بود میر الٰہی را احسن سر دفتر دیوان فصاحت وشیخ البلاغتہ می گوید'' ۲۱

نتائج الافکار میں درج ہیں:

''بطبع ھمہ دان درنظم گستری پسندیدہ سخنوران وبہ متانت ولطافت کلام برگذیدہ'' ۲۲

ایک دوسری اہم تصنیف میں مذکورہ ہیں:

''کلامش لطافتی وعذوبتی دارد ومذاقہا رالذتی خاص بخشد'' ۲۳

میر الٰہی کے چند اشعار ملاحظہ ہیں۔

اذان لب نیم بوسی مایہ بی ہوشی ماست — چہ مستی ھا کہ بخشید این شراب نیم رس مارا

تلخ کامی ستم بسکہ کشیدم ھمہ عمر — زھر شد نیمۂ دل نیمۂ دیگر خون است

نہ ترحم نہ تبسم نہ تغافل نہ ستم — صلح وجنگ ھمہ از راہ وروش بیرون است

مابجای دانہ دردل تخم سودا کاشتیم — بودصحرا آتشین پروانہ آنجا کاشتیم

لب خود می گذدگل؛ خندہ برگل می زند شبنم — صبا گویا بہ گلشن می برد بوئی کہ من دارم

غرض میر الٰہی مغل دور کے ایک بلند پایہ صوفی شاعر گذرے ہیں۔ان کی غزلیں، مثنوی اور قصیدے غرض ہر ایک صنف سخن میں ایک خاص رنگ جھلکتا ہے۔

حواشی:

۱۔ تذکرہ راشدی، پیر حسام الدین راشدی، ج۔۱ ص ۱۱۴

۲۔ ایضاً ص ۸۵

۳۔ ایضاً ص ۲۴۱۔۲۴۴

۴۔ ایضاً ص ۸۵

۵۔ ایضاً ص ۲۴۱۔۲۴۴

۶۔ ایضاً ص ۱۱۲۔۱۲۷

۷۔ ایضاً ص ۸۵

۸۔ دیوان غنی بحوالہ شمع انجمن ص ۴۱۔۴۲

۹۔ تذکرہ راشدی ،پیر حسام الدین راشدی، ج۔۱ ص ۱۱۲۔۱۲۷

۱۰۔ واقعات کشمیر ،خواجہ محمد اعظم دیدہ مری ، ص ۱۵۳

۱۱۔ کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ ،عبدالقادر سروری، ص ۱۲۳

۱۲۔ ظفر خان احسن ص ۶۲۔۶۳

۱۳۔ تاریخ حسن ،پیر غلام حسن کھیوہامی، ج۔۴ ص ۱۵

۱۴۔ تذکرہ شعرائے کشمیر ،پیر حسام الدین راشدی، ج۔۱ ص ۱۲۵۔۱۲۷

۱۵۔ ایضاً

۱۶۔ تذکرہ راشدی، پیر حسام الدین راشدی ج۔۱ ص ۱۱۲

۱۷۔ شمع انجمن ص ۴۱۔۴۲

۱۸۔ بزرگان وسخن سرایان ھند ج۔۱ ص ۲۴۱۔۲۴۴

۱۹۔ تذکرہ راشدی ،پیر حسام الدین راشدی ص ۲۵۵۔۲۵۶

۲۰۔ مجمع النفائس ص ۱۰۔۱۱

۲۱۔ ظفر خان احسن ص ۶۱

۲۲۔ نتائج الافکار ص ۱۷۔۱۸

۲۳۔ سرو آزاد ص ۸۵

ڈاکٹر محمد مبارک حسین
پی ایچ ڈی، شعبہ فارسی
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عہد اکبری میں سنسکرت تراجم کا مختصر جائزہ

شہنشاہ ہند جلال الدین محمد اکبر کا شمار اُن ہستیوں میں ہوتا ہے جس نے اپنی ہمت، لیاقت، اثر ورسوخ اور حکمرانی کی بدولت شہرت اور بلند مقام حاصل کیا۔ بابر کے تعلقات صفوی سلطنت کے بانی شاہ اسمٰعیل صفوی سے بیحد خوشگوار تھے ۱۵۳۰ء میں جب بابر کا انتقال ہوا تو ان کے بیٹے ہمایوں نے سلطنت کی باگ ڈور سنبھالی۔ بدقسمتی سے ۱۵۴۰ء میں شیر شاہ سوری نے انہیں ہندوستان سے مار بھگایا۔ وہ راجپوتانہ اور سندھ کے ریگستانوں میں پریشان پھرتا رہا۔ امرکوٹ کے مقام پر اکبر کی پیدائش ہوئی۔ ہمایوں نے ہندوستان کی طرف سے مایوس ہوکر دربدر کی ٹھوکریں کھانے کے بعد ایران کا رخ کیا، شاہ عباس طہماسپ صفوی نے ان کا استقبال کیا اور بڑے حسن وسلوک سے پیش آیا۔ ہمایوں نے کم وبیش پندرہ برس جلاوطنی میں گزارے۔ اسی جلاوطنی کے زمانے میں ہمایوں کی ایک امیر شیخ جام کی بیٹی حمیدہ بانو سے شادی ہوئی (حمیدہ بانو بیگم ایک سیّد بزرگوار شیخ ژندہ پیل احمد جام کی نسل میں سے تھیں۔ اکبر اسی کے بطن سے امرکوٹ (صوبہ سندھ) کے مقام پر بروز اتوار ۵/رجب المرجب ۹۴۹ھ بمطابق ۱۵/نومبر ۱۵۴۲ء میں پیدا ہوا۔

اکبر کو اہل علم اور کتابوں سے خاص دلچسپی تھی اپنے دربار میں علماء سے مختلف موضوعات پر کھولے ذہن سے گفتگو کرتا اس نے اپنی پوری زندگی کے دوران مطالعہ جاری رکھا روزانہ ایک شخص اسے کتابیں پڑھ کر سناتا تھا۔ ابوالفضل کا بیان ہے کہ شاید ہی کوئی علمی، ادبی، یا تاریخی کتاب باقی رہی ہوگی جسے بادشاہ کو نہ سنایا گیا ہو۔ حکمرانوں کی اس علم اور کتاب دوستی کی وجہ سے مغل عہد میں کتابوں کی ذخیرہ اندوزی اور کتب خانوں کا قیام بڑے پیمانے پر عمل میں آیا۔

اکبر کا عہد حکومت ۱۶۰۵ء۔۱۵۵۶ء صرف سیاسی جلاہ جلال کے اعتبار سے ہندوستان کی تاریخ خصوصاً مغل حکمرانوں کا دور نہیں مانا جاتا بلکہ علمی وادبی اعتبار سے بھی یہ زمانہ ہندوستان کی تاریخ کا اہم مانا جاتا ہے۔ اکبر کا زمانہ دیگر زبانوں کی تصنیفات کے ترجم کے لیے بھی نہایت مقبول ہے۔ اس عہد میں سنسکرت زبان کی کئی علمی، مذہبی اور تاریخی کتابوں کے فارسی زبان میں تراجم ہوئے، ان تراجم سے فارسی زبان کی کتب میں ایک بڑے علمی سرمائے کا اضافہ ہوا خصوصاً سنسکرت کی کلاسیکی تصنیفات کے تراجم سے یہ فائدہ ہوا کہ ہندوؤں کی علمی، مذہبی وراثت محض ان تک ہی محدود نہ

رہی بلکہ دیگر مذہب خصوصاً مسلمانوں کو ان سے واقفیت ہوئی۔

مہابھارت:

مہابھارت ہندوؤں کی مقدس اور اہم تصنیف ہے جس کو وید ویاس جی نے اپنے شاگرد بھیشم پائن کی مدد سے مرتب کیا تھا۔ مہابھارت سنسکرت زبان میں تحریر شدہ ایک ضخیم تصنیف ہے۔ یہ کتاب اٹھارہ ابواب پر مشتمل ہے جس میں اشلوک کی تعداد ایک لاکھ ہے۔ یہ ایک رزمیہ داستان ہے۔ جس میں ہندوستان کی تاریخی جنگ ''مہابھارت'' کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ ۹۹۰ھ میں اکبر نے اس مذہبی کتاب کو فارسی میں منتقل کرانے کا حکم دیا۔ اکبر نے اس کام کے لیے اپنے دربار کے چند جلیل القدر علماء کو جمع کر کے کتاب مہابھارت کو فارسی زبان میں نقل کرنے کا حکم دیا۔ آغاز میں بادشاہ نے چند راتوں تک نقیب خاں کے ساتھ مل کر اس کے مضامین کو سمجھا۔ اس کے بعد ملا عبدالقادر بدایونی کو حکم دیا کہ وہ نقیب خاں کے ساتھ مل کر مذکورہ کتاب کا ترجمہ کریں۔ چنانچہ بدایونی نے چار مہینے میں اس کتاب کے اٹھارہ پرب میں سے صرف دو پرب کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ بعد ملا میں ملا شیری، نقیب خاں، ابوالفضل فیضی اور سلطان حاجی تھانیسری نے کچھ پنڈتوں کی مدد سے مذکورہ کتاب کو فارسی کے قالب میں ڈھالا۔ ابوالفضل نے اکبر کے حکم سے اس ترجمہ پر دو جز کا ایک خطبہ لکھا جب ترجمہ مکمل ہوا تو بادشاہ اکبر نے اپنے دربار کے ماہر خطاطوں کی مدد سے اس کے دو مصور نسخے تیار کرائے اور اس ترجمہ کا نام ''رزم نامہ'' رکھا۔ ابوالفضل کے خطبہ کے آخر میں ترجمہ کا سال ۹۹۵ھ درج ہے (کیٹلاگ آف برٹش میوزیم، جلد اوّل، ص ۵۷)

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پانچ برس کی مدت میں کتاب مہابھارت کو فارسی زبان میں ترجمہ کی گئی۔ اس کتاب کے مختلف نسخے متفرق کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں رزم نامہ کے چند نسخے مختلف کلیکشن میں موجود ہیں اس کے علاوہ منشی نول کشور کے مطبع سے یہ کتاب شائع ہو چکی ہے۔

رامائن:

شری والمک رشی کی تصنیف ''رامائن'' یہ کتاب مہابھارت سے بھی قدیم ہے۔ اس کتاب میں اودھ کے راجہ رام چند جنہیں عام طور پر رام کہا جاتا ہے اور ان کی بیوی سیتا جی کے حالات درج ہیں۔ یہ ایک اعلیٰ نظم ہے جو ۲۵، ہزار اشلوک پر مشتمل ہے۔ ہندو شری رام کو خدا کا اوتار مانتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شری رام کی شکل میں دنیا میں جلوہ گری کی تھی اس لیے ہندو اس کتاب کے پڑھنے کو لائق تعظیم سمجھتے ہیں۔ رامائن صرف شری رام جی کی سوانح عمری ہی نہیں بلکہ یہ ایک فلسفیانہ تصنیف کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ اس کتاب کے متعلق Blochmann لکھتے ہیں:

The Ramayana like wise a bookof ancient

Hindustan, which contains the life of Rama Chandra, but is full of interesting points of Philosopy"(آئین اکبری، مترجم بلوخ مین، ص۱۱۱)

۱۵۸۴ء میں جب ملاعبدالقادر بدایونی مہابھارت کے ترجمہ میں مشغول تھے تبھی اکبر نے مہابھارت کی طرح رامائن کو بھی فارسی زبان میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔ بدایونی نے بادشاہ کا حکم مانتے ہوئے ترجمہ کا کام شروع کیا اور چار سال بعد ۱۵۸۸ء میں مکمل کر کے بادشاہ اکبر کی خدمت میں پیش کیا۔ بدایونی نے اس ترجمہ سے متعلق لکھا ہے:

> ''در جمادی الاول سنہ سبع وتسعین وتسمایہ ترجمہ کتاب رامائن را در عرض چھار سال
> نوشتہ وشی تمام ساختہ گذرانیدم و چون در آخر نوشتہ بودم
> ما قصہ نوشتیم بہ سلطان کہ رساند
> جان سوختہ کردیم بہ جانان کہ رساند
> بسیار مستحسین افتاد پرسیدند کہ چند جزو شد بعرض رسانیدم کہ بارِ اوّل مجملا قریب
> ھفتاد جزو مفصلا در مرتبہ ثانی صد و بست جز شد''
> (منتخب التواریخ، جلد دوم، ص۳۶۶)

بدایونی کی اس عبادت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ رامائن کا ترجمہ پہلی بار اختصار کے ساتھ تقریباً ستّر جز میں اور دوسری مرتبہ تفصیل کے ساتھ ایک سوبیس جزو میں بدایونی ہی نے کیا۔ اکبر کو یہ ترجمہ خوب پسند آیا۔ اکبر نے مصنفوں کے دستور کے مطابق بدایونی کو اس پر دیباچہ لکھنے کا حکم دیا لیکن مترجم نے دیباچہ لکھنے میں اغماض کرتے ہوئے وجہ درج ذیل عبارت میں کیا۔

> ''ازان نامہ سیاہ کہ چون نامہ عمر من تباہ است بخدامی جویم نقل کفر کفر نیست کہ کملہ
> در کفر میخوانیم چہ می ترسیم کہ مبادہ این نسخہ کہ ھمہ بکرہ وحسب الامر نوشتہ شدہ نفرین بار
> آورا للھم انی اعوذ بک من ان اشرک بک شیئا واما علم واستغفرک لما لا اعلم بہ وتبت
> عنہ واقول لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ این توبہ من نہ توبۂ یاس است بدرگاہ تواب و
> ھاب مقبول گردد'' (منتخب التواریخ، جلد دوم، ص۳۶۶،)

رامائن کے ترجمہ سے متعلق بدایونی نے دعویٰ کیا ہے کہ وہ مجرد رہ کر اس کا فارسی ترجمہ کیا۔ جبکہ بدایونی کے ہمعصر مورخ شیخ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ مذکورہ کتاب کے ترجمہ میں بدایونی کے ساتھ اور بھی کئی لوگ شامل تھے جیسا کہ

وہ لکھتے ہیں:

’’کتاب مہابھارت از کتب قدیم ھندوستان با اھتمام نقیب خان، مولانا عبدالقادر بدایونی وشیخ سلطان تھانیسری از ھندی بفارسی آمد۔۔ وھمین گروہ کتاب رامائن را کہ از تالیفات قدیم ھندست واحوال رام چندر بتفصیل دران وبسی از نوادر حکمت دران مندرج بفارسی آوردند‘‘ (آئین اکبری، بتصحیح سر سید احمد خان،ص۹۶)

ابوالفضل کی تحریر اور ملا عبدالقادر بدایونی کے دعویٰ سے اس بات کا نتیجہ مبہم ہے کہ کس نے کیا کیا البتہ یہ ممکن ہے کہ ایک مرتبہ ملا عبدالقادر نے ترجمہ کیا ہو اور دوسری مرتبہ سب نے مل کر کیا ہو۔اسی بادشاہ کے دربار میں اس کتاب کا ہندی زبان میں بھی ترجمہ ہوا۔ یہ ترجمہ تلسی داس نے کیا۔اور ترجمہ کو ہندی ادب کی تاریخ میں کافی مقبولیت حاصل ہے۔

لیلاوتی:

یہ حساب کی ایک کتاب ہے جس کے مصنف بھاسکراچاریہ ہیں۔ بھاسکر نے اس کتاب کا نام اپنی بیٹی لیلاوتی کے نام پر رکھا تھا۔لیلاوتی حکمت ریاضی کی نہایت معروف ومعتبر تصنیف ہے۔ یونس جعفری اس کتاب کے موضوع سے متعلق لکھتے ہیں:

"Bhaskaracarya,s Lilawati. a on arithetry and geometi"

(ہسٹری آف پرشین لٹریچر، بتصحیح یونس جعفری،ص۳۲)

۱۵۸۷ء میں اکبر نے ملک الشعراء فیضی کو کتاب ’’لیلاوتی‘‘ کو فارسی زبان میں نقل کرنے کا حکم دیا۔فیضی نے چند پنڈتوں کی مدد سے اس ترجمہ کے کام کو انجام دیا۔اس کتاب کے بارے میں شیخ ابوالفضل لکھتے ہیں:

’’لیاوتی کہ درحساب گزیدہ اثریست از حکمای ھندوستان ھمین برادران ابوالفیض فیضی از ھندی نقاب برآوردہ طیلسان فارسی بردوش گذاشت‘‘

(آئین اکبری، بتصحیح سر سید احمد خان،ص۹۶)

کلیلہ ودمنہ(پنچ تنتر):

کتاب پنچ تنتر کا شمار دنیا کی چند معروف کتابوں میں کیا جاتا ہے۔اور یہ مشہور ہے کہ اس کتاب کا مصنف ایک ہندوستانی برہمن فلسفی بیدپا نامی ہے، جس نے مذکورہ کتاب کو دابشلیم (یہ سکندر کے بعد ہندوستان کا حکمراں گزرا ہے) کے حکم پر سنسکرت زبان میں تصنیف کیا تھا۔اس کتاب میں جانوروں اور پرندوں کی زبانی پند ونصیحت اور اصول وسیاست کی باتوں کو دلچسپ قصہ کہانیوں کے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔اپنی اسی خصوصیت کی وجہ سے اس کتاب کا الگ الگ

زمانے میں مختلف ناموں سے کئی زبانوں میں ترجمہ ہوئے۔ پنچ تنتر کا پہلی بار ترجمہ ساسانی دور کے مشہور شاعر رودکی نے کیا۔ رودکی کا یہ ترجمہ منظوم شکل میں تھا جو اب ناپید ہو چکا ہے۔ پندرہویں صدی کے اوائل میں ملا حسین کاشفی نے ایک بار پھر مذکورہ کتاب کو فارسی زبان میں منتقل کیا۔ ملا حسین نے اس ترجمہ کا نام ''انوار سہیلی'' رکھا۔ ملا حسین کا یہ ترجمہ نہایت پر تکلف اور عربی الفاظ و ترکیبات سے اس قدر پر تھا کہ عبارت کو سمجھنا آسان نہ تھا اکبر جو کہ علم کا شیدائی تھا، اس مشکل کو نظر رکھتے ہوئے ۱۵۸۷ء میں اپنے فاضل وزیر شیخ ابوالفضل کو حکم دیا کہ اصل سنسکرت کو سامنے رکھ کر ''انوار سہیلی'' کا سادہ، سلیس، عام فہم اور مروجہ زبان میں از سرِ نو ترجمہ کیا جائے تا کہ فارسی خواندہ اس دلچسپ اور اہم کتاب سے استفادہ حاصل کر سکیں۔ ابوالفضل جو انشا پردازی کے ماہر تھے، انہوں نے مذکورہ کتاب کا آسان فارسی می ترجمہ کیا۔ بادشاہ اکبر نے اس ترجمہ کا نام ''عیار دانش'' رکھا۔ ابوالفضل اپنے اس ترجمہ سے متعلق تحریر کرتے ہیں:

> **''کتاب کلیلہ ودمنہ در حکمت عملی کارنامہ ایست غرابت بخش با آنکہ نصر اللہ مستوفی و مولانا حسین واعظ کاشفی بفارسی نقل کردہ بودند چون استعارات غریب ولغاتِ دشوار داشت بفرمان چمن آرای اقبال رقم شگرف نامہ خلعتی تازہ از فارسی پوشانیدہ وبعیار دانش اشتہار گرفت''** (آئین اکبری، بتصحیح سر سید احمد خان، ص ۹۷)

کتاب عیار دانش ایک مقدمہ اور سولہ ابواب پر مشتمل ہے۔ ابوالفضل نے عیار دانش کے تصنیف کے دوران ابوالمعالی حمد اللہ مستوفی کی کتاب ''کلیلہ و دمنہ'' کو پیش نظر رکھ کر اسی کی ترتیب پر اپنی کتاب کو مرتب کیا۔ اور اپنے اس ترجمہ میں ان دو ابواب کو بھی شامل کیا ہے جن کو ملا حسین کاشفی نے ''انوار سہیلی'' میں حذف کر دیا تھا۔

راج ترنگی:

سنسکرت زبان میں سرزمین کشمیر کی اکی منظوم تاریخ ہے۔ جو سات ہزار آٹھ سو چھبّیس اشعار پر مشتمل ہے۔ اور یہ کتاب وادیٔ کشمیر کے حکمرانوں کے عروج و زوال پر نہایت جامع تصنیف ہے۔ اس کتاب کا مصنف کلہن ہے جو ایک برہمن پنڈت خاندان سے تھا۔ کلہن نے اس کتاب ھذا کو راجہ جئے سنگھ کے زمانے حکومت میں لکھا تھا۔ یہ کتاب سات حصّوں پر مشتمل ہے۔ جس میں کشمیر کے آغاز حکمراں سے لے کر راجہ جئے سنگھ کے دور حکومت تک کی تاریخ کو تفصیل کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ مذکورہ کتاب کو پندرہویں صدی عیسوی میں زین العابدین کے دربار سے منسلک مشہور شاعر ''جونی پنڈت'' نے بادشاہ کے حکم پر نئے سرے سے مرتب کیا لیکن ابھی وہ اس کام کو مکمل نہیں کر پایا تھا کہ ۳۵ برس کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ اس کی موت کے بعد اس کے وفادار شاگرد ''سری پنڈت'' نے کتاب کے بقیہ حصّہ کو مرتب کیا اور اس کا نام ''راج ترنگی دروتیہ'' رکھا۔ (کیٹلاگ آف انڈیا آفس، ہرمن ایتھ، لائبریری، ص ۲۹۶)

۱۵۹۰ء میں جب اکبر بادشاہ کشمیر میں مقیم تھا تب ان کی نظر کلہن کی راج ترنگی پر پڑی۔ بادشاہ اکبر نے اس مخصوص کتاب کو بھی فارسی میں ترجمہ کرنے کے لیے ملا محمد شاہ آبادی کو حکم دیا۔ ملا شاہ جو اپنے زمانے کے معروف عالم تھے، مذکورہ کتاب کو ایک برس کی مدت میں فارسی زبان میں ترجمہ کر کے اکبر بادشاہ کے سامنے پیش کیا۔ ملا شاہ کا ترجمہ نہایت پر تکلف تھا اس لیے بادشاہ اکبر نے ۱۵۹۱ء میں ملا عبدالقادر بدایونی کو حکم دیا کہ ملا شاہ کے ترجمہ کو آسان عبارت میں نقل کریں۔ بادشاہ کے حکم کے مطابق بدایونی نے پورا ترجمہ کرنے کے بجائے دو ماہ میں اس کا آسان اور فصیح زبان میں نقل کیا اور آخر میں ایک شعر کا اضافہ کر کے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ اکبر نے اس ترجمہ کو شاہی کتب خانہ میں جگہ دی۔

کتھا سرت ساگر:

یہ سنسکرت ادب کی معروف اور دلچسپ تصنیف ہے جس کو کشمیری پنڈت ''سوم دیو'' نے کشمیر کے راجہ آنند رانی کی دلجوئی کے لیے مرتب کیا تھا۔ (سنسکرت ساہتیہ کا اتہاس، ص ۱۴۴)

کتھا سرت ساگر دراصل پراچین زبان کی تصنیف ''برت کتھا'' کا سنسکرت ترجمہ ہے جس میں ہندوستان کے قدیم دلچسپ قصے کہانیاں مثلاً پنچ تنتر، بیتال پچیسی وغیرہ کا بیان کیا گیا ہے، ان قصّوں کے ضمن میں قدیم ہندوستان کی تہذیب وتمدن وثقافت اور سماجی ومعاشی حالات کا بھی تصرہ کیا گیا ہے، جس کی وجہ سے اس کتاب کی اہمیت میں کافی اضافہ ہوگئی ہے۔ مذکورہ کتاب کا فارسی زبان میں پہلا ترجمہ زین العابدین کے دوحکومت میں'' بحرالاسمار'' کے نام سے ہوا۔ یہ ترجمہ نامکمل اور پرانی فارسی میں تھا۔ اکبر بادشاہ نے ۱۵۹۴ء میں ملا عبدالقادر بدایونی کو حکم دیا کہ وہ زین العابدین کے حکم سے جو ترجمہ ہوا ہے اس کو آسان زبان میں ترجمہ کریں۔ چنانچہ بدایونی نے پانچ مہینے میں آسان فارسی میں ترجمہ مکمل کر کے بادشاہ اکبر کے سامنے پیش کیا۔

المختصر یہ کہ فارسی زبان وادبیات کی ترقی وترویج میں عہد اکبری کو اہم مقام حاصل ہے اکبر نے خود ذاتی طور پر تراجم کے کام پر توجہ دی۔ عہد اکبری کے سنسکرت تراجم کی اہمیت وافادیت زمانہ تالیف سے لے کر آج تک برقرار ہیں، ان تراجم کی اہمیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے مختلف زبان کے دانشمندوں نے ان پر نظر ثانی کی اور انہیں اپنی زبان میں منتقل کیا تا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ ان تراجم سے مستفیض ہوسکیں۔ بلاشبہ اکبر اور اس کے علماء وفضلاء نے علم وادب کی ایسی بیش قیمت خدمات انجام دی ہیں کہ یہ عہد تاریخ کے اوراق میں ''عہد زرین'' کے نام سے معروف ہے۔

مراجع ومصادر:

۱۔ آئین اکبری، شیخ ابوالفضل، تصحیح سرسید احمد خان۔ سرسید اکیڈمی، علیگڑھ، ۲۰۰۰ء

۲۔ منتخب التواریخ، ملا عبدالقادر بدایونی، تصحیح مولوی احمد علی، کالج پریس، کلکتہ، ۱۸۶۸ء

۳۔ ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصّہ، ڈاکٹر سید عبداللہ، انجمن ترقی اردو، نئی دہلی ۱۹۹۲ء
۴۔ اکبر شناسی، پروفیسر ماریہ بلقیس، سرسید اکیڈمی، علیگڑھ، ۲۰۰۲ء
۵۔ تاریخ ہند، مولوی محمد ہاشمی صاحب، انجمن ترقی اردو، ہند، دہلی ۱۹۴۲ء
۶۔ ترجمہ کا فن اور روایات، ڈاکٹر قمر رئیس، ایم، تاج پبلیشنگ ہاؤس، دہلی۔ ۲۰۱۱ء
۷۔ دربار اکبری، محمد حسین آزاد، قومی کونسل، نئی دہلی ۲۰۱۰ء
۸۔ رود کوثر، شیخ محمد اکرام، ناہید آفسٹ پریس، دہلی ۱۹۹۱ء
۹۔ مکمل تاریخ ہند، مفتی شوکت علی فہمی، دین دنیا پبلیشنگ کمپنی، دہلی ۱۹۱۰ء
۱۰۔ بزم تیموریہ، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۱ء
۱۱۔ سنسکرت ساہتیہ کا اتہاس، اچاریہ بلدیو، شاردا نکیتن، وارانسی، ۱۹۸۵ء
۱۲۔ کتھا سرت ساگر ایک ادھایں، ڈاکٹر واچسپتی ترویدی، مرار کا سنسکرت کالج، پٹنہ۔

☆☆☆

ڈاکٹر نجیبہ اختر
پی ایچ ڈی، شعبۂ فارسی
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

صوفیوں اور سنتوں کا آپسی اتحاد

اسلام دیگر اقوام و مذاہب کے مابین محبت، اخوت، ہمدردی، رواداری اور عمدہ اخلاق کی تعلیم دیتا ہے نہ صرف اسلام بلکہ جب ہم کسی بھی مذہب کا مطالعہ بنظر عمیق کرتے ہیں تو سبھی مذاہب کو انسانی زندگی کی بنیادی قدروں میں متفق پاتے ہیں۔ تمام مذاہب میں اتحاد کی تعلیم دی گئی ہے، آپسی انتشار کو حقارت کی نظر سے دیکھا گیا۔ آیئے پہلے اسلام سے قبل کے مذاہب کے اتفاق و اتحاد کے نظریات پر نظر ڈالتے چلیں

ہندوازم:

ہندوازم کا یہ اصول اپنے آپ میں بہت اہمیت کا حامل ہے، جس کا انگریزی ترجمہ حسب ذیل ہے:

So let us think to gathers let us oct together, let us be victorious, together we all belong to that great light, where there is no place for hatred.

اس طرح بدھ ازم:

Buddha said, Hearing seen contention as a danger and harmony as peace abide in unity and kindness. (Jataka, chp B verse, 15,13)

اور جین ازم:

Ahinsa respect for all living things and avoidance of violence towards others

جیسا کہ ہم سبھی کو اس بات کا علم ہے کہ مسلمانوں کے ہندوستان میں ایک مدت تک رہنے کا یہ فائدہ ہوا کہ ان دونوں مذاہب کے لوگوں کے مابین کوئی مذہبی تفریق باقی نہیں رہی۔

جب مسلمان عرب حملہ آور کی حیثیت سے ۷۱۲ء میں ہند میں داخل ہوئے، یہاں آنے کے بعد انھوں نے سندھ اور ملتان میں اپنی سلطنت قائم کی۔ جنوبی ہندوستان میں تاجروں کی حیثیت سے ان کے آنے کا آغاز اس سے قبل ہو چکا تھا۔ مسلمانوں نے سمندر کے کنارے سندھ کاٹھیا واڑ اور گجرات تک اور جنوبی ہند میں مالابار اور کاٹھ مانڈو کے ساحلوں پر آ کر قیام کیا، کہا جاتا ہے کہ اسلامی تہذیب اور ہندو تہذیب کا باہمی تاثر کا سلسلہ اسی وقت سے شروع ہو گیا۔ ہندو اور مسلمانوں کے بیچ آپسی اتحاد اور بھائی چارہ پیدا کرنے میں مسلم صوفیوں اور سادھو سنتوں نے بہت اہم کام انجام دیا، مذہبی تفریق کو بھول کر دونوں مذاہب کے لوگ ایک دوسرے کی خوشی، غمی اور شادی جیسے رسم و رواج میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے، کوئی بھی تیسرے مذہب کا فرد ان کے آپسی اتحاد اور خوشگوار ماحول کو دیکھ کر یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ یہ لوگ دیگر مذہب کے افراد ہیں، کیوں کہ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے ماحول میں ایسے رچ بس گئے تھے، کہ ان کو اس بات کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ ان کے درمیان مذہبی تفریق کی دیوار حائل ہے۔

ہندوستان میں فاتح مسلمانوں کی آمد سے قبل مسلم صوفیہ ہندوستان میں تشریف لا چکے تھے۔ ان صوفیہ میں ''شیخ علی ہجویری'' کا نام سرفہرست ہے۔ انھوں نے لاہور کو اپنا مسکن بنایا اور اپنے پُرخلوص کردار سے ہندوؤں کو متاثر کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شمالی ہند میں چشتیہ سلسلے کے صوفیہ کرام کی خانقاہیں کافی تعداد میں قائم ہو گئیں۔

ابتدائی دور میں جب مسلمانوں نے ہندوستان کو اپنا مسکن بنایا تو انھوں نے علم ہیئت، نجوم اور ریاضی میں جو کتب سنسکرت زبان میں تھی ان کے عربی زبان میں مسلم دانش وروں و عالموں کے ذریعے تراجم کرائے، سنسکرت کی وہ کتابیں جن کا عربی میں ترجمہ ہوا، سدھانت، سشرت، چرک، کلیلہ ودمنہ بوذاسف وبلوہر وغیرہ ہیں۔ ان تراجم کا فائدہ یہ ہوا کہ مسلمانوں نے یہاں کے علم سے متعلق بہت کچھ معلومات حاصل کر لیں۔ جب افغانستان کے اطراف سے مسلمانوں کی آمد کا آغاز ہوا جس کے نتیجہ میں فارسی زبان نے ہندوستانی زبان کو متاثر کیا، جن کی دلیل پرتھوی راج کے درباری شاعر ''چندر بردائی'' کی تصنیف ''راج راسا'' سے دستیاب ہوتی ہے۔ اس میں عربی اور فارسی کے بہت سے الفاظ ملتے ہیں جیسے کہ جہیز، زنانہ، پروانہ، تخت، جمع خاطر، خاصی، رقعہ، حاضر، کاغذ، حکم، غبار وغیرہ وغیرہ۔

ہندوؤں اور مسلمانوں میں ایک مشترکہ علمی و ادبی ذوق پیدا ہو گیا تھا۔ ہندی اور فارسی کا مطالعہ دونوں مذاہب کے لوگ کرتے تھے۔ دونوں زبانوں کے امتزاج سے ایک نئی زبان تشکیل ہو رہی تھی غلام علی آزاد بلگرامی، ٹیک چند بہار، آنند رام مخلص وغیرہ کے علمی کارناموں کو ہندو اور مسلمان دونوں کے درمیان مقبولیت حاصل ہوئی ''اردو'' ہندو اور مسلمانوں کی محبوب زبان تھی۔ ''گلشن بے خار'' میں شیفتہ نے ۶۱ ہندو شاعروں کا ذکر کیا ہے۔ ''نغمہ عندلیب'' میں حکیم مرزا قطب الدین نے ۸۰ ہندو شعراء کا اردو میں تذکرہ لکھا ہے۔ مغلیہ دور کا ایک مشترکہ کلچر تھا جس میں ہندو اور مسلمان دونوں

یکساں طور پر رنگے ہوئے تھے۔ کنور پریم کشور فراقی اپنا نجی روزنامچہ اس طرح شروع کرتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یا فتاح

''حمد وثنا بادشاھی را سزا کہ سلطنت کونین بوجودِ اوست وشاہان روئے زمین وخداونداں چتر ونگین راافتخار بہ فضل اوودرود وتحیات وسلام زاکیات برآن سرور کہ درشان او''۔

مذہبی اختلاف کے متعلق ''درگا داس'' کی رائے قابل ذکر ہے۔

آفریدگار جمیع مذاہب ومشارب ہماں ذات یکتا است کہ آفرینندہ؎۱

(تمام مذاہب اور مشارب کا آفریدگار وہی ایک ذات ہے جو عالم کو پیدا کرنے والا ہے)

متذکرہ بالا گفتگو سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ ہندو اور مسلمانوں دونوں کا باہمی اتحاد دھیرے دھیرے اس حد تک بڑھا کہ ہندو مسلمان فقیروں اور درویشوں پر اعتبار کرنے لگے اور مسلمان ہندو جوگیوں اور سادھوں سنتوں کو اپنا وفادار ماننے لگے اور باہمی اتحاد سید حکومت، خلجی حکومت، تغلق حکومت اور لودی حکومت میں اور بھی مضبوط ہو گیا اور اس اتحاد کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب ''خواجہ قطب الدین بختیار کاکی'' نے دہلی کو اپنا مسکن بنا کر اسلام کے فروغ کے لیے کام کیا اور ''بابا فرید الدین گنج شکر'' نے ''اجودھن'' میں قیام کیا تو ان کی خانقاہوں میں ہندو عوام اور خاص طور پر ہندو جوگی بڑی عقیدت اور خلوص کے ساتھ تشریف لاتے تھے۔

راجکمار ہردیوں کے روزنامچے ''نظامی بنسری میں بہت سی ایسی مثالیں پائی جاتی ہیں ''شیخ نظام الدین اولیاء کی مذہبی رواداری کی بہت سی مثالیں ان کے ملفوظات اور ''تاریخ مشائخ چشت'' وغیرہ سے دستیاب ہوتی ہیں۔

مثلاً: روزی شیخ نظام الدین اولیاء کلاھی بر گوشتہ سرنہادہ در کنار آب تمای عبادت و پرستش ہندوان می نمودند۔ در این اثنا امیر خسرو حاضر می شود۔ شیخ متوجہ شدہ می فرمایند کہ این جماعت را می بنی:

ہر قوم راست راہی دینی وقبلہ گاہی

امیر بی تامل از روی نیاز مندی تمام شیخ را مخاطب ساختہ مصرع ثانی را:

من قبلہ راست کردم ہر سمت کج کلاہی؎۲

مذکورہ مصرع میں مذہبی رواداری کا ایک بے پایاں جذبہ سمٹ آیا۔ ایک مذہبی پیشوا کا یہ بے اختیار ارشاد صرف مذہبی رواداری کا ہی نہیں بلکہ ایک ایسی فکر کا بھی آئینہ دار ہیں جس نے ہندوستانی تہذیب کے ''جلوہ صد رنگ'' کو سمجھ لیا ہو اور جو یہاں کے تہذیبی نقشے میں ہر دین اور ہر قبلہ گاہ کو دیکھنے کے لیے آمادہ ہو۔

ہندوؤں کو فارسی زبان سے اس قدر دلچسپی تھی ''مثنوی رومی'' کے درس میں ان کی شمولیت ضروری تھی۔ بقول

حاجی نجم الدین''۔۳؎

حیدرآباد کے راجہ چندر لال کو حافظ صاحب سے بہت لگاؤ تھا اکثر آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ حافظ سید محمد علی خیرآبادی ان مخصوص بزرگوں میں تھے جن کی روحانی عظمت اور علمی تبحر کی تعریف نہ صرف ان کے معاصرین علماء ومشائخ نے کی بلکہ ہندوؤں کو بھی ان سے خاصی عقیدت ودلچسپی تھی مثلاً دہلی کا ایک کایستھ ہندو حافظ صاحب کے پُرخلوص اخلاق سے اس قدر متاثر ہوا کہ مع اہل وعیال مشرف بہ اسلام ہوگیا۔۴؎

دوسری طرف بھگتی تحریک کا آغاز ہوا جس میں رامانج، رامانند ولبھ چاریہ، چیتنیا، وغیرہ نے ذات پات کے فرق کو جھوٹ قرار دیا ان افراد کی تحریکوں سے مسلمان اور ہندو دونوں کو یکساں طور پر متاثر ہوئے۔ اس محبت نے مغلوں کے دور میں 'من اور تو' کی تفریق کو ختم کر دیا۔ مسلمانوں نے ہندی اور سنسکرت سے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا اور ہندوؤں نے فارسی میں مہارت حاصل کی۔ اس عہد میں عبدالرحیم خانخاناں نے ہندی میں دوہے لکھے، سید ابراہیم رس خاں نے کرشن جی کی تعریف کی۔ مرزا حسین علی نے بنگالی زبان میں کالی دیوی کی مدح کی اور مہابھارت وغیرہ کا فارسی میں ترجمہ ہوا۔

لہٰذا اس عہد میں پاکپٹن'' کے بابا فرید گنج شکر دہلی کے نظام الدین اولیاء اور دکن کے شیخ گیسو دراز وغیرہ نے اپنے علم باطن کا چراغ روشن کیا جس کی روشنی میں ہندو اور مسلمان دونوں نے نجات کا راستہ پالیا۔

خواجہ حسن نظامی نے جس Idiology کو اپنی تحریر میں قلم بند کیا ہے وہ ہندوستانی تصوف اور بھکتی کی طویل روایت سے وابستہ discoursel ہے۔

شاہ جہاں پور میں ''میلہ خداشناس'' کا انعقاد کرنے والا ''چاند پورہ'' کا رئیس منشی بہاری لال جو ہندو مذہب کا بہت بڑا عالم تھا۔ 'میلہ خداشناسی'' میں سارے مذہب کے لوگوں کو مدعو کر کے وہ کوئی نتیجہ اخذ کرنا چاہتا تھا، اس نے میلہ میں مدعو افراد کے لیے کھانے، پینے اور خیمے وغیرہ کا سارا انتظام (بہاری لال) نے کیا تھا۔ ہندو، مسلمان، عیسائی (یوروپین) کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ ''پادری نولس صاحب'' انگلستانی اور حضرت مولانا محمد قاسم کے درمیان مقابلہ تھا۔ جس میں مولانا محمد قاسم کو فتح حاصل ہوئی اور پادری کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ مولوی صاحب کی فتح پر ہندوؤں کو جو خوشی ہوئی وہ قابل دید تھی۔ ''مولوی محمد قاسم صاحب کے گرد ایک ہجوم تھا ہندو مسلمان سب گھیرے کھڑے تھے۔۵؎

جب اہل اسلام اور ہندو میلے سے روانہ ہو رہے تھے، راستہ میں 'جانکی داس'' نام کا ایک جوگی جس کے پاؤں میں کھڑاؤں، سر پر لمبے لمبے بال، برہنہ سر کئی جوگی اور اس کے ساتھ تھے۔ جوگی نے بڑے مودبانہ طریقے سے مولوی صاحب کو سلام کیا مولوی صاحب نے بڑے خلوص کے ساتھ جوگی کے سلام کا جواب دیا۔ مولوی صاحب کی عقیدت اور خلوص سے متاثر ہوکر جوگی آگے بڑھ کر مولوی صاحب سے مخاطب ہوکر بولا ''تم نے بڑا کام کیا'' مولوی صاحب نے

جواب دیا میں نے کیا کیا ''پریمیشر'' نے کہا۔ جوگی نے کہا جب تم نے بولی ماری تو ہم نے دیکھا پادری کا بدن سوکھ گیا تھا۔ مولوی صاحب نے جوگی سے مخاطب ہوکر کہا آپ نے بڑی مہربان کی جو آپ آئے، اس نے کیا ہم تو تمہارے بٹیا بیٹی ہیں''۔ایک مدت سے ساتھ رہتے ہوئے ہندو مسلمان ایک دوسرے کے ماحول میں ایسے رچ بس گئے تھے کہ ان کو دیکھ کر ایسا نہیں لگتا تھا کہ مختلف مذہب کے ماننے والے ہیں۔

مذکورہ گفتگو سے ہندو مسلم کی عقیدت کا ایک واضح ثبوت ملتا ہے۔لیکن ان عقیدت مندانہ حالات کو مدت دراز بھی نہیں گزرا ہے۔اور ملک کا یہ حال ہے کہ قدیم ہندو مسلم روابط کو توڑ کر ہندو مسلمان دو جماعتوں میں تقسیم ہو گئے ہیں۔

مختصر یہ کہ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ نہ صرف مکالمہ بین المذاہب پر کانفرنسز کرائی جائیں نہ صرف اس پر مضمون شائع کیے جائیں، بلکہ اس کو عملی طور پر نافذ کیا جائے اور آپس میں بین المذاہب ومسالک کے دروازے کو ہمیشہ کے لیے وا کیا جائے۔تبھی ایک دوسرے کے مذاہب کے بارے میں واقفیت حاصل ہوگی۔مذہبی غلط نظریہ میں بدلاؤ آئے گا، آپسی انتشار کم ہوگا، بھائی چارے کی فضا قائم ہوگی۔مذہبی آڑ میں اپنے ذاتی مفاد کو حاصل کرنے والے گروہ کا خاتمہ ہوگا اور انسانی وجود کا احترام ہوگا۔ہمارے اندر محبت، برداشت، تحمل، بردباری اور امن وسلامتی جیسے اوصاف حمیدہ پیدا ہوں گے۔مذہبی غلط فہمیوں اور شکوک وشبہات کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔مضبوط دلائل سے اپنے اپنے مذہب کی حقانیت کو واضح کیا جائے اخلاقِ حسنہ کا مظاہرہ کیا جائے اور ایسی گفتگو سے پرہیز کیا جائے جس سے دوسرے مذہب کے افراد کے جذبات مجروح ہوں، گو کہ معاشرے میں اتحاد امن وسلامتی اور تہذیب کو زندہ رکھنے کے لیے مکالمہ بین المذاہب جیسی فکری تحریک کو زندہ رکھنا از حد ضروری ہے۔

حواشی:

۱۔ تاریخ مشائخ چشت، ص:۵۶

۲۔ مجموعہ مقالات، ہادی حسن، ص:۸۳

۳۔ مناقب المحبوبین، ص:۳۵۷

۴۔ ایضاً، ص:۳۵۸

۵۔ سیرت بانی دارالعلوم، ص:۱۲۵

مصادر ومراجع:

۱۔ سیرت بانی دارالعلوم، علامہ سید مناظر احسن گیلانی، مرتب محمد عامر قمر ۱۹۹۹ء، کراچی (اشاعت اول)

۲۔ خواجہ حسن نظامی کی نثر، ڈاکٹر مولا بخش ۲۰۱۲ء، نئی دہلی (اشاعت اول)

۳۔ بابا فرید مسعود گنج شکر، مرتب محمد اکرام چغتائی، ۲۰۰۷ء، لاہور

۴۔ تاریخ مشائخ چشت، پروفیسر خلیق احمد نظامی، ۱۹۸۴ء، دہلی

۵۔ پرتھی راج راسا، حافظ محمود خاں شیرانی، ۱۹۴۳ء، دہلی

۶۔ مناقب المحبوبین، حاجی نجم الدین، ۱۲۸۹ھ، رامپور، ۱۳۱۲ھ، لاہور

۷۔ مجموعہ مقالات، ہادی حسن، ۱۹۵۶ء، حیدرآباد دکن

۸۔ تذکرہ گلشن بے خار، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، ۱۸۷۴ء، لکھنؤ

۹۔ نظامی بنسری، سوانح عمری شیخ نظام الدین اولیاء، مرتب خواجہ حسن نظامی، ۱۹۴۵ء

۱۰۔ آبِ کوثر، شیخ محمد اکرام

ڈاکٹر سعدالدین
مرکز تحقیقات فارسی
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

فتح اللہ خان شیبانی: حیات و شاعری

شیبانی ۱۲۴۱ھ/۱۸۲۵ء میں کاشان کے ایک معروف خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ انکے جد امیر محمد حسین خان آغا محمد خان کے عہد میں نطنز، کاشان اور قم کے حکمراں تھے۔ امیر محمد حسین خان نے محمد حسین خان عرب آمری کو بغاوت کے جرم میں شہراب اور جندق میں گرفتار کیا تھا، تو اس کارنامہ کے عوض میں انہیں اصفہان کی امارت بھی مل گئی تھی[1]۔

فتح اللہ خان شیبانی بھی اپنے جد کی طرح محمد شاہ اور ناصرالدین شاہ کے ندیموں میں سے تھے۔ جس زمانہ میں ناصرالدین شاہ ولی عہد تھے فتح اللہ شیبانی نے ان کی مدح میں یہ قصیدہ کہا تھا۔

بہار و عید فراز آمدند ہردو بہ ہم — یکی کشیدہ سپاہ و یکی گشادہ علم
خدایگانا زین پس صریح خواہم گفت — چہ گفت باید چندین سخن ہمہ مبہم؟
تو در زمان یکی خسرو بزرگ شوی — کہ خسروان و شہانت رہی شوند و خدم
شہی کہ برہمہ شاہان بہ قدر بیش بود — تو بود خواہی از گوہر بنی آدم[2]

جب ناصرالدین شاہ تخت پر بیٹھے تو شیبانی کو حاسدوں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے دربار چھوڑنا پڑ گیا تھا اور شیبانی ہمدان آ گئے تھے۔ ہمدان سے انہوں نے شکویہ اشعار ناصرالدین شاہ کو بھیجے تھے لیکن ناصرالدین شاہ تک یہ اشعار نہیں پہنچ سکے۔ ان شکویہ اشعار میں سے یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

خدایگانا، من مدح تو سرایم و عقل — ہمی سراید دو گوش من بہ بانگ قلم
کہ باز گوی کنون آنچہ پیش از این بہ سہ سال — بہ فال نیکو گفتی بہ مدح شاہ عجم
کجای گفتی؟ آن جا یگہ کہ گفتی باز — بہار و عید فراز آمدند ہر دو بہ ہم
بگفتہ ای کہ از این پس صریح خواہم گفت — چہ گفت باید چندین سخن ہمہ مبہم
تو در زمانہ یکی خسرو بزرگ شوی — کہ خسروان و شہانت رہی شوند و خدم
کنون نگر کہ ہمہ فالہای بندۂ تو — خدای خواست کہ تا باقضا شود توأم

ترا نشاند بہ جایی کہ گفتہ بود رھی — و زاینت برتر نیز،ای ملک نشاندھم
خدایگانا،فانی کہ بندۂ تو زند — چنان رود کہ چنین رفتہ از نخست قلم
ولی زبہر خود اوھیچ فال بد نزدہ است — چراش دارد پیوستہ روزگار دژم[۳]

لیکن شیبانی خان نے ہمت نہیں ہاری اور ۱۲۷۲ھ/۱۸۵۵ء میں حسام السلطنہ (ناصرالدین شاہ کے چچا) نے جب ہرات پر لشکر کشی کی تھی تو شیبانی خان نے فتح نامہ لکھ کر حسام السلطنہ کو اپنا ھمنوا بنالیا تھا اور وہ ان کے منشیٔ رسائل ہو گئے تھے۔شیبانی خان نے یہ کام بھی انجام دیا کہ عیسیٰ خان کو حسام السلطنہ کی اطاعت قبول کرنے پر آمادہ کرلیا لیکن پھر بھی انہیں خاطرخواہ کامیابی نہ ملی:

''من از آغاز ورود بہ ھرات بہ علت عداوت وخصومتی کہ اولیای دولت با من داشتند ودلتنگی وگلہ ای کہ از ھمقطاران وھمگنان خود، کہ درحضرت سلطنت بودند، داشتم ،کہ پس از ازعاج واخراج من ھیچ از من یاد نکردند وحق دوستی و برادری را رعایت نمودند، از ایران و مردم ایران و مراجعت بدان ملک چندان نفور وملول بودم، چنانکہ ھر وقت اندیشہ می کردم از سہ جانب من کہ بہ طرف ایران بود، دیواری آھنین وآتشین برکشیدہ می نمود وھمان سمت کہ روی بہ مشرق زمین داشت، گشودہ بود از این روی بہ جانب بلخ سفر کردم و در مراجعت بہ ھرات بہ گمان اینکہ درلباس فقرو درویشی می توان درآن ملک گوشۂ عزلت وانزوای اختیار نمود بزیستم.''[۴]

۱۲۹۹ھ/۱۸۸۱ء میں سلطان مراد حسام السلطنہ نے انہیں مشھد کے امور سونپ دیئے تھے لیکن اس مقام پر بھی وہ زیادہ دنوں نہیں رہے اور استعفیٰ دے کر عزلت نشین ہو گئے:

نتیجۂ این ھمہ سختی وتلخی زندگی آن شد کہ شاعر از عدالت بشری مأیوس وروگردان گشت و بہ مال ونعمت دنیا پشت پا زد و تا بود مغضوب مھجور و ناراضیی زیست.[۵]

زندگی کے آخری ایام میں انہوں نے تہران کے غرب میں دروازہ قزوین کے نزدیک ایک خانقاہ تعمیر کروائی تھی اور وہیں اپنا مدفن معیّن کیا تھا۔جو مدفن انہوں نے بنوایا تھا اس سے متعلق یہ رباعیاں انہوں نے اپنے دوستوں کو سنائی تھیں۔

☆ این گوربرِچشم نہا دستم از آن — تا عبرت گیرم از جہان گذران
کزآن ھمہ کاخ ونعمت و مال جہان — این آن من است و باقی آن دگران
☆ ای آنکہ تو سروقد و گلر خساری — وآیی و بر این گور قدم بگذاری

بندیش کہ آنکہ خفتہ زیر قدمت با پای ولب تو، ھردو، دارد کاری[۶]

انہوں نے ۶۷ رسال کی عمر میں ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۰ء میں وفات پائی۔

مقالات ابونصر شیبانی میں ان کے احوال کی تفصیل ملتی ہے۔درج درد، فتح وظفر، گنج گہر، مسعود نامہ، تنگ شکر، زبدۃ آلاثار، شرف الملوک، کامرانیہ، یوسفیہ، خطاب فرخ، فواکہ السحر ، لآلی مکنون ونصائح منظومہ میں ان کے قصیدے، ان کی غزلیات، ان کی رباعیات یکجا ہیں۔ان کے کلام کا انتخاب بھی اسماعیل نصیری قراچہ داغی کے مقدمہ کے ساتھ استنبول سے چھپ چکا ہے۔یہ انتخاب خود شیبانی خان نے میرزا رضا خاں معین الوزرات کی فرمائش پر کیا تھا۔شیبانی خاں کی شاعری کے بارے میں از صبا تانیما سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''شیبانی از سخنوران فصیح وبلیغ قرن سیزدھم است.طبعی قادر وسرشار دارد و مانند یکی از شعرای خوب سبک خراسانی شعرمی سراید.قصاید فراوانی کہ شیبانی در مراحل مختلفہ عمر در مدح شاہ وشاھزادگان ورجال دولت سرودہ، جز سلامت ومتانت واستحکام زیاد، مزیتی برآثار شعرای دیگر از نوع خود ندارد.اما اشعاری کہ وی بالحن پند واندرز، یا در مقام مفاخرہ سرودہ واز مناعت فوق العادۂ طبع ویأس وبدبینی بہ اوضاع کشور ونابسامانی وبی اعتباری زندگانی درباری حکایت می کند، درادبیات آن دورہ بیسابقہ است وتأثیر مستقیم ارتباط با اروپا در آنہا بہ چشم می خورد.'' دراین اشعار بدبینی ورئالیسم مفرطی بہ چشم می خورد کہ درادبیات نیمۂ دوم قرن نوزدھم اروپا رواج داشت واگر چہ بدبینی متاعی نیست کہ از خارج وارد ایران شدہ باشد وحتی عمر خیام درقرن دوازدھم آن را تبلیغ می کردہ است، ولی اشعار شیبانی آن جنبۂ خیالپروری را کہ خاص خیام وپیروان اوست ندارد.''[۷]

احمد خاتمی نے شیبانی کو تیرھویں صدی کا سب سے مقتدر شاعر قرار دیتے ہوئے انہیں سبک خراسانی کا پیرو بتایا ہے:

''شیبانی کہ از مقتدرترین شاعران قرن سیزدھم است بیشتر بہ سبک خراسانی متمایل بود وبیشتر اشعار خود را بہ پیروی از استادان قرن چہارم وپنجم سرودہ ودر تقلید از آنہا بہ حدّ تمام رسیدہ است.[۸]

خاتمی کی یہ رائے اگر چہ مبالغہ پر مبنی ہے لیکن ان کے کلام میں متانت ،سلاست اور استحکام سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔شیبانی کے کلام میں سیاسی اور سماجی رنگ بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ان کی یہ عصری حسّیت انہیں اپنے ان معاصرین سے الگ کرتی ہے جن کے یہاں صرف مدح سرائی پائی جاتی ہے۔ان اشعار میں سیاسی اور سماجی نوعیت پر شیبانی نے بھر پور حملہ کیا ہے۔

☆ داد بسی کردم ونداد کسی داد زین سپس از داد خویش کنم داد
شاه که او رسم عدل و داد نداد زود رود ملک و دولتش همه بر باد
ایمنی اندر جهان به عدل و به دادست هر که جز این جوید، ایمنی بمپناد[9]

☆ شاه را از وزیر نیست گزیر لیک باید وزیر دانشمند
نه که در بند آن بود که کند خانه رنگین و فرش خانه پرند
شاه مارا چنین وزیر مباد بود اگر نیز دل از او برکند[10]

☆ زآن همدم وحوش بیابان شدم که نیست زین مردمان کسیم سزاوار همدمی
وز شهرها گریزم زیرا که پیش از این بگریختند نیز، بزرگان هاشمی
ایشان نه مردمند که در صد هزار مرد یک مرد نی که داند آداب مردمی[11]

شیبانی اپنی سیاسی بصیرت کہ وجہ سے دربار میں بہت دنوں مقبول نہیں رہے اور گوشہ نشینی میں ہی انہیں پناہ ملی۔ واز ایزو منش ومسلک درویشی را برمی گزیند وقبلہ وکعبہ خودرا ((حضرت درویشان)) ودولت و مکنت خودرا ((خدمت درویشان)) می خواند:

قبلہ و کعبہ من حضرت درویشان است
دولت و مکنت من خدمت درویشان است

وهمین سبب شدہ است تا مضامین خوب عرفانی هم دراشعار شیبانی جای گیرد:

چہ غم جای خوری ز آنکہ نماند بر جای عاقل آن است کہ نہ باغ بجوید نہ سرای
چون از این جا بہ دگر جای همی باید رفت گر جہان زان تو باشد همہ مانی بر جای
آنچہ زین جای بہ همراہ توان برد بجوی کان نہ باغ است ونہ مشک ونہ کلاہ ونہ قبای
از خدا خواہ کز او هیچ نخواهی بہ جز او کہ گر او با تو بود، فارغی از هر دو سرای[12]

خاتمی ان کی شاعری کا عمومی جائزہ لیتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار این الفاظ میں کرتے ہیں۔

روی هم رفتہ شیبانی شاعری توانا ست وشعرش از اکثر شاعران دورۂ قاجار قوی تر است وبا این همہ شیرینی وسلاست کلام شاعران دیگری مانند سروش وداوری ومحمود خان ملک الشعرا، شعر شیبانی را تحت الشعاع قرار می دهد.[13]

اشعار از غزل شیبانی:

باغ پریشان و سروو کاج پریشان ملک پریشان وتخت وتاج پریشان
لعنت حق بر لجاج باد،که گشته است کار در شاه از لجاج پریشان
وای به ملکی که شد زداخل و خارج دخل پریشیده وخراج پریشان
شه نکند هیچ خواب امن،چودارد بستر شوریده ودواج پریشان
خیر نبیند شبان زروغن و پشمش هر گله ای را که شد نتاج پریشان
لابد باید یکی طبیبی حاذق مملکتی را که شد مزاج پریشان [۱۴]

نمونہ کے طور پر شیبانی کے یہ چند اشعار قصیدے سے ملاحظہ ہوں۔

فغان از این جهان و خوی زشت او که از بلاست جمله خاک وخشت او
نه هیچ سود دید کس ز کعبه اش نه هیچ بهره یافت از کشت او
از این سپهر راستی مدار امید که بر کژی نهاده سرنوشت او
به کشتزار عمرش آتش افکند هنوز برنخورده کس ز کشت او
الا،مدار هیچ غم چو بگذر همه غم و نشاط و خوب و زشت او
نه هیچ رنجه دل نشین زدوز خش نه هیچ شادمان شو از بهشت او
بپوش تن به هرچه پشت آورد ز پرنیان و پشم دست رشت او

حواشی:

۱۔ یحییٰ آرین پور، از صبا تا نیما، جلد اول، چاپ نہم انتشارات زوار، تہران ۱۳۸۷ش، ص ۱۳۳
۲۔ ایضاً۔ص ۱۳۳
۳۔ ایضاً۔ص ۱۳۴
۴۔ ایضاً۔ص ۱۳۷
۵۔ ایضاً۔ص ۱۳۹
۶۔ ایضاً۔ص ۱۴۰
۷۔ ایضاً۔ص ۱۴۰، ۱۴۱
۸۔ دکتر احمد خاتمی، پژوہشی در نثر و نظم دورۂ بازگشت ادبی، چاپ اول، انتشارات پایا، تہران، ۱۳۷۴ھ، ص ۳۶۳
۹۔ ایضاً۔ص ۳۶۳
۱۰۔ ایضاً۔ص ۳۶۳، ۳۶۴

۱۱۔ ایضاً۔ص۳۶۴

۱۲۔ ایضاً۔ص۳۶۴

۱۳۔ ایضاً۔ص۳۶۵

۱۴۔ یحییٰ آرین پور، از صبا تا نیما، جلد اول، چاپ نہم انتشارات زوار، تہران ۱۳۸۷ش، ص۱۴۱

۱۵۔ ایضاً۔ص۱۴۱۔۱۴۲

۱۶۔ ایضاً۔ص۱۴۳

ڈاکٹر عمر خلیق
پی ایچ ڈی، شعبہ فارسی
جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

اقبال اور ٹیگور

گردش افلاک کی برسوں کی پیچ وتاب کے بعد پردہ خاک سے ایک انسان کامل کو خلعت وجود نصیب ہوتا ہے لیکن ان نابغہ روزگار ہستیوں میں معدودے چند ہی کو یہ شرف حاصل ہوتا ہے کہ وہ گل لالہ کی شکل میں نمایاں ہوتی ہیں ورنہ بیشتر رزق خاک ہوکر رہ جاتی ہیں۔ گلشن بنگال سے ٹیگور اور شاخسار پنجاب سے اقبال کی شکل میں دو ایسے پیکر رنگ ونکہت شاخ حیات پر پھوٹے جن کی خوشبو سے گلشن ہند ہی نہیں بلکہ گلزار عالم معطر ہوگیا۔ ایسا لگتا ہے کہ دست قدرت کی صناعی نے دونوں کی تخلیق میں بخل سے کام نہیں لیا اور ان کو اپنے شاہکار کی حیثیت سے پیش کیا۔ دونوں نے ایسے پر آشوب دور میں سحر خیز آنکھیں کھولیں جب ہندوستان شب وفتنہ کی گرفت میں تھا۔ ملک غلام تھا اور اس کے کاتب تقدیر انگریز تھے۔ اگر یہ سچ ہے کہ ہر شر میں خیر کا پہلو بھی ہوتا ہے تو یقیناً انگریزوں کے تسلط وتغلب نے ہندوستان کی منتشر قوتوں کی شیرازبندی کی اور ان کے ظلم وجبر کے خلاف پورا ملک مذہب ومسلک اور ذات پات سے بالاتر ہوکر وحدت آدم کے ساغر سرجوش سے سرشار ہوگیا۔ اس وقت جن مفکرین کی مسیحانفسی نے قلوب مردہ میں روح حیات پھونکی اقبال اور ٹیگور اس قافلے کے سرخیل کی حیثیت رکھتے تھے۔ ہر عظیم مفکر کی طرح دونوں میں نظریاتی اختلاف بھی تھا اور فکری بُعد بھی۔ لیکن حکیم آئن اسٹائن کے مطابق؛

''چاند میں روشنی بھی ہے اور اندھیرا بھی لیکن خدا نے چاند کا روشن پہلو ہمارے سامنے رکھا ہے لہذا ہمیں بھی چاہیے کہ ہم انسان کی قدر اس کے روشن پہلو کے پیش نظر کریں اور اس کے تاریک پہلوؤں سے صرف نظر کریں۔''

اس قول کی روشنی میں ہم اس مضمون میں دونوں کے مشترکہ افکار وخیالات پر اپنی توجہ مرکوز رکھیں گے اور اختلافی پہلو کو نظر انداز کریں گے کیونکہ یہی اس وقت ہمارے ملک کی ضرورت بھی ہے۔ اقبالؔ کی مادری زبان پنجابی تھی اور ٹیگور کی بنگالی۔ علاوہ ازیں اول الذکر ملک کے مغربی حصہ میں پیدا ہوئے اور ثانی الذکر نے مشرقی تہذیب میں آنکھ کھولی لیکن دونوں کے مشترکہ افکار نے اس بُعد مشرقین کو قران السعدین میں تبدیل کردیا۔ دونوں کی تحریروں میں حب الوطنی، قومی

یکجہتی اور بھارت پر مشتمل کلام کا ورق ذخیرہ موجود ہے اور انکی شاعری آفاقی اقدار سے بھرپور ہے دونوں کے کلام کے کئی ایشیائی اور یورپی زبان میں تراجم ہوئے۔خدا نے دونوں کو حساس دماغ اور دردمند دل عطا کیا تھا۔انکی علمیت اور فضل وکمال کے پیش نظر حکومت نے دونوں کو سر کے خطاب سے نوازا۔

اقبالؔ اور ٹیگور دونوں کا تعلق ایک ادب پرور خاندان سے تھا جس بناء پر انکی پرورش علمی اور ادبی ماحول میں ہوئی۔ٹیگور کے ووالد مہارشی دیوندرناتھ ٹیگور ایک صوفی منش اور اپنے زمانے کے مشہور عالم تھے۔انکا خاندان روحانی بصیرت کے تحت سارے بنگال میں ممتاز حیثیت کا حامل تھا۔مثنوی مولانا روم اور حافظ کے متصوفانہ کلام سے انکو حد درجہ دلچسپی تھی۔روحانیت اور استغنا انکی متاع حیات تھی۔وہ صوفی شعراء اکرام کے کلام سے سرشاری و بےخودی اور سرمستی ودلسوزی حاصل کرتے تھے۔ٹیگور بھی انھیں کے آگوش شفقت میں پروردہ تھے چنانچہ ٹیگور کی ذہنی ساخت بھی انھیں متصوفانہ خیالات واحساسات کی بنیاد پر تھی جسے مولانا روم اور حافظ تبریزی نے قائم کیا تھا۔

اقبالؔ کے دماغ کی پرورش تو طویل سلسلہ تعلیم میں ہوتی رہی لیکن غزائے روح انکو شروع سے ہی جسمانی رزق کے ساتھ باپ سے حاصل ہوتی رہی اور والدہ کی تربیت کا اندازہ اس مرثیہ سے ہوسکتا ہے جس میں بڑھاپے کے قریب پہنچنے اقبالؔ نے ماں کو کس سوز وگداز سے یاد کیا ہے۔تربیت واخلاق کے حوالے سے انھوں نے خود کہا کہ میں اپنا نظریہ حیات فلسفیانہ جستجو سے نہیں حاصل کیا بلکہ زندگی کے متعلق ایک مخصوص زاویہ ورثہ میں مل گیا تھا۔

شاعری کا آغاز دونوں نے سولہ یا سترہ سال کی عمر میں کیا اور رفتہ رفتہ انکی رسائی ادب کے آخری آسمان تک ہوگئی۔ٹیگور کو ''گیتانجلی'' نے ادبی دنیا سے روشناس کرایا تو اقبالؔ نے انقلابی شاعری سے دنیا کے سامنے ایک نیا نمونہ پیش کیا۔اقبالؔ شاعر بھی تھے اور مفکر بھی۔وہ حکیم بھی تھے اور کلیم بھی۔انکی شاعری وہ شاعری ہے جو شاعر کے تلمیذالرحمٰن ہونے کا نتیجہ ہوتی ہے اور جسے پیغمبری کا ایک جزؤ قرار دیا گیا ہے۔علامہ فرماتے تھے کہ میں نے شاعری پر بحیثیت فن توجہ نہیں کی۔جواب شکوہ پر ایک صاحب نے فنی تنقید کی اور زبان ومحاورہ کے لحاظ سے اشعار کو قابل اصلاح قرار دیا تو اس کے جواب میں علامہ نے فرمایا کہ میں نے اپنے مسودہ میں اس سے زیادہ اشعار اور الفاظ پر نشان لگا رکھے ہیں جن کے متعلق مجھے خود تسلّی نہیں ہے۔لیکن تزئین کلام اور اصلاح زبان کے لئے فرصت درکار ہے جو مجھے میّسر نہیں۔وہ ایک فطری شاعر تھے۔ان کا کلام آمد کا نتیجہ ہے آورد کا اس میں کہیں دخل نہیں چنانچہ انھوں نے اپنے متعلق بجا فرمایا ہے کہ مجھے آرائش بیان میں کوشش کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ؛

''فطرت خود بخود کرتی ہے لالہ کی حنابندی''

علامہ نے بارہا کہا تھا کہ میں تب تک شعر نہیں کہتا جب تک کوئی داخلی یا خارجی محرک میری طبیعت سے نغمہ یا نالہ

نہ پیدا کردے۔انھیں خود اعتراف تھا کہ وہ بے عمل ہیں۔میاں بشیر احمد کی روایت ہے کہ ایک بار علامہ نے کہا تھا کہ ٹیگور کی شخصیت علمی ہے اور ان کی شاعری امن وخاموشی کا پیغام دیتی ہے اور میری شاعری میں جدّ وجہد ہے لیکن میری شخصیت عملی ہے۔

نوبل انعام یافتہ ربندرناتھ ٹیگور ایک بلند پایہ ادیب' موسیقار' مصور اور دانشور تھے۔ان کی دلچسپی محض فنون لطیفہ ہی تک محدود نہیں تھی بلکہ پختہ سماجی شعور رکھتے تھے۔شاعر کی حیثیت سے بھی ان کا تخیل بہت بلند تھا۔وہ قول وفعل میں لاثانی تھے لیکن اقبالؔ کی طرح فطری شاعر نہ تھے اور نہ ہی ان کے کلام میں آمد کا سراغ ملتا ہے۔انھوں نے ایک خط میں لکھا جو ان کی دوست پولن بہاری سین کو لکھا گیا تھا جس کے چند ضروری الفاظ یہ ہے:۔

''ایک اعلیٰ سرکاری منصب پر فائز افسر نے جو اتفاق سے میرا دوست بھی تھا اس نے شہنشاہ برطانیہ کی شان میں ایک نظم لکھنے کی فرمائش کی''

اس فرمائش کے بعد انھوں نے قومی ترانہ لکھا۔یہ خط اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا کلام برعکس کلام اقبال آورد کا نتیجہ ہے اور اس میں آمد سے کوئی سروکار نہیں۔ٹیگور جب ہندوستان گئے تو انھوں نے مشرق ومغرب کے گہرے فرق کا مطالعہ کیا اور جب ۱۸۹۰ء میں دوسری مرتبہ ان کو مغرب کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تو شیکسپیر' براونگ' اور ایلز بتھ وغیرہ کے کلام کو پڑھا جس کے نتیجے میں انکی شاعری میں مشرق ومغرب کا ایسا خوبصورت امتزاج پیدا ہوا جو ان سے پہلے کسی دوسرے شاعر کے یاں نہ تھا۔اقبالؔ اور ٹیگور نے شاعری سے جو کام لیا ہے اس کی نظیر ہندوستان کی شعری تاریخ میں نہیں ملتی۔دونوں کے کلام میں ثروت افکار ہے وہ عدیم المثال ہے۔شاعری کو عام طور پر لطف طبع کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔اور اس کو اعمال حسنہ میں شمار نہیں کیا جاتا لیکن اقبالؔ اور ٹیگور کی شاعری وہ شاعری ہے جو گرتوں کو ابھارتی ہے اور خستگان حیات کے دل قومی کرتی ہے۔دونوں کی شاعری انسانیت واخلاق کا مجموعہ ہے۔انگریزی شاعر ٹینی سن نے بجا فرمایا کہ جس شاعری سے ملّت وانسانیت کا دل قومی ہمتیں بلند ہوں اس کو اعلیٰ درجے کے اعمال حسنہ میں شمار کرنا چاہیے۔گرچہ دونوں کی فکر حسن اخلاق کا پیکر ہے لیکن دونوں نے زندگی کے بعض پہلوؤں کو اپنی شاعری وتصانیف میں جابجا جگہ دی ہے جو انکی انفرادیت کا باعث ہے۔

اقبالؔ کے افکار وتاثرات لاثانی کی حیثیت رکھتے ہیں جس طرح کائنات کی کثرت میں ایک وحدت مضمر ہے اسی طرح اقبال کے افکار بھی اپنے ایک وحدت نظر رکھتے ہیں۔مثلاً عشق کا موضوع گرچہ حکما اور صوفیہ کے یہاں بکثرت ملتا ہے۔لیکن اقبالؔ نے ان میں جو نکات پیدا کئے ہیں وہ کسی اور کے کلام میں نہیں ملتے۔اسی طرح توقیر نفس اور عرفان نفس کا مضمون گرچہ قدیم ہے لیکن اقبالؔ نے خودی کو اس زور وشور سے پیش کیا ہے کہ وہ انکا خاص مضمون بن گیا ہے۔اسلام کے

متعلق بھی ان کا جو زاویہ نگاہ ہے وہ صوفی وملا وحکیم سے الگ ہے۔گرچہ قومی شاعری کی ابتدا حالؔی نے کی لیکن اقبالؔ جس طرح قومی مسائل سے دست گریباں ہوئے اس کی مثال بھی کہیں اور نہیں ملتی۔غرض اقبالؔ میں بہت سی ایسی خصوصیات ہیں جو انکو لوگوں سے جدا کرتی ہیں۔اگر ہم ان کے کلام کو بغور پڑھیں تو انکے کلام اور انکی تعلیم کا کوئی پہلو ایسا دیکھائی نہیں دیگا جو محتاج تشریح اور تشنہ تنقید رہ گیا ہو۔

ٹیگور کے فکر وفلسفہ کی انفرادیت انکی وہ مسلسل جدوجہد ہے جو انھوں نے انسانیت شناس اور فطرت شناس کے لئے کی ہے۔انکا فلسفہ' فلسفہ یونان' وید' اپنشد' اور بودھ وغیرہ کا مجموعہ ہے۔انھوں نے مشرق سے ہٹ کر بعض مغربی نظریات کو تسلیم کیا۔انکے دل میں انسانیت کی بھلائی کا ایک ایسا تصور تھا جہاں روح کسی مذہب وملت کی پابند نہ تھی۔وہ تمام قدروں کو بروئے کار لاکر مقصد حیات حاصل کرنے پر یقین رکھتے تھے۔نسلی مناقشے پیش کرانھوں نے تعصب پر بھی انگشت اعتراض رکھا اور قومیت اور علاقائیت کی بنیاد پر برتی جانے والی تفریق کی بھی مذمت کی۔انکے نزدیک انسانیت ایک ایسا عمل ہے جس کا مقصد کائنات کے ذرے ذرے کے حقوق کی حفاظت کرنا ہے۔ٹیگور کی شاعری ومضامین کے مطالعہ کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ حسن اخلاق اور انسانیت دوست تھے اور پوری انسانی برادری کو جسم کے مختلف اعضاء کی طرح متصل ومنسلک دیکھنا چاہتے تھے۔مادیت پر انکا یقین نہ تھا۔وہ فطرت کے شیدائی تھے ان کو مظاہر فطرت میں خالق کائنات کی جھلک نظر آتی تھی۔حب الوطنی اور ہمدردی کے حوالے سے دونوں کے نظریات میں مماثلت پائی جاتی ہے۔دونوں نے قومی ترانہ لکھ کر اپنی حب الوطنی کی دلیل پیش کی لیکن کسی کو کیا معلوم تھا کہ قومیت اور علاقائیت کی بنیاد پر برتی جانے والی تفریق کی مذمت کرنے اور تعصب کی دیوار کو مٹانے کی کوشش کرنے والے ان دونوں دانشوروں کے قومی ترانے بھی تعصب کی نظر ہو جائینگے اور کسی کو کسی تعصب کی بناء پر فوقیت دے دی جائیگی۔بحرحال لسانی یا علاقائی تعصب کی بناء پر ٹیگور کا قومی ترانہ اقبالؔ کے قومی ترانہ پر غالب ہو گیا۔اور ۲۴ جنوری ۱۹۵۰ء کو آئین ساز اسمبلی نے ٹیگور کی اس نظم کے ابتدائی بندھ کو جو شہنشاہ برطانیہ اور ملکہ میری کے ہندوستان آمد پر لکھی گئی تھی آزاد ہندوستان کے قومی ترانہ کا درجہ دے دیا۔زیادہ تو نہیں لیکن دونوں کی شخصیت اور اخلاق کے مطالعہ کے بعد اتنا ضرور کہوں گا کہ اگر دونوں کو ذرا سا بھی اندیشہ ہوتا کہ انکی عدم موجودگی میں انھیں کے کلام کو تعصب کا نشانہ بنایا جائے گا تو یقیناً دونوں نے اپنی حب الوطنی کو ترانے کی صورت میں پیش نہ کیا ہوتا۔

ٹیگور اور اقبال کے یاں وحدت انسانی کا تصور تھا۔دونوں انسانی عظمت کے قائل تھے۔تمام اقدار کے معنی انسانی عظمت کے حوالے سے ہی ہیں۔کسی بھی تہذیب کی عظمت کا اندازہ اس کی ایجادات کے بجائے انسانی وجود کی قدر وقیمت سے لگایا جاسکتا ہے۔انسانی عظمت کو نظر انداز کرنے والی تہذیبوں کا زوال ٹیگور واقبال کے مطابق یقینی

تھا۔انسانی احساسات وجذبات کو پامال کرنا یا انکو پامال ہوتے ہوئے دیکھنا دونوں کی شان کے منافی تھا۔اس سے بڑی انسانیت دوست مثال اور کہاں مل سکتی ہے کہ جب انگریزوں نے جلیانہ والاباغ کا خونی ڈرامہ کھیلا تو Kinghthood خطاب یافتہ ٹیگور کا ضمیر خود پر لعن وطعن کرنے لگا اور انھیں ''گیتا نجلی'' کے وہ اشعار یاد آنے لگے جس کا منظوم ترجمہ سہیل احمد فاروقی نے یوں کیا؛۔

''تم اپنے سوغات اس سے لوگے
ہیں خون آلودہ ہاتھ جس کے
خلوص والفت سے جو بھی ملتا ہو
سر جھکا کر قبول کرلو''۔

بلاخر انھوں نے انگریزوں سے حاصل ہونے والا خطاب جس سے لوگ پانے کے لئے اپنی دولت کو انگریزوں کی قدموں میں ڈال دیتے تھے اسکو ٹھکرا دیا۔ ٹیگور کے ساتھ ساتھ اقبالؔ بھی کس قدر انسانیت دوست و با اخلاق تھے اسکا اندازہ ان کے اس عمل سے لگایا جاسکتا ہے۔

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی
رستے بھی ڈھونڈ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے

اسی غزل کا ایک شعر جو انتخاب کرتے وقت اقبالؔ نے نکال دیا۔

مینار دل پہ اپنے خدا کا نزول دیکھ
اور انتظار مہدی وعیسیٰ بھی چھوڑ دے

اقبالؔ نے یہ شعر غالبًا اس لئے نکال دیا کیونکہ مہدی وعیسیٰ کے متعلق مسلمانوں کے عام عقائد کو کہیں اس سے ٹھیس نہ لگ جائے۔ جو شخص اپنی بات کہتے وقت دوسرے کے احساسات وجذبات کا اس قدر لحاظ کرے اسکا حسن اخلاق کس قدر روشن ہوگا اس کا اندازہ ہم اور آپ نہیں کرسکتے۔ اقبالؔ اور ٹیگور امن وامان کے پرستار تھے۔ انکی غرض بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود تھی۔ اس فلاح کیلئے دونوں احترام آدمیت کو ضروری تصور کرتے تھے اور جہاں تمدن اس تکریم واحترام کے راستے میں حائل ہو کر تذلیل انسانیت کرتا تھا۔ اقبالؔ اور ٹیگور اس نظام کے خلاف تنقید کرتے تھے۔ ہندوستان اور بنگلہ دیش کے قومی ترانے تخلیق کار ٹیگور نے اپنے ایک پیغام میں لکھا؛۔

''انسانی تاریخ نے انسان پر سب سے زیادہ ظلم کیا ہے۔ حسد، شرارت اور ملک گیری کی ہوس نے انسان کے تمام باہمی رشتوں کے پرخچے اڑادیے ہیں۔ لہذا ہم

ادیبوں کا فرض ہے کہ ہم لوگوں کو اس سے نجات دلائیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اخوت انسانی کی ایک مضبوط بنیاد قائم کریں۔ وہ اخوت جو انسان کو وحشیانہ تعصّبات سے نجات دلا سکے۔''

علامہ اقبالؔ کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیں؛۔

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوع انسان کو
اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا

انسانیت پسندی کے حوالے سے دونوں کی فکر میں اتنی مماثلت تھی کہ ایسا محسوس ہوتا ہے گویا دونوں نے ایک دوسرے کی ترجمانی کی ہے۔ اقبالؔ نے اپنے اسی تعصب پر جسے ٹیگور نے وحشیانہ قرار دیا ہے کچھ اس طرح طنز کیا ہے کہ؛۔

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتی ہیں
کیا زمانہ میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

اقبالؔ و ٹیگور کے تحقیقی مطالعہ میں اکثر لوگ غلط فہمی کے شکار ہیں کہ اقبال کی شخصیت مذہبی تھی اور ٹیگور کا ذہن مذہب سے پرے تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبالؔ کا نظریہ حیات اسلامی تھا اور ان کے ذہن میں اسلام اور اس کے مختلف اداروں کا بلند تصور تھا لیکن ٹیگور کو مذہب سے جدا کرنا درست نہیں کیونکہ وہ بھی مذہب کو انسان کے مکمل وجود کی سچائی سے تعبیر کرتے ہیں اور مذہبی تعلیم کو اس لئے ضروری سمجھتے ہیں کیونکہ وہ ہماری زندگی کا محور ہے۔ مذہب ہی سرگرمیوں کو بامعنی بناتا ہے۔ مذہب ہی تیاگ دینے کے جذبے کیلئے محرک بنتا ہے اور ٹیگور اس جذبے کو انسانیت کا جذبہ قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک بھی مذہب کے بغیر صحیح تعلیم ممکن نہیں۔ ان کا مذہب انسانیت کا مذہب تھا۔ وہ اسے خانوں میں بانٹنے کے قائل نہ تھے۔ ان کے خیال میں تمام مذاہب کے بنیادی حقائق مشترک ہیں۔

اقبالؔ اور ٹیگور کی شاعری میں فلسفہ ہے۔ فلسفیانہ تصورات ہیں۔ گہرے افکار اور بصیرت افروز خیالات بھی ہیں۔ دونوں کا فلسفہ جستجوی خیر ہے۔ اقبالؔ اور ٹیگور نے اپنی فلسفیانہ فکر کا استعمال زندگی کو نئی معنویت عطا کرنے کے لئے کیا۔ جس بنا پر انھوں نے بعض حقائق کو وہاں سے اخذ کیا جس پر انھوں نے سخت تنقید بھی کی تھی اور ان بعض برائیوں سے خود کو نجات بھی دلایا جو رسمی طور پر ان کے دامن پاک سے چسپاں تھیں۔ جہاں اقبالؔ کے فلسفہ نے فلسفہ افلاطون کو خاص طور پر رد کیا ہے وہیں اس کے نظریہ شعر کی تردید بھی کی ہے کیونکہ فلسفہ نام ہی ہے آزادانہ عقلی تجسس و تحقیق کا اور تحقیق کے نتیجے پہ عمل پیرا ہونے کا فلسفہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ دین پر ایک تنقیدی نظر ڈالے اور آزادانہ طور پر اسے پرکھے چنانچہ ٹیگور نے اس کے پیش نظر آزادانہ طور پر اپنے دین کو پرکھا اور کہا کہ ویدؔ اپنشدؔ اور گوتم کی تعلیمات سے میں نے روشنی پائی، میں

نے ان خزانوں سے اپنی زندگی اور تعلیمات میں اضافہ کیا۔ وید اور اپنشد سے عقیدت کے باوجود ان کے فلسفہ نے ہندوستان کے افسانوی دیوتاوں کو تسلیم نہیں کیا بلکہ انکا فلسفہ اسی خدا کو مانتا ہے جو ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں؛۔

وہ خدا جو آگ میں ہے پانی میں ہے
اور جو تمام دنیا میں چھایا ہوا ہے
میں اسی خدا کو پیہم سجدے کرتا ہوں
سندیا (شام) گیت

جب کوئی فلسفی شاعر اپنے فن کی پختگی کو پہنچتا ہے تو لاشعوری طور پر تصوف کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ تصوف کی مختلف تعریفیں کی گئیں ہیں لیکن حقیقت میں تصوف وہ چیز ہے جو بغض و نفرت سے بالاتر ہو کر انسان کو عالم علوی کی طرف مائل کرتی ہے۔ اقبالؔ اور ٹیگور میں یہ صفت بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ جس بناء پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اقبالؔ اور ٹیگور نہ صرف تصوف پسند تھے بلکہ اوسط درجے کے صوفی بھی تھے۔ جہاں ٹیگور کی شاعری کا اصل رنگ متصوفانہ ہے وہیں اگر یہ کہہ دیا جائے کہ اقبال کا کلام تصوف کی کیفیت و سرشاری سے لبریز ہے تو غلط نہ ہوگا۔ گرچہ انھوں نے صوفی وملا پہ تنقیض کر اس بات کی تصدیق کی ہے کہ وہ صوفی وملا نہیں لیکن یہ بھی ایک مسلم حقیقت ہے کہ انھیں اکابریں تصوف کے ساتھ بڑی گہری عقیدت تھی۔ جن میں رومی اسلئے قابل ذکر ہیں کیونکہ علامہ نے پیرومرشد قرار دیا ہے۔ اکابریں تصوف سے عقیدت کا اظہار ہی شاہ راہ تصوف پر گامزن ہونے کی دلیل ہے۔ حقیقتاً علامہ کو تصوف سے شغف تو تھا لیکن وہ اس تصوف سے نفرت رکھتے تھے جو انسان کو شجاعت سے دور، عمل سے بیگانہ اور جدوجہد سے علاحدہ کر کے ترک دنیا کی طرف مائل کرے۔ جتنے بھی تصورات عجمی تصوف کے راستے اسلامی افکار کا جزؤ بن گئے ہیں اس سے وہ ملت کا دامن چھوڑانا چاہتے تھے۔

ٹیگور کے فلسفہ حیات میں خلوت نشینی کی کوئی جگہ نہ تھی۔ ان کی متصوفانہ اور ادبی زندگی کا سب سے بڑا ہدف ایسے وسائل حاصل کرنا تھا جو دنیا کو انسانیت کی صحیح خدوخال سے روشناس کرا سکے۔ ترک و تجرد سے نفرت کے باوجود قدیم ہنداستان کی روایات اور تہذیب وتمدن سے انھیں خاص لگاؤ تھا۔ وہ ترک دنیا، تیاگ، تجرد اور سنیاس کو انسانیت کی بلندیوں کے منافی تو سمجھتے تھے لیکن دھیان اور مراقبے کو بھی ضروری سمجھتے تھے کیونکہ اس سے انسان کی یکسوئی اور قوت ارادی کو زندگی ملتی ہے۔

اقبالؔ اور ٹیگور نے اپنی شاعری وتصانیف کے ذریعہ ملک وملت کی خدمت کی ہے اور نوع انسانی کو اخوت ومحبت کا پیغام دیا ہے۔ چنانچہ ہمین چاہیے کہ ہم ان کے پیغام کو عام کریں یہی ان کے لیے حقیقی خراج عقیدت ہوگا۔

کتابیات:۔

نقش اقبال، سید عبدالواجد معینی، اشرف پریس لاہور؛ ۱۹۸۶ء
اقبال کا فن، گوپی چند نارنگ، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس؛ ۱۹۸۳ء
اقبال اور تصوف، آل احمد سرور، اقبال انسٹوٹ کشمیر یونیورسٹی؛ ۱۹۸۰ء
نظریات وافکار اقبال، شیخ محمد علی، نیشنل بک فاونڈیشن اسلام اباد؛ ۱۹۸۴ء
ٹیگور شناسی، شمیم طارق، ریسرچ اینڈ ٹرانسلیشن جامعیہ ملیہ دہلی؛ ۲۰۱۳ء
گیتانجلی (منظوم ترجمہ)، سہیل احمد فاروقی، ٹیگور ریسرچ اینڈ ٹرانسلیشن جامعیہ ملیہ دہلی؛ ۲۰۱۳ء
ابھرتے ہوئے ہندوستانی سماج میں تعلیم، ڈاکٹر صادق جمال، ڈاکٹر عبدالرحیم، شکرپ پبلیکشن دہلی؛ ۲۰۱۲ء
Rudients Of Education;Shankara Narayana Paleeri;Neel Kamal Publications Delhi 2010.

محمد یاسر
ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

اقبال سہیل کی فارسی شاعری

سرزمین اعظم گڑھ علمی و ادبی اعتبار سے ہمیشہ زرخیز رہی ہے اس نے ایسے نادر و نایاب شخصیتوں کو جنم دیا ہے جس کے بغیر شعر و ادب کی تاریخ ادھوری ہے ان میں علامہ شبلیؒ، مولانا حمید الدین فراہی، عبدالسلام ندوی، خلیل الرحمان اعظمی، پروفیسر سید احتشام حسین، یحیٰ اعظمی، شمیم کرہانی، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان ہی نامور ہستیوں میں ایک اہم نام ''اقبال احمد خان سہیل'' کا بھی ہے جو بیک وقت ایک عظیم شاعر، نامور ادیب، بلند خطیب، اعلیٰ معیار کے تنقید نگار، ماہر سیاست داں کے ساتھ ساتھ ایک کامیاب وکیل بھی تھے۔ جن کی پیدائش ۱۸۸۶ء میں بڈھریاں نامی اعظم گڑھ کے ایک گاؤں میں ہوئی۔ ان کے والد نے ان کا نام ''ابوظفر حامد'' رکھا تھا مگر انکے دادا انہیں اقبال کہہ کر پکارتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اسی نام سے مشہور ہو گئے۔ عرفیت ''صاحب'' اور تخلص سہیل ہے۔

اقبال سہیل اردو، عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ فارسی کی ابتدائی تعلیم انہوں نے اپنے والدین سے حاصل کیں۔ جو فارسی زبان و ادب پر مہارت رکھتے تھے انکی دیرینہ خواہش تھی کہ ان کا فرزند بھی فارسی زبان و ادب میں مہارت پیدا کرے چنانچہ وہ سہیل کو فارسی میں خط لکھنے کیلئے کہتے اور غلطیوں پر خود اصلاح کر کے اسے زبانی یاد کرنے کی ہدایت بھی کرتے جیسا کہ افتخار اعظمی تحریر کرتے ہیں:

> **''روزانہ کا دستور تھا کہ سہیل فارسی میں خطوط لکھ کر اپنے والد کو بغرض اصلاح دکھاتے والد کی یہ تاکید تھی کہ جو اصلاحیں دی جائیں انہیں بھی پورے طور سے یاد کیا جائے، بعض اوقات اصلاحیں نہیں مستقل مضامین ہوتے جنہیں حفظ کرنا پڑتا تھا'' ۱**

سہیل کے والد کے ساتھ ساتھ ان کی والدہ ''ام کلثوم'' بھی فارسی شعر و ادب کا نہایت ستھرا مذاق رکھتی تھیں سہیل نے ان سے شیخ سعدی شیرازی کی مایہ ناز کتاب گلستاں و بوستاں پڑھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں کم سنی میں ہی نہ صرف فارسی بولنے اور لکھنے کا سلیقہ آ گیا بلکہ ان کے اندر سخن فہمی اور شعر گوئی کی صلاحیت بھی پیدا ہو گئی۔ فارسی میں انکے بچپن کا ایک نعتیہ شعر ہے۔

عندلیب گلشن فردوس ہستم حامداً مدح خوانی نبی کار است طوبی جائے من

سہیل نے جس وقت یہ شعر کہا تھا اس وقت ان کی عمر صرف ۱۲ سال تھی۔ فارسی وعربی کی حصول تعلیم کیلئے سہیل نے علامہ شبلیؒ اور مولانا حمید الدین فراہی کے سامنے بھی زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ بقول سید سلیمان ندوی

''مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین فراہی صاحب کے وہ باقاعدہ شاگرد ہیں''۲

علامہ شبلی سے انہوں نے دیوان حماسہ، شرح مسلم، بحر العلوم اور القعدۃ الفرید وغیرہ پڑھیں ساتھ ہی بزم شبلی میں نقد سخن اور ادبیات فارسی پر جو مذاکرے ہوتے انھیں یکسوئی سے سماعت فرماتے اور انھیں اپنے حافظہ میں نقش کر لیتے اس سلسلے میں اقبال سہیل اپنے ایک مضمون میں خود رقمطراز ہیں:

''بزم شبلی میں جو مذاکرے فارسی شاعری کے متعلق ہوتے ان کو خاص توجہ سے سنتا حافظہ اللہ نے اچھا دیا تھا۔ اساتذہ کے اکثر اشعار جو ان صحبتوں میں سنتا یا جو تنقیدی نکتے استاد مرحوم ارشاد فرماتے، حافظہ میں نقش ہو جاتے، اس آب حیات کا ہر جرعہ اور بھی تشنگی بڑھاتا اور اسی آرزو میں کہ شاید مولانا کی زبان سے کوئی شعر یا حکیمانہ نکتۂ ادب سننے کو مل جائے اکثر پورا دن اسی بزم شرف میں گزار دیتا''۳

اپنی فارسی استعداد بڑھانے کیلئے شبلی کے ساتھ ساتھ مولانا حمید الدین فراہی کا بھی سہیل نے سہارا لیا۔ جو عربی زبان وادب کے ساتھ ساتھ فارسی ادبیات کا بھی نہایت اعلیٰ مذاق رکھتے تھے۔ اساتذہ ایران کے کلام پر انکی گہری نگاہ تھی سہیل نے ان سے فارسی کے اسرار ورموز سے واقفیت حاصل کر کے اپنے شعر وشعور کو جلا بخشی۔ بقول منور انجم

''فارسی وعربی ادب کی اعلیٰ تعلیم کے حصول کیلئے سہیل عربی وفارسی کے جید عالم اور قواعد کے محقق مولانا حمید الدین فراہی کے دولت کدہ پر موضع پھریہاں پالکی پر سوار ہو کر حاضر ہوتے تھے مولانا بڑی شفقت ومحبت سے سہیل کو درس دیتے تھے اور اس طرح مولانا موصوف نے سہیل کے اندر نہ صرف عربی وفارسی کے مطالعہ کا صحیح مذاق پیدا کر دیا بلکہ ان کے علمی وادبی شعور کو بھی بیدار کر دیا''۴

۱۹۱۳ء میں سہیل نے بنارس سے انٹر کا امتحان پاس کر کے اعلیٰ تعلیم کے حصول کیلئے علیگڑھ کے علمی میکدے میں داخل ہوئے جہاں ذاکر حسین اور رشید احمد صدیقی جیسے علم وادب کے شیدائی سے انکی ملاقات ہوئی۔ سہیل ان احباب کی معیت اور علیگڑھ کی علمی وادبی فضا میں خوب چمکے۔ عرفان عباس تحریر کرتے ہیں:

''علیگڑھ کی علمی وادبی فضا نے سہیل صاحب کی فارسی دانی، شان خطابت اور ذوق سخن پر جلا کی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ آسمان ادب پر چھا گئے۔''۵

علیگڑھ سے ایم، اے اور ایل، ایل، بی کی ڈگری حاصل کر کے اقبال سہیل ۱۹۱۸ء میں اپنے وطن اعظم گڑھ واپس آ گئے اور تلاش معاش کیلئے پیشہ وکالت میں مشغول ہو گئے اور یہ سلسلہ اخیر عمر تک جاری رہا۔ نومبر ۱۹۵۵ء کو وہ اس دار فانی سے ہمیشہ کیلئے کوچ کر گئے۔

اقبال سہیل خداداد صلاحیت کے مالک تھے اردو کے ساتھ ساتھ فارسی زبان میں بھی شاعری کرتے تھے اور فی البدیہہ اشعار کہتے تھے انہوں نے فارسی کے کلاسیکل شعراء، عرفی، نظیری، سعدی وغیرہ کے کلام کا گہرا مطالعہ کیا تھا اگر چہ انہوں فارسی فارسی شاعری کے بہت مختصر نمونے چھوڑے ہیں۔ جو کلیات سہیل میں ''نوائے شیراز'' کے نام سے شامل ہے لیکن ان کا یہ مختصر کلام ہی انکی استادی کے ثبوت کیلئے کافی ہے۔ انکے فارسی کلام میں اردو سے زیادہ طرفگی اور تازگی ہے۔ جیسا کہ رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:

''کم لوگوں کو فارسی کے کلاسیکی ادب پر اتنا عبور ہوگا جتنا مولانا سہیل کو تھا''۶

شاعری میں انہوں نے کبھی کسی استاد کے سامنے باقاعدہ زانوئے تلمذ تہہ نہیں کیا ایک مرتبہ علامہ شبلیؒ سے اپنے کلام پر اصلاح دینے کی درخواست ضرور کی لیکن علامہ شبلیؒ جو سہیل کی فطری صلاحیت، انکی ذہانت اور موزونی طبع کے پہلے سے ہی معترف تھے شاعری میں کسی استاد کی شاگردگی قبول نہ کرنے اور اپنے کلام پر نظر ثانی کرنے کی صلاح دی۔ اس سلسلے میں اقبال سہیل خود رقمطراز ہیں:

''مولانا کی ہمت افزائی نے میرا حوصلہ اتنا بڑھا دیا کہ اصلاح کلام کی استدعا کی۔ تو ہدایت ہوئی کہ کسی کو اپنا کلام اصلاح کی غرض سے نہ دکھاؤں اور اپنے نتائج فکر کی معاندانہ تنقید کرتا رہوں''۷

اقبال سہیل کو علامہ شبلی سے بے پناہ عقیدت تھی ان کا تمام تر علمی و ادبی ذوق علامہ شبلی کے ہی خصوصی فیض تربیت کا رہین منت ہے شبلی کی شخصیت اور شاعری کا جتنا دلآویز اور نکھرا ہوا رنگ سہیل کے یہاں موجود ہے کسی اور کے یہاں نہیں۔ انہیں شبلی سے کس قدر فطری لگاؤ تھا اس کا اندازہ انکے اس ترکیب بند فارسی مرثیہ سے لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے علامہ شبلیؒ کی وفات پر لکھا تھا۔ جو ندرت فکر اور عظمت فن کے اعتبار سے مرثیہ نگاری کی دنیا میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس میں انہوں نے علامہ شبلیؒ کا ایسا سراپا کھینچا ہے کہ اس سے بہتر کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ مثال کے طور پر ایک بند کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

دانش در یگانہ بہ دارالقرار شد　　زیبد اگر جہان ھمہ اش سوگوار شد
باد سحر بماتم او آہ بر کشید　　چشم ستارہ در غم او اشکبار شد
دانش وران دھر بہ ماتم نشستہ اند　　کز روزگار نادرۂ روزگار شد

تا رخ نهفت ساقی خمخانۂ علوم آب بقا بکام خضر ناگوار شد
دردا کہ گنج دارمعارفت ز دھر رفت وا حسرتا کہ شبلی معجز نگار شد
گلزار دین کہ از نم گلشن بھار داشت بے برگ ماندہ است کہ آن آبیار شد
عیسیٰ دمی کہ جان بہ تن مردگان دمید آخر چہ شد کہ خود ز جھان بر کنار شد
خلقی ز خواب وا ھمہ ھشیار کرد و خفت بخت ھنر بہ زمزمہ بیدار کرد و خفت

مذکورہ مرثیہ سات بندوں پر مشتمل ایک طویل مرثیہ ہے اگر چہ مرثیہ کا آغاز قدرتی رموز واشاروں سے ہوتا ہے لیکن اس کے ہر ایک بند سے علامہ شبلیؒ سے انکی محبت وعقیدت صاف جھلکتی ہے۔علاوہ سوز وگداز کے زبان کی صحت کے لحاظ سے بھی یہ مرثیہ ارباب فن کیلئے خاص توجہ کا حامل ہے۔فارسی میں اس مرثیہ کے علاوہ بھی انکے کئی اور شخصی مرثیے موجود ہیں۔جن میں ''مرثیہ مصطفیٰ کمال پاشا ایڈیٹر اللواء مصر'' اورنوحہ دیگر بتقریب یوم شبلی'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔جن میں وقار اور تمکین کی خاص شان پائی جاتی ہے۔

یوں تو فارسی زبان میں انہوں نے غزل،قصیدہ،مرثیہ،قطعہ،رباعی،ترکیب بند سبھی پر طبع آزمائی کی ہے لیکن انکا اصل میدان قصائد ہیں جن میں ان کا کوئی ثانی نظر نہیں آتا۔فارسی میں انکا زیادہ تر شعری سرمایہ قصائد پر ہی مبنی ہے۔لیکن ان کے قصائد دیگر شعراء کے قصائد کی طرح رسمی اور روایتی نہیں ہیں۔اور نہ ہی انہوں نے یہ قصائد انعام اکرام کی غرض سے کہے ہیں۔ان کے قصائد میں جذبے کا خلوص اور شخصیت کے احترام کی بو نظر آتی ہے،قصائد کے موضوعات اور مضامین نظم کرنے میں انہیں حد درجہ کمال حاصل تھا۔ڈاکٹر انیس ادیب تحریر کرتے ہیں:

> ''ان کے فارسی کلام کا تمام تر حسن وکمال قصیدہ میں ہی نظر آتا ہے جہاں کہیں عام شعراء کو ان کے سامنے حریف اور مد مقابل بن کر کھڑے ہونے کی مشکل سے جرأت ہوسکتی تھی۔ان کی قوت تخیل کی سحر کاری اور انداز بیان کی روانی اور جوش کلام کا دلآویز منظر دیکھ کر عرفی جیسا انا پرست شاعران کے عہد میں ہوتا تو اقبال سہیل کے سامنے اسے یہ کہنے میں ضرورتاً مل ہوتا۔
>
> اقبال سکندر بہ جھانگیری نظم
> برداشت بہ یک دست علم را وقلم را۸

شخصی مدح سے متعلق فارسی میں انہوں نے جو معرکتہ الآرا قصائد کہے ہیں ان میں'' قصیدہ در مدح دانشگاہ علیگڑھ،قصیدہ در مدح عثمان علی والیٔ حیدرآباد دکن،قصیدہ تبریک برائے صدرنشیں نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمان خان شیروانی،ترکیب بند درتہنیت جلوس ڈاکٹر ذاکر حسین خان براورنگ یونین مدرسۃ العلوم علیگڑھ،قصیدہ درتہنیت جلوس

محمد اورنگ زیب خان، قصیدہ خیر مقدمی مسز سروجنی نائیڈو، قصیدہ خیر مقدم حضرت مولانا حسین احمد مدنی جانشین شیخ الہند'' وغیرہ خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔ خاص طور سے ان کا وہ فارسی قصیدہ جو میر عثمان علی خان سے متعلق ہے، بہت اہم ہے جسے انہوں نے اپنے طالب علمی کے زمانے میں ۱۹۱۷ء میں میر عثمان علی خان کے ورود مسعود پر بطور نظر تبریک پیش کیا تھا۔ جس کے متعلق رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں۔

''اعلیٰ خضرت شہریار دکن کے ورود مسعود پر مولانا نے جو فارسی قصیدہ اسٹریچی ہال میں سنایا تھا وہ مولانا کی فارسی دانی کا ادنی ثبوت ہے یہ قصیدہ مولانا نے رات بھر میں لکھ ڈالا تھا''۹

مذکورہ قصیدہ ۶۵ اشعار پر مشتمل ایک طویل قصیدہ ہے جس میں سہیل نے فصاحت و بلاغت کا دریا بہانے کے ساتھ ساتھ اپنے ممدوح کی سیرت و شخصیت کی ایسی تصویر کشی کی ہے جس کی مثال محال ہے نمونے کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں:

سحر چون با لب خندان ز مشرق آشکار آمد — دعائی آرزو مندان اجابت در کنار آمد
چنان نور سحر اکنون، افق را گشتہ پیرامون — کہ گرد خلعت اکسون طراز زر نگار آمد
ضیا از آسمان پیدا صفا از مہر کران پیدا — شمیم از بوستان پیدا، نسیم از مرغزار آمد
صبا عطر طرب بیزان ز شبنم صد گھر ریزان — گھی افشان گھی خیزان چو مستی در خمار آمد
کہ ناگہ خسرو خاور ز اوج چرخ بر زد سر — تو پنداری ضیا گستر، لوائی شہر یار آمد
شہ فرخ شیم عثمان علی خان آنکہ ملت را — ز چشم زخم دوران وردنام او، حصار آمد
نظام الملک آصف جاہ سابع رستم دوران — شہ انجم خدم کیوان علم، گردون وقار آمد
ظفر مند و عدو بند و خداوند خدا بندہ — جہان دارای و ملک آرای و شاہ کامگار آمد
الھی بزم گردون راست تا خورشید صدر آرا — الھی ادھم شب را قمر تا شھشوار آمد
بہ مدح ناصر الدین شہ حبیب ارگشتہ قاآنی — سھیل از آصفی گردد بجاھت سازگار آمد

مندرجہ بالا اشعار کسی طرح اہل زبان عرفی، قاآنی کے قصائد سے کم نہیں ہیں انہوں نے اپنی غیر معمولی صلاحیت اور شاعرانہ بصیرت سے صنف قصیدہ میں نہ صرف جدت و ندرت پیدا کی بلکہ اسے ایک نیا رنگ و آھنگ بھی عطا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے فارسی قصائد شعرائے ایران کے قصائد کے پہلو بہ پہلو رکھے جاسکتے ہیں۔

جہاں تک ان کی فارسی غزلوں کا سوال ہے تو کلیات سہیل میں ان کی صرف ایک فارسی غزل موجود ہے، اس کی غالب وجہ یہ ہے کہ غزل سے ان کو بہت کم مناسبت تھی لیکن اس ایک غزل سے ہی ان کے تغزل کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا

ہے۔جس میں انہوں نے محبوب کی صفات کا بیان نہایت دلکش انداز میں کیا ہے۔غزل کے اشعار ملاحظہ ہوں:

دل برد زمن عشوہ گری، آفت جانی شمشاد قدی، لالہ رخی، غنچہ دھانی
بازار جھان گشتم و حقاً کہ ندیدم کالای گران ارز محبت بہ دلانی
مژگان ترنم بین، اگرت ذوق تماشا است خوش سبزہ تر ھست لب جوئی روانی
ای بی خبر لذت آزار محبت صد گوھر گفتار نہ سنجد بہ فغانی
اقبال درین مژدہ کہ در مشھد عشق سرمایۂ کونین فروشند بہ جانی

مندرجہ بالا اشعار سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اگر انہوں نے فارسی میں مزید غزلیں کہی ہوتیں تو وہ بھی ان کے قصائد کی طرح شعروادب کی زینت بنتی۔

غرض یہ کہ سہیل نے اپنی گراں قدر تخلیقات سے فارسی شاعری کو عظمت و وقار بخشا، فارسی میں ان کو کس قدر مہارت تھی اس کا اندازہ صرف وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو فارسی شعروادب کے اسرار و رموز سے بخوبی واقف ہوں۔اگر چہ ہمارے نقادوں نے انہیں نظر انداز کر دیا لیکن ان کے اندر وہ تمام خصوصیات موجود تھیں جو ایک شاعر کو عظیم بناتی ہیں۔ان کی شاعری اہل علم کی خصوصی توجہ کی مستحق ہے۔

حواشی:

۱۔ تابش سہیل، ص ۵
۲۔ اقبال سہیل کا فن، ص ۱۲
۳۔ افکار سہیل، ص ۲۵۷
۴۔ اقبال سہیل حیات اور شاعری، ص ۲۹۔۲۸
۵۔ تذکرہ شعرائے اتر پردیش، حصّہ اوّل، ص ۱۸۷
۶۔ اقبال سہیل کا فن، ص ۱۳
۷۔ افکار سہیل، ص ۲۵۸
۸۔ مشاہیر شعرائے اردو کی فارسی شاعری، ص ۲۹۹
۹۔ افکار سہیل، ص ۵۷

کتابیات:

۱۔ افکار سہیل، ترتیب وتدوین۔شوکت سلطان وعلی حماد عباسی۔شائع کردہ شبلی نیشنل کالج میگزین ۱۹۵۷ء
۲۔ اقبال سہیل حیات اور شاعری، ڈاکٹر منوّر انجم، ۱۹۹۵ء

۳۔ اقبال سہیل کا فن، مرتبہ ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صدیقی، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی ۔۲۰۰۷ء
۴۔ تابش سہیل، مرتبہ افتخار اعظمی، نامی پریس لکھنؤ ۔۱۹۵۸ء
۵۔ تذکرہ شعرائے اتر پردیس، عرفان عباسی، نامی پریس لکھنؤ ۔۱۹۸۲ء
۶۔ مشاہیر شعرائے اردو کی فارسی شاعری، انیس ادیب۔

علی اصغر
ریسرچ اسکالر
جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

فارسی مراثی کے شعری قوالب: ایک تجزیاتی مطالعہ

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مرثیہ نے صحرائے عرب میں نشو ونما پائی . بعد میں خاص طور پر ایران میں استیلائے اسلام کے ساتھ اور سلطنت ساسانیہ کے خاتمے کے بعد یہ خالص عربی صنف سرزمین ایران پہنچی . مرثیہ ابتداء سے ہی فارسی ادب کا اٹوٹ حصہ رہا اور مختلف اصناف سخن کے تغیرات کے ساتھ اس میں بھی تغیر نظر آتا ہے . ابتدائی دور کے مراثی میں یہ بات محسوس کی جاسکتی ہے کہ یہ صرف شخصی اور ذاتی درد وغم کے اظہار کا سامان تھا . مضامین ومحتویات اور ترکیبات واسلوبیات کے حوالے سے عربی مرثیوں سے خاص امتیاز حاصل نہیں کر سکا تھا لیکن تدریجی طور پر مختلف ادوار میں مرثئے کا ارتقائی سفر جاری رہا . اس کے ساتھ یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ فارسی ادبیات کی مکمل تاریخ میں مرثیہ دیگر اصناف سخن کی طرح کبھی بھی شاہی تعاون اور سلطنتی حمایت سے برخوردار نہیں رہا . یہی وجہ ہے کہ اس کا ارتقائی سفر نہایت کم رفتار بلکہ کندرفتار رہا ہے . شاہی دربار سے وابستہ عظیم شعراء نے مختلف مراثی لکھے لیکن ان بلند آہنگ مراثی کے نگارش کا مقصد شاہی توجہات کا حصول نہیں بلکہ یہ مراثی درد دل اور سوز جگر کا اظہار تھے۔

فارسی مراثی کے بیشتر شعری قوالب، قصیدہ، قطعہ، ترکیب بند اور مثنوی ہیں . اس کے علاوہ دیگر شعری ہیئتیں بھی مستعمل ہوئیں لیکن ان کی تعداد انگشت شمار ہیں . سلاطین وامراء کے سوگ میں لکھے گئے مرثیے، کامل طور سے قصیدے کی ہیئت میں ہیں . یہ بات تقریبا مسلم ہے کہ درباری شعراء کے لئے قالب قصیدہ سے زیادہ موزوں اور مناسب کوئی دوسری ہیئت نہیں ہوسکتی تھی یہی وجہ ہے کہ اس قالب میں لکھے گئے تمام مرثیے شکوہ وشوکت الفاظ، جزالت ترکیب، متانت مضامین اور قصیدے کے جملہ اجزاء پہ مشتمل ادب کا بہترین شاہکار ہیں.

قوالب مرثیہ کی دقیق بحث سے پہلے یہاں لفظ " قالب" کے حوالے سے کچھ معروضات پیش خدمت ہیں. مرحوم علی اکبر دہخدا نے لغت نامہ دہخدا میں کلمہ قالب کے ذیل میں لکھا ہے کہ قالب، کالبد کا معرب ہے . ڈاکٹر منصور رستگار فسائی اپنی کتاب انواع شعر فارسی میں رقم طراز ہیں:

"لفظ قالب، معرب کالب و ماخوذ از یونانی است . این کلمہ در فارسی بہ صورت

کالبد و در معنی قالب نیز بہ کار می رود ۔اما برخی از فرہنگ نویسان، اصل این واژہ را تازی می دانند ولی می نویسند: شکل و ہیئت و پیکر و ہیکل و تندیس است و کالب و کلوب نیز بہ معنی ہر چیزی کہ در آن چیز دیگری را گزاشتہ تا بہ شکل آن متشکل گردد، می باشد" (ڈاکٹر منصور رستگار فسائی، انواع شعر فارسی، ص ۴۹)

خلاصہ یہ ہے کہ قالب ایک ظرف کے مانند ہے اس میں جو چیز ڈالی جائے گی وہ ظرف کی شکل کا آئینہ دار ہوگی اور یہی شکل متشکل قالب ہے ۔ادبیات فارسی میں مرثیے کا کوئی مخصوص قالب نہیں رہا جیسا کہ اردو ادب کے مراثی ایک مخصوص ہیئت میں لکھے گئے ہیں اس ہیئت کو مسدس کہا جاتا ہے لیکن یہ ہیئت کربلائی مرثیے کے لئے مخصوص ہے کیوں کہ اردو میں بہت سارے ایسے شخصی مرثیے ہیں جو مختلف فارم اور قالب میں لکھے گئے ہیں ۔فارسی مرثیے کے حوالے سے عبدالرضا افسری کرمانی کہتے ہیں:

"اکثر شعرای ایران مراثی را در انواع ترجیعات و ترکیبات و قصاید بہ قالب نظم ریختہ اند و بعضی مراثی را بہ صورت مثنوی و حتی غزلی سرودہ اند"

(عبدالرضا افسری کرمانی، نگرشی بہ مرثیہ سرائی در ایران، ص ۶۹)

مذکورہ بالا اقتباس کا پہلا حصہ صدفی صد درست ہے کہ اکثر شعرائے ایران نے ترجیعات، ترکیبات اور قصائد کی ہیئت میں مرثیہ نگاری کی ہے لیکن دوسرا جملہ خاص شرائط سے مربوط ہے ۔وہ مراثی جو ایران میں غزل کی صورت میں ہیں وہ شخصی مرثیے سے مختص ہیں البتہ جدید فارسی ادب میں عاشورائی غزل کے عنوان سے معتد بہ ذخیرہ اکٹھا ہو چکا ہے۔ اس تمہید کیبعد مرثیے کے تمام قوالب زیر بحث آئیں گے۔

قطعات:

یہ قطعہ کی جمع ہے اور عربی لفظ سے لیا گیا ہے "یک پارہ" کے معنی میں ہے لیکن فارسی ادب میں یہ لفظ ذرا سے تصرف کے ساتھ داخل ہوا ۔یعنی عربی میں بہ کسر اول رائج ہے جب کہ فارسی میں بہ فتح اول استعمال ہوتا ہے ۔اصطلاحی تعریف کے ذیل میں استاد جلال الدین ہمائی لکھتے ہیں:

"نوع ابیاتی است بر یک وزن و قافیت بدون مطلع مصرع کہ از اول تا آخر ہمہ مربوط بہ یک دیگر راجع بہ یک موضوع اخلاقی و حکایت شیرین یا مدح و ہجو و تہنیت و تعزیت و امثال آن باشد"

(جلال الدین ہمائی، فنون بلاغت و صناعات ادبی، ۱۴۶)

حقیقت یہ ہیکہ قصیدہ اور قطعہ کے مابین کوئی واضح حد فاصل موجود نہیں ہے پھر بھی دقت نظر کا سہارا لیا جائے تو یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ قطعہ کی تعریف میں چند قیود احتراز یہ موجود ہیں.

1۔بدون مطلع مصرع 2۔از اول تا آخر ہمہ مربوط بہ یک دیگر 3۔راجع بہ یک موضوع خاص

یہ وہ عناصر ہیں جو قطعہ کو غزل اور قصیدہ سے ممتاز کرتے ہیں . ڈاکٹر منصور رستگار لکھتے ہیں:

"در اصطلاح، قطعہ نوعی از شعر است کہ دارای ابیات متحد الوزن و متحد القافیہ باشد بدون آن کہ مطلع آن مصرع باشد"

(ڈاکٹر منصور رستگار فسائی، انواع شعر فارسی، ص ۴۹۷)

قصیدہ و قطعہ کے مابین حد فاصل در اصل یہی عدم تصریع مطلع ہے جس کا ذکر دونوں مذکور محققین نے کیا ہے . خود شمس الدین قیس رازی بھی اسی کے قائل نظر آتے ہیں . قطعہ کے ابیات کے متعلق بھی محققین و ناقدین کے درمیان اختلاف موجود ہے۔بعض کے نزدیک حداقل قطعہ دو بیت پر مشتمل ہوتا ہے اوحد اکثر مندرہ یا سولہ انیات پر . لیکن بعض محققین چالیس پچاس اور اس سے زیادہ ابیات ہونے کے قائل ہیں . ایسی صورت میں قطعہ و قصیدہ کے مابین امتیازی صورت وہی عدم تصریع مطلع ہوگی .

بہر حال مرکزی بحث یہ ہے کہ آیا اس قالب میں مرثیے کہے گئے ہیں یا نہیں؟ جواب یہ ہے کہ اسقالب و ہیئت میں بہت سارے مرثیے فارسی شعراء کے دواوین و کلیات میں موجود ہیں . اس میں سب سے مشہور خاقانی شیروانی کا وہ مرثیہ ہے جو اس نے اپنے عم مرحوم کافی الدین کی وفات کے سلسلے میں کہا ہے کہ۔

رفت آن کہ فیلسوف جہان بود و بر جہان — در ہای آسمان معانی گشودہ بود
شد نفس مطمئنہ او باز جای خویش — کآواز ارجعی ہم از آنجا شنودہ بود
دست کمال بر کمر آسمان نشاند — آن گوہر ثمین کہ در این خاک تیرہ بو د
او را فلک برای طبیبی خویش برد — کز دیر باز داروی او آزمودہ بود
آدینہ بود صاعقہ مرگ او، بلی — طوفان نوح نیز ہم آدینہ بودہ، بود
خاقانیا بہ ماتم عم خون گری نہ اشک — کاین عم برای تو پدری ہا نمودہ بود

(دیوان خاقانی، بہ تصحیح احمد سہیلی خوانساری، ص ۶۲۷)

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قالب قطعہ، رثائی مضامین و مطالب کی پیوند کاری کے لئے نہایت مناسب اور موزوں ہے کیونکہ اس ادبی صنف میں اکائیت اور وحدت لازمی جز ہے علاوہ ازاں مرثیہ گوئی بھی قالب و شعر

کے مابین موجود ارتباط کے استحکام وشدت کی متقاضی ہے۔مثلا خاقانی کے مذکورہ قطعہ میں لفظ ومعنی اور ہیئت وقالب کے درمیان جومعنوی ربط ہے وہ اہمیت کا حامل ہے اس میں خاقانی نے مرنے والے کی تمام خصوصیات کا ذکر درجہ بدرجہ اور یک بعد دیگرے شعر میں سمو دیا ہے مثال کے طور پر متوفی چونکہ "فیلسوف" ہے لہذا اس کا لازمہ " آسمان معانی" ہے اسی طرح "نفس مطمئنہ " کا تعلق " حکم ارجعی " سے ہے۔خاقانی نے چوتھے بیت میں کافی الدین کی حذاقت طب کا ذکر کیا ہے اور کہتا ہے کہ آسمان اسے اپنے مداوائے غم کے لئے لے گیا ہے۔

یہاں پر یہ ذکر بے جا نہ ہوگا کہ قالب قطعہ میں عاشورائی مرثیے نہیں لکھے گئے البتہ مقاتل کی بعض کتب میں رجزیاتی قطعات کی شمولیت ہے لیکن ظاہر ہے کہ انہیں ہم رجز کے عنوان سے یاد کرتے ہیں جو خود ایک مستقل صنف ادب ہے البتہ مراثی میں رجزیاتی عناصر پائے جاتے ہیں لیکن ایسے مراثی کی تعداد خال خال ہے اردو ادب کے رثائی ذخیرے میں بہت سارے ایسے مرثیے موجود ہیں جن میں رجز کا مفاخرانہ پہلو غالب ہے۔ہندوستان کے فارسی ادب میں قطعات نگاری نے ترقی کا راستہ مکمل طور پر طے کیا ہے امیر خسرو سے لیکر علامہ اقبال تک شاید ہی کوئی ایسا فارسی شاعر نظر آئے گا جس نے قطعات نگاری نہ کی ہو کیوں کہ یہ ہیئت شعری، حکمی، فلسفیانہ اور منطقیانہ مطالب کے لئے نہایت زرخیز واقع ہوئی ہے۔علاوہ ازاں، شعراء نے مستقل طور سے ایسے قطعات لکھے ہیں جس میں اعزہ واقارب کی تاریخ ولادت و وفات کا ذکر ملتا ہے۔ادبی اصطلاح میں اسے " تاریخی قطعات" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

ہندوستانی فارسی گو شعراء میں تاریخ گوئی کا زیادہ رجحان نظر آتا ہے اکبری عہد میں خواجہ حسین مروی وہ نامور شاعر ہے جس نے جہانگیر کی ولادت کے موقع پر ایک ایسا قصیدہ لکھا تھا جس کے ہر مصرع سے تاریخ برآمد ہوتی ہے۔اس کے علاوہ مغل سلطنت کے اواخر میں تاریخ گوئی کے حوالے سے بڑا نام " میر غلام علی آزاد بلگرامی" کا ہے۔آزاد کی اریخ گوئی کے متعلق پروفیسر سید حسن عباس رقمطراز ہیں:

> **"آزاد بلگرامی نیز از تاریخ گوئی بسیار علاقہ و در این فن مہارت کامل داشت در تولد و وفات شاعران، عالمان و درویشان در مواقع ایجاد و احداث را از آیہ ہای قرآنی، احادیث و عبارت عربی یا در شعر عربی و فارسی بہ دست آوردہ و سرودہ است و اگر ہمہ آن ہا را جمع آوری کنیم کتابی جداگانہ در این موضوع بہ دست خواہد آمد"**
>
> (کلیات آزاد، بہ تصحیح و مقدمہ سید حسن عباس، ص ۱۲۱)

آزاد بلگرامی نے فارسی و اردو کے مشہور شاعر میرزا محمد رفیع سودا کی تاریخ وفات کے حوالے سے درج ذیل قطعہ لکھا ہے:

سہ سخن سنج ہند در یک سال کوچ کردند با ہم از دنیا
میرزا مظہر خدا آگاہ سخن او تمام درد و صفا
نادر العصر شیخ نور الدین یک قلم کرد شعر را احیا
میرزا ی بلند رتبہ رفیع در سخن، صاحب ید بیضا
ہر سہ با بندہ آشنہ بودند حیف رفتند در مقام فنا
بہر تاریخ فوت این یاران کرد آزاد مطلعی انشا
جان جانان و واقف و سودا وارد آشیان ملک بقا

(مصدر سابق،ص ۶۵۵)

ترجیعات:

ترجیع عربی لفظ ہے بمعنی " گرداندن آواز درگلو" چون کہ اس صنف ادب میں ابیات فواصل کی تکرار ترجیع سے مشابہ ہے لہذا اس کو ترجیع ،ترجیع بند یا ترجیعات کہتے ہیں۔استاد جلال الدین ہمائی ،ترجیع بند اور ترکیب بند میں واضح فرق کے قائل نہیں ہیں اسی لئے ان دونوں اصطلاحوں کی تعریف ایک ہی جگہ کی ہے البتہ آخر میں تفریق کے قائل بھی نظر آتے ہیں:

"ترکیب بند و ترجیع ،آن است کہ از چند قسمت اشعار مختلف تشکیل شدہ باشد ہمہ در وزن یکی و در قوافی مختلف۔ بہ این شرح: چند بیت بر یک وزن و قافیہ بگویند و در پایان آن بیت مقفی بیآورند کہ با ابیات پیش در وزن متحد و در قافیہ مخالف باشد و ہم چنان این عمل را چند بار تکرار کنند بہ طوری کہ در فواصل ہمہ بخش ہا بیتی منفرد آمدہ باشد۔پس ہرگاہ یک بیت را در فواصل عینا تکرار کردہ باشند، آن نوع شعر را ترجیع و ترجیع بند و بیت فاصلہ را بند ترجیع یا بند گردان گویند و اگر فواصل با یک دیگر فرق داشتہ باشد آن نوع شعر را ترکیب و ترکیب بند و بیت فاصلہ را بند ترکیب خوانند"

(جلال الدین ہمائی ،فنون بلاغت وصناعات ادبی،ص ۱۸۰۔۱۸۱)

ڈاکٹر رستگار فسائی نے بھی تقریبا انہیں مطالب کی تکرار کی ہے۔انواع شعر فارسی میں اس طرح کی تکرار بہت زیادہ ہے۔بہر حال ترکیب بند و ترجیع بند ایسے اشعار کا مجموعہ ہے جو ایک وزن میں ہوں لیکن قوافی میں مختلف ہوں اس کی ہیئت یوں ہے کہ چند بیت ایک ہی قافیہ و وزن میں ہوں اور آخر میں ایک مقفی بیت شامل کیا جائے اس طرز پر کہ ماقبل

ابیات سے وزن میں تو متحد ہوں لیکن قوافی میں مختلف ہو جائیں اور چند بار اس عمل کی تکرار ہوگی۔ کتاب آرایہ ہای ادبی میں مختصراً اس کی وضاحت یوں کی گئی ہے:

"ترجیع بند: غزل ہایی است ہم وزن وقافیہ ہای متفاوت کہ بیت یکسان مصرعی آن ہارا ہم می پیوندد بہ ہر غزل یک " خانہ" وبہ بیت تکراری" ترجیع" می گویند"

(روح اللہ ہادی، آرایہ ہای ادبی، ص۲۶)

چونکہ یہ صنف، غزل سے خاص مشابہت رکھتی ہے بلکہ غزل کا مجموعہ ہے۔ لہذا نتیجے میں غزل کی طرح بہت سارے مضامین ومطالب کی گنجائش اور امکانات ہوتے ہیں۔ ہر عہد کے شعراء نے اس صنف ادب میں طبع آزمائی کی ہے اس کا قدیم ترین نمونہ فرخی سیستانی (۳۷۰۔۴۲۹ھ) کے یہاں نظر آتا ہے۔

زباغ ای باغبان مارا ہمی بوی بہار آید
کلید باغ مارادہ کہ فردامان بہ کار آید

(مصدر سابق، ص۲۶)

اس صنف ادب کا خاص موضوع، عرفان، تصوف اور عشق ہے۔ شیخ سعدی (۶۰۶۔۶۹۰ھ) نے عشق کے مضامین و معارف کو نہایت دلچسپ انداز میں باندھا ہے۔ اسی طرح ہاتف اصفہانی (۱۱۹۸ھ) نے نہایت عارفانہ اور متصوفانہ اسلوب کے ترجیع بند لکھے ہیں۔ مذکورہ صنف میں فارسی مراثی کی تعداد بہت زیادہ نظر نہیں آتی ہے حالانکہ مرثیہ نگاری کے لحاظ سے یہ صنف نہایت زرخیز ثابت ہوتی ہے۔ سعدی پہلا ایسا شاعر ہے جس نے اس صنف ادب میں مرثیہ لکھا ہے سعد ابن ابی بکر (۶۶۰ھ) کے سوگ مرگ میں زبردست مرثیہ کہا ہے۔ اگرچہ معنوی اعتبار سے کثرت مطالب صدق وصفا نے اسے مرثیے سے زیادہ قصیدہ موعظت میں تبدیل کر دیا ہے لیکن متانت زبان واسلوب بیان کے اعتبار سے بہت عمدہ اور مناسب ہے۔ اس مرثیے کے ابتدائی اشعار میں سوز، کرب اور روح فرسائی کے جملہ لوازمات جمع کر دئے گئے ہیں جس سے اس کی اہمیت دوچنداں ہوگئی ہے:

غریبان را دل از بہر تو خون است — دل خویشان نمی دانم کہ چون است
عنان گریہ چون شاید گرفتن — کہ از دست شکیبائی برون است
مگر شاہنشہ اندر قلب لشکر — نمی آید کہ رایت سرنگون است
دگر سبزی نروید بر لب جوی — کہ باران بیشتر، سیلاب خون است
دگر خون سیاوشان بود رنگ — کہ آب چشم ہا عناب گون است

(کلیات سعدی، بہ تصحیح محمد علی فروغی، ص۹۹۹)

اس کا مطلع، حقیقت میں متانت کلمات، جزالت الفاظ اور ژرف ترکیبات سے متشکل ہوا ہے سعدی نے بہت اچھوتے انداز میں بادشاہ کی سخاوت اور اس کے فقدان کا ذکر کیا ہے وہ کہتا ہے کہ تیرے فراق میں غریبان شہر کے دل خون ہیں اور خویشاوند اں کے دل کی کیفیت اور اضطراب کا اندازہ ممکن ہی نہیں ہے۔ان اشعار میں جہاں متوفی بادشاہ کی مدح و ستائش ہے وہیں اس کے فقدان پہ مرثیہ بھی ہے اس پورے ترجیع بند میں مختلف ادبی صنائع اور بدائع کا استعمال دلکش اسلوب میں ہوا ہے ایک حسن تعلیل کی مثال ملاحظہ فرمائیں:

دگر سبزی نروید بر لب جوی

کہ باران بیشتر، سیلاب خون است

اس بیت میں کئی معنوی تہ داریاں ہیں "سیلاب خون" کی ترکیب سے پورے اندوہگین واقعہ کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔سیلاب خون دراصل اس کیفیت کا بیان ہے جو سعد بن ابی بکر کی وفات سے پیدا ہوئی وہ کہتا ہے کہ اس کے غم فراق میں اس کثرت سے سیلاب خون بہا کہ زمین بنجر ہوگئی اور اب سبزہ ونہال کی روئیدگی نہیں ہوتی۔

ترکیبات:

ترکیب بند کی تعریف، ماقبل بحث میں گزر چکی ہے لیکن بیشتر وضاحت کے لئے روح اللہ ہادی کی بیان کردہ تعریف پیش کی جاتی ہے جو اختصار و ایجاز کا نمونہ ہے:

"ترکیب بند: شعری است چند بخشی کہ ہر بخش آن از نظر قافیہ و درون مایہ ہمانند قصیدہ وغزل است این بخش ہا بیت مصرع متفاوت و نامکرری بہم می پیوندند"

(روح اللہ ہادی، آرایہ ہای ادبی، ص۲۹)

اس ادبی صنف کا شعراء نے مختلف مضامین جیسے مسائل عشق، سرگزشت عشق، معارف ورثا کے لئے انتخاب کیا اس صنف کی ایجاد کے حوالے سے استاد ہمائی لکھتے ہیں:

" باید دانست کہ اصطلاح ترکیب بند و ہم چنین نامیدن ابیات فواصل خانہ ہا بہ نام بند ترجیع و بند ترکیب و اکثر اصطلاحات دیگر، مربوط بہ این نوع شعر ہمہ تازہ و مربوط بہ بعد از قرن ہفتم ہجری تا کنون است کہ شعرای متاخر انصافا بجا و اصطلاحاتی مناسب تر از قدیم وضع کردہ اند"

(جلال الدین ہمائی، فنون بلاغت وصناعات ادبی، ص۱۸۱)

استاد ہمائی نے ترکیب بند و ترجیع بند کی تخلیق و ایجاد کا زمانہ ساتویں صدی ہجری قرار دیا ہے لیکن صاحب کتاب آرایہ ہای ادبی نے قطران تبریزی کو ترکیب بند کا پہلا شاعر مانا ہے:

" قدیم ترین ترکیب بند از قطران تبریزی، شاعر قرن پنجم ہجری است"

(روح اللہ ہادی، آرایہ ہای ادبی، ص ۲۹)

البتہ دیوان قطران تبریزی (بہ تصحیح مرحوم محمد نخجوانی، انتشارات تقفوس، تہران، ۱۳۹۲ش) کے مطالعہ کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ترکیب بند کے عنوان سے کوئی کلام شامل نہیں ہے۔ ایک فصل " فی الترجیعات والمقطعات" کے عنوان سے ہے جس میں چند ترجیع بند اور قطعات شامل ہیں شاید روح اللہ ہادی نے ترجیع کو ترکیب سے خلط ملط کر دیا ہے۔ جمال الدین اصفہانی (۵۸۸ھ) وحشی بافقی (۹۹۱۔۹۶۱ھ) اور محتشم کاشانی (۹۰۵۔۹۹۶ھ) وغیرہم نے اس صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور اس صنف کو آسمان کمال تک لے گئے۔ اگر فارسی عاشورائی مرثیے کے تطور پر نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ فارسی مرثیہ نگاروں نے بیشتر ترکیب بند کے قالب کو اپنایا ہے کیون کہ یہ فارم، بلاغت کلام اور افہام مطالب کے لحاظ سے نہایت وسیع اور پہنائی کا مرقع رہا ہے۔

بعض محققین کے مطابق محتشم کاشانی پہلا شاعر ہے جس نے عاشورائی ادب کے لئے اس ہیئت کا انتخاب کیا لیکن اب یہ بات تقریبا پایہ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ محتشم کاشانی سے قبل بھی بہت سارے فارسی شعراء نے اس مخصوص ہیئت میں مرثیہ نگاری کی ہے۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب نے آذری اسفرائینی کو پہلا فارسی مرثیہ گو شاعر تسلیم کیا ہے۔ (مسعود حسن رضوی ادیب، تاریخ مرثیہ ایران میں عزاداری اور فارسی مرثیہ، ص ۶۵)

حالانکہ جدید تحقیقات کی روشنی میں یہ بات محقق ہے کہ آذری سے ماقبل بھی عاشورائی ادب کا نقش موجود رہا ہے خود کسائی مروزی کا ایک جدید قصیدہ دریافت ہوا ہے جو امام حسین اور مصائب کرب و بلا کے پس منظر میں ہے اسے ہم فارسی ادب کی تاریخ کا پہلا فارسی عاشورائی مرثیہ کہہ سکتے ہیں۔ ہاں البتہ آذری نے محتشم سے پہلے مرثیے کے لئے اس قالب کا انتخاب کیا ہے۔ پروفیسر ادیب نے مختلف تذکروں کی مدد سے آذری کا مذکورہ مرثیہ مرتب کیا ہے۔ قابل ذکر ہے کہ حال ہی میں یہ دیوان، کتاب خانہ، موزہ و مرکز اسناد مجلس شورای اسلامی ایران سے محسن کیانی اور عباس رستاخیز کی تصحیح کے ساتھ شایع ہو گیا ہے جس میں یہ مرثیہ بھی مندرج ہے:

ای دل حیات ماہ محرم حرام شد — آری ، حساب عمر دراین مہ تمام شد
باز از فراق آل نبی آب چشم ما — چون خاک کربلا ز بلا تیرہ فام شد
ما خود مدام غرقہ طوفان محنتیم — خاصہ کنون کہ نوبت طوفان عام شد

بخت یزید نعرہ ہل من مزید زد وز نکبت یزید بدین نکتہ نام شد
بدبخت را وسیلہ ای بی دولتی بس است چون روز کوفیان کہ بہ صد حیلہ شام شد
آن بی بصر نگر کہ متاعی چہ بد خرید عیش ابد فروخت عذاب ابد خرید

(دیوان شیخ آذری، بہ تصحیح محسن کیانی وعباس رستاخیز،ص۱۰۳)

عاشورائی مرثیہ سے قطع نظر، مراثی کی دیگر اقسام بھی اس ہیئت میں موجود ہیں خود امیر خسرو نے ترکیب بند میں ایک تشریفاتی مرثیہ، سلطان شہید کی دردناک شہادت کے پس منظر میں لکھا جو حد درجہ رقاقت اور سوز و گداز سے مملو ہے۔ عہد اکبری کے معروف مورخ ملا عبدالقادر بدایونی کے مطابق دہلی کا کوئی کوچہ ایسا نہ تھا جہاں سے امیر خسرو کے مرثیہ کی صدا بلند نہ ہوئی ہو۔ عہد اکبری کے ملک الشعراء فیضی فیاضی نے بھی چند مرثیے ترکیب بند کے قالب میں کہے ان مراثی کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ فیضی، مناظر کی تصویر کشی اور مسائل کی منظر نگاری و کردار نگاری میں کامل قدرت کا حامل تھا ایک مرثیہ شاہ فتح اللہ شیرازی (۹۹۷ھ) کے حوالے سے بھی لکھا ہے جس میں درونی تالمات کی وہ تصویر کشی ہے جس کی مثال فارسی ادب میں مشکل سے ملے گی:

دگر ہنگام آن آمد کہ عالم از نظام افتد جہان عقل را در نیم روز علم ،شام افتد
زمین و آسمان معرفت زیر و زبر گردد قیامت گونہ آشوبی میان خاص و عام افتد
بنای کارگاہ دانش و بینش خلل یابد اساس بارگاہ ملک و دین از انتظام افتد
ہمہ گنجینہ اقبال در دست لیام آید ہمہ خونابہ او باز در کاس کرام افتد
حقیقت گم کند سر رشتہ تحقیق مقصد را معانی از بیان ماند روابط از کلام افتد
زبان جہل جنبد بی محابا در سخن رانی مطالب نادرست آید دلائل نا تمام افتد

(دیوان فیضی، بہ تصحیح ای.ڈی.ارشد،ص۱۴۹)

مثنویات:

مثنوی اگر چہ عربی لفظ ہے لیکن یہ ادبی صنف، فارسی کی خالص صنف ہے مثنوی کا مطلب " دوگانی" ہے۔ استاد زین العابدین موتمن، مثنوی کی اصطلاحی تعریف کے ذیل میں لکھتے ہیں:

" مثنوی یا مزدوج، قطعہ شعر متحد الوزن را گویند کہ ابیات آن مصرع و بہ عبارت سادہ تر ہر یک دارای قافیہ ای مخصوص بہ خود باشد"

(زین العابدین موتمن، تحول شعر فارسی،ص۱۰۵)

جلال الدین ہمائی نے مثنوی کی تعریف میں دقت نظری اور باریک بینی سے کام لیا ہے:

"مثنوی کہ آن را مزدوج نیز خوانند، نوع اشعاری است کہ در وزن یکی اما دارای قافیہ مستقل باشد۔ چون ہر بیت مستلزم دو قافیہ یا ہر دو مصراع ابیات مقفی است آن را مثنوی نامیدہ اند منسوب بہ کلمہ مثنی مرادف اثنین اثنین کہ بہ معنی (دوتا دوتا) یا (دوگانی) است۔ کلمہ مزدوج نیز ہمان معنی را می بخشد"

(جلال الدین ہمائی، فنون بلاغت وصناعات ادبی، ص ۱۵۶)

مثنوی نگاری کی ارتقائی تاریخ کے مطالعے سے یہ بات واضح ہے کہ یہ فارسی ادبیات میں رائج ترین صنف سخن ہے۔ فارسی کے پہلے صاحب دیوان شاعر رودکی سمرقندی جسے "آدم الشعراء" کا خطاب حاصل ہے، نے کئی مثنویاں سپرد قلم کی ہیں کلیلہ ودمنہ، عرائس النفائس اور سند باد نامہ ان میں مشہور مثنویاں ہیں۔ عہد غزنوی میں کئی معروف اور بلند آہنگ مثنوی نگار شعراء پیدا ہوئے لیکن جو مرتبہ اور عزت شاہنامہ کے خالق فردوسی طوسی کو ملی وہ کسی کے حصہ میں نہیں آئی۔ یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ ایران میں لکھی گئی مثنویوں کا موضوع عام طور پہ فلسفیانہ، حکیمانہ، عارفانہ اور عاشقانہ رہا ہے البتہ رثائی ادب کے حوالے سے مثنوی نگاری میں ایرانی شعراء کا کوئی خاص حصہ نظر نہیں آتا۔ ہاں صفوی حکومت کے قیام اور استحکام کے بعد جب ترکیب بند کی ہیئت میں مرثیہ نگاری کا عروج ہوا تو بعض شعراء نے واقعہ کربلا کو مثنوی کا منظوم قالب عطا کیا لیکن یہ صنف ادب کبھی بھی مرکزی حیثیت حاصل نہ کر سکی۔ ابتدائی عہد کے حوالے سے بعض محققین نے فردوسی کے شاہنامے میں رثائی عناصر تلاش کئے ہیں:

بہ مادر خبر شد کہ سہراب گرد — بہ تیغ پدر خستہ گشت و بمرد
خروشید و جوشید و جامہ درید — بہ زاری برآن کودک نو رسید
بزد چنگ و بدرید پیراہنش — درخشان شد آن لعل زیبا تنش
برآورد بانگ و غریو و خروش — زمان تا زمان زاو ہمی رفت ہوش

(شاہنامہ فردوسی، ص ۹۸)

ہندوستانی فارسی ادب میں کئی مثنویاں کربلا کے پس منظر میں لکھی گئیں خاص طور سے عاشورائی ادب کا فروغ اواخر مغل سلطنت میں نظر آتا ہے۔ بہر حال مثنوی "رضا نامہ" مستقل طور پر حوادث کربلا کے متعلق ہے جسے فارسی کے معروف شاعر ملا اشرف بلبل کشمیری نے پیکر نظم عطا کیا یہ مثنوی درحقیقت نظامی کے تتبع میں لکھی گئی۔ اشرف کشمیری نے نظامی گنجوی کے خمسہ کے طرز پہ مکمل خمسہ (ہیمال ناگرائی) (ہشت اسرار) (مہر و ماہ) (ہشت بہشت) (رضا نامہ) لکھا

ہے زیر بحث مثنوی کے چند بیت پیش ہیں:

بجنبید لشکر چو دریای شور جوان درمیان ہم چو بہرام گور
ہمی زد چپ و راست در پیش و پس ہمی راند لشکر چو فوج مگس
ز ہر سو بدو تیر باران زدند فلاخن زمان سنگساران زدند
بہ تیغ و سنان و بہ گرز گران سدا شد چو بازار آہن گران

(مثنوی رضا نامہ، قند پارسی شمارہ ۲۶/۲۵)

یہ شعری اقتباس، حضرت قاسم بن حسن علیہ السلام کے حملے اور جنگ کے سلسلے میں ہے۔ ملا اشرف نے احوال و مناظر جنگ کی بہترین تصویر کشی کی ہے اس کے علاوہ ایک اور کربلائی مثنوی کربلائے معلیٰ یا کربلا نامہ کے نام سے محفوظ ہے۔ مظفر علی اسیر لکھنوی اپنے عہد کے نامور صاحب علم اور دوزبانہ شاعر تھے یہ مثنوی ان کے قدرت بیان اور اعجاز و ایجاز نگاری کی بین دلیل ہے اس مثنوی میں اسیر لکھنوی جناب قاسم بن حسن کے حملوں کی منظر کشی یوں کرتے ہیں:

سوار اسپ شد آمد بہ میدان کہ میدان از جمالش گشت رخشان
شد از نور جمال آن دلاور بہ میدان ذرہ ذرہ ، مہر انور
بہ تسلیمش خمیدہ ہر علم شد سر ہر نیزہ مثل تیغ خم شد
بہ گرد آن جری فوج سلحشور چو پیرامون لشکر مور

(مظفر علی اسیر، کربلائے معلیٰ، ص ۲۰۹)

اسیر کے درج بالا اشعار سے ان کی قدرت کلام اور مہارت فن کا اندازہ ہوتا ہے ملا اشرف کشمیری کے اسلوب میں سادگی اور یک گونہ بے رنگی ہے لیکن اسیر کا انداز بیان نہایت موثر، جانگداز اور متاثر کن نظر آتا ہے ان کی مثنوی کا اسلوب اور سبک نگارش شاہنامہ فردوسی کی حماسہ آفرینی کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔

غلام علی موسوی نے بھی ایک مثنوی بعنوان " حملہ حسینی " نظم کی ہے یہ مثنوی بھی کربلا کے خوں چکاں پس منظر اور میر زار فیع باذل کی مثنوی حملہ حیدری کا تتمہ ہے حملہ حسینی کی تالیف کے حوالے سے غلام علی موسوی لکھتے ہیں:

نبرد علی را چو مرزا رفیع رقم کرد آورد اجرش شفیع
بہ فتح و ظفر کرد انجام آن نہاد حملہ حیدری نام آن

(حملہ حسینی، ورق ۶ الف)

اس مطالعہ سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ ایران میں عاشورائی ادب کے حوالے سے مثنوی نگاری میں وہ ارتقائی کمال

معدوم ہے جو ہندوستانی فارسی گوشعراء نے اپنے ابداع پسند ذہن سے تخلیق کیا ہے۔

قصائد:

لفظ قصیدہ عربی زبان سے ماخوذ ہے یہ واحد عربی ہیئت ہے جو بغیر کسی تغیر وتبدل کے فارسی ادب میں داخل ہوئی اور تاریخ ادبیات فارسی میں اس کا نفوذ اتنا وسیع پیمانہ پر رہا ہے کہ پوری تاریخ ،قصیدہ گوئی سے بھری ہوئی ہے۔ زین العابدین موتمن لکھتے ہیں:

" قصیدہ درلغت قصد شدہ و در اصطلاح ادبی بہ شعری اطلاق می شود کہ بر بیش از پانزدہ یا بیست بیت مشتمل باشد وکلیہ ابیات نیز در وزن وقافیہ از بیت مصرع نخستین پیروی نمایند" (زین العابدین موتمن،تحول شعر فارسی،ص ۷)

مذکورہ تعریف میں وہ جامعیت و مانعیت نہیں ہے جو استاد ہمائی کے یہاں موجود ہے وہ رقم طراز ہیں:

" نوع اشعاری است کہ بر یک وزن وقافیہ با مطلع مصرع ومربوط بہ یک دیگر در بارہ موضوع ومقصود معین از قبیل مدح پادشاہ وتہنیت جشن عید وفتحنامہ جنگ یا شکر و شکایت وفخر وحماسہ سرائی ومرثیہ وتعزیت ومسائل اخلاقی واجتماعی وعرفانی وامثال آن ساختہ باشند" (جلال الدین ہمائی ،فنون بلاغت وصناعات ادبی،ص۱۰۲)

استاد ہمائی کی معین کردہ تعریف سے واضح ہے کہ قصیدہ کے اہم موضوعات میں معنی خیز موضوع مرثیہ اور تعزیت بھی ہے اکثر نامور اور ملوک الشعراء، شاہی دربار سے منسلک رہے ہیں اور مختلف مناسبات کے عنوان سے قصائد بھی کہے اور بڑے بڑے جوائز وصلات حاصل کئے ہیں یہ شعراء ممدوح کی تعریف کے ساتھ سلطان وامیر کی شہادت والمناک قتل پہ بھی رثائی قصیدے لکھتے تھے۔ مدحیہ قصائد، مال وزر کے حصول کا ذریعہ تھے یہی وجہ ہے کہ ان میں شوکت الفاظ ،شکوہ معنی اور جزالت تراکیب کا خاص خیال رکھا جاتا تھا لیکن رثائیہ قصیدے بغیر کسی مالی توقع ومنفعت کے لکھے گئے اس لئے ان میں فطری سوز وگداز ہے اور عمیق احساسات کے آئینہ دار بھی ہیں۔ ان رسمی مراثی میں فرخی سیستانی کا وہ مرثیہ قاری کے اردگرد نہایت محزون فضا مسلط کر دیتا ہے جو محمود غزنوی کی وفات کے سلسلے میں لکھا گیا تھا:

شہر غزنین نہ ہمان است کہ من دیدم پار — چہ فتادہ است کہ امسال دگرگون شدہ کار
خانہ ہا بینم پر نوحہ و پر بانگ وخروش — نوحہ و بانگ خروشی کہ کند روح فکار
کوی ہا بینم پر شورش و سرتا سر کوی — ہمہ پر جوش ہمہ جوشش از خیل سوار

(دیوان فرخی سیستانی، بہ تصحیح علی عبدالرسولی،ص۹۲)

یہ رثائیہ قصیدہ بھی دیگر قصائد کی طرح مطلع تخلص، گریز، مدح اور دعا و شریطہ پر مشتمل ہے البتہ اس قصیدہ کا آغاز معنوی مناسبات کے سبب تغزل، نسیب اور تشبیب سے نہیں ہوا بلکہ سوز و غم اور گداز و گداخت کی فضا ہموار کرنے کے لئے براہ راست ایسی ترکیبات و کلمات کو پرویا گیا جو شاعر کے محزون دل کی عکاسی کر سکے اور غم درون کی ترسیل کا ذریعہ بن جائے۔

ابھی تک کی گفتگو رسمی مرثیوں کے محور پہ مرکوز تھی۔ مذہبی رثائیہ قصائد کی اگر بات کی جائے تو یہ روشن اور واضح ہو جاتا ہے کہ اس صنف ادب میں بھی قصائد کے جملہ اجزائے ترکیبی کا اہتمام اور پاس لحاظ رکھا جاتا تھا۔ عاشورائی ادب کا پہلا رثائیہ قصیدہ تقریبا تمام لازمی اجزاء پر مشتمل ہے۔ کسائی مروزی (۳۴۱ھ) چوتھی صدی ہجری کا شاعر ہے ایسا شاعر جس کے قصائد، دینی و حکمی موضوعات اور مضامین سے لبریز ہیں اس نے رثائی ادب میں بھی طبع آزمائی کی ہے یوں کہا جا سکتا ہے کہ وہ پہلا فارسی شاعر ہے جس نے عاشورائی مرثیہ لکھا۔

باد صبا درآمد فردوس گشت صحرا آراست بوستان را نیسان بہ فرش دیبا
آمد نسیم سنبل با مشک و با قرنفل آورد نامہ گل باد صبا بہ صہبا
کہسار چو ن زمرد نقطہ زدہ ز بسد کز نعت او مشعبد حیران شدہ ست وشیدا

(کسائی مروزی، بہ تصحیح ڈاکٹر محمد امین ریاحی، ص ۶۵)

کسائی مروزی نے تقریبا اٹھائیس ابیات میں تشبیب، طبیعت و فطرت کے مناظر کی تصویر کشی کی ہے پھر درج ذیل بیت سے گریز کرتے ہوئے رثائی مضامین کی طرف رخ کیا ہے:

دست از جہان بشویم عز و شرف نجویم
مدح و غزل نگویم مقتل کنم تقاضا

(مصدر سابق، ص ۶۹)

بیت ذیل میں تمہید کا مقصد یوں بیان کیا ہے:

میراث مصطفیٰ را فرزند مرتضیٰ را
مقتول کربلا را تازہ کنم تولا

(مصدر سابق، ص ۷۰)

بعد کے حصے میں امام حسین علیہ السلام کے فضائل و مناقب کا ذکر کرتے ہوئے امام کی مظلومانہ شہادت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کسائی مروزی نے امام کے فرزند عبداللہ رضیع یا علی اصغر کو اسلامی مورخین کے برعکس شش ماہہ کے

بجائے پنج ماہہ کہا ہے۔

آن پنج ماہہ کودک باری چہ کردو یحک
کز پای تا بہ تارک مجروح شد مفاجا

(مصدر سابق، ص ۱۷)

ذہن نشین رہے کہ یہ قصیدہ اپنی طرز و اسلوب اور سبک نگارش میں یگانہ ہے اس معیار کا رثائی قصیدہ فارسی شعریات کی تاریخ میں موجود نہیں ہے البتہ بہت سارے شعراء نے جو مذہبی رثائیہ قصائد لکھے ہیں وہ ان ادبی خصائص سے بے بہرہ ہیں جو کسائی کے قصیدے کا خاصہ ہیں۔ یہاں پر اہلی شیرازی کے مذہبی رثائیہ قصیدے کے کچھ شعر پیش ہیں:

ماہ محرم است و شد دجلہ روان ز چشم ما — بہر حسین تشنہ لب شاہ شہید کربلا
تشنہ لبان کربلا روی بہ خاک و تن بہ خون — ما پئی آبروی خود خاک بر آبروی ما
با شہدای کربلا لاف وفا ہر آن کہ زد — گر نہ شہید گریہ شد مدعی است بی وفا

(کلیات اشعار مولانا اہلی شیرازی، بہ تصحیح حامد ربانی، ص ۴۲۲)

رباعیات:

رباعی ایرانیوں کی اختراع ہے شمس قیس رازی کا یہی قول ہے۔ البتہ عربوں نے بھی اسی کی تقلید و تتبع میں رباعیاں لکھی ہیں اس صنف کے آغاز کا ابتدائی نقش دورہ ساسانیان سے ملتا ہے لفظ رباعی عربی لفظ ہے اس کی اصطلاحی تعریف کے ذیل میں زین العابدین موتمن لکھتے ہیں:

"رباعی و دوبیتی شعری را گویند کہ بنای آن بہ چہار مصراع متحد الوزن باشد گاہی ہر چہار مصراع و اغلب سہ مصراع اول و دوم و چہارم ہم قافیہ اند"

(زین العابدین موتمن، تحول شعر فارسی، ص ۸۷)

اگر شمس قیس والی روایت درست اور منطقی ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ صنف رباعی فارسی کی ابتدائی اصناف سخن میں سے ہے جس میں ابتدائی عہد کے بزرگ اور معروف شعراء جیسے رودکی سمرقندی اور شہید بلخی نے طبع آزمائی کی ہے۔ رباعی مختلف قسم کے موضوعات جیسے فلسفہ، عرفان، عشق، موعظت و نصیحت پر مشتمل ہوتی ہے۔ رثائی مضامین کے لحاظ سے یہ صنف سخن ہندوستانی فارسی شعراء کی رہین منت ہے۔ ہندوستان میں کربلائی اور عاشورائی مضامین و موضوعات کی بیکرانی اور وسعت پہلی مرتبہ اس مختصر صنف میں سمونے کا کامیاب تجربہ کیا گیا ہے۔ میرزا سلامت علی دبیر کی بعض عاشورائی رباعیات یہاں درج کی جاتی ہیں۔

درکوچہ عشق، کامل بود شبیر بر دوست نثار بود از دل شبیر
آن جلوہ کہ دیدہ بود موسیٰ بر طور می دید بہ زیر تیغ قاتل، شبیر

(مصحف فارسی، میرزا سلامت علی دبیر، ص ۲۶)

علامہ سید محمد ہارون حسینی حلم زنگی پوری (۱۹۲۱ء) نے بھی رباعی میں کربلائی مضامین کو باندھا ہے ملاحظہ فرمائیں:

نور نظر سید بطحاست حسین لخت جگر بتول عذراست حسین
او ہمرہ دین و دین حق ہمرہ اوست واللہ بقای لا والاست حسین

(کلیات فارسی حلم، علامہ سید محمد ہارون، ص ۹۴)

منابع و مآخذ:

ہادی، روح اللہ، آرایہ ہای ادبی، ادارہ کل نظارت برنشر و توزیع مواد آموزشی، تہران ۱۳۹۴ش۔
رستگار فسائی، ڈاکٹر منصور، انواع شعر فارسی، انتشارات نوید، شیراز ۱۳۷۲ش۔
ہمائی، جلال الدین، فنون بلاغت وصناعات ادبی، انتشارات توس، اول خیابان دانشگاہ تہران، ۱۳۶۱ش۔
افسری کرمانی، عبدالرضا، نگرشی بہ مرثیہ سرائی در ایران، انتشارات اطلاعات، تہران ۱۳۷۱ش۔
موتمن، ذین العابدین، تحول شعر فارسی، چاپ شرق ۱۳۳۹ش۔
خاقانی شیروانی، دیوان خاقانی، بہ تصحیح احمد سہیلی خوانساری، تہران ۱۳۳۶ش۔
بلگرامی، آزاد، کلیات آزاد بلگرامی، بہ تصحیح سید حسن عباس، مرکز تحقیقات فارسی رایزنی فرہنگی جمہوری اسلامی ایران، دہلی نو، ۱۳۹۳ش۔
شیرازی، سعدی، کلیات سعدی، بہ تصحیح محمد علی فروغی، انتشارات ہرمس، تہران ۱۳۸۵ش۔
آذری، شیخ، دیوان شیخ آذری، بہ تصحیح محسن کیانی و عباس رستاخیز، کتاب خانہ، موزہ و مرکز اسناد مجلس شورای اسلامی، تہران ۱۳۸۹ش۔
فیاضی، فیضی، دیوان فیضی، بہ تصحیح ای ڈی ارشد، ادارہ تحقیقات پاکستان، دانشگاہ پنجاب، لاہور ۱۳۶۲ش۔
اسیر، مظفر علی، کربلای معلیٰ، مطبع نول کشور، لکھنو ۱۳۳۱ھ۔
سیستانی، فرخی، دیوان فرخی، بہ تصحیح علی عبدالرسولی، مطبع مجلس ۱۳۱۱ش۔
امین ریاحی، ڈاکٹر محمد، کسائی مروزی، زندگی، اندیشہ و شعر او، انتشارات علمی تہران ۱۳۷۵ش۔
دبیر، میرزا سلامت علی، مصحف فارسی، بہ ترتیب ڈاکٹر سید تقی علی عابدی، شاہد پبلیکیشنز، دہلی ۲۰۰۵ء۔
ہارون زنگی پوری، سید محمد، کلیات فارسی حلم، بہ تحقیق و تعلیق سیدہ بلقیس فاطمہ حسینی، دانشگاہ دہلی ۲۰۰۶ء۔
رضوی ادیب، سید مسعود حسن، تاریخ مرثیہ ایران میں عزا داری اور فارسی مرثیہ، محبان ام الائمہ علیہم السلام تعلیمی و فلاحی ٹرسٹ، دہلی ۲۰۱۵ء۔

عابدابراہیم پارا
ریسرچ اسکالر،شعبہ فارسی،اردووعربی
پنجابی یونیورسٹی،پٹیالہ

گرامیؔ جالندھری کی شخصیت اورشاعری

غلام قادر گرامیؔ جالندھری کی شخصیت اتنی عظیم ہے، کہ اہل ہند اور خاص کر پنجاب کے عوام کو ان کی عظمت و رفعت پرفخر ہے۔اہل پنجاب نے ان کی ذات پر ہر وقت ناز کیا ہے۔کیوں کہ انہوں نے اپنی زندگی میں انسانیت کو بلند سے بلندتر کرنے کی کوشش کی اور عروسِ انسانیت کی مشاطگی کے لیے خود کو ہمیشہ وقف رکھا تھا۔ان کے نظریات وخیالات آج بھی انسانیت کی تعمیر میں سرگرم ہیں۔گرامیؔ کے خیالات کو آفاق گیر سمجھا جاتا تھا۔وہ تنگنائی پنجاب و ہند میں ہی محدود نہ رہ سکے۔اہل ہند واہل ایران کی طرح انہوں نے ادب شناس ومفکرینِ عالم کی توجہات کو اپنی طرف کھینچ لیا۔گرامیؔ جالندھری کے اہل پنجاب پر کافی گہرے اثرات پڑے۔تقریباًپورے ہند کے عوام نے خیالات ونظریات کو سمجھنے میں بڑے ذوق وشوق اورانہماک کا ثبوت دیا۔کئی اشخاصِ پنجاب نے گرامیؔ کے حالاتِ زندگی کوقلم بند کیااور گرامیؔ جالندھری کے بہت سے پہلوؤں کو روشناس کرایا،جن میں طارق کفایت کا نام بڑی عزت واحترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ بیرون ملک کے ادب شناس لوگ جالندھری کی شخصیت سے بہت متاثر ہوئے۔انھوں نے گرامیؔ جالندھری کی شعری حیات کے متعدد پہلوؤں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی۔ بہت سے ادب شناسوں نے ان کی عرفانی شاعری کی نقاب کشائی کرکے عوام وخواص کو بہت قریب کرنے کی جدوجہد کی۔

غلام قادر گرامیؔ جالندھری کی سنہِ پیدائش کے متعلق مختلف روایات ملتی ہیں۔جس کی وجہ سے کچھ لوگ گرامیؔ جالندھری کی سنہِ ولادت ۱۸۵۶ء اور کچھ ۱۸۵۷ء کہتے ہیں۔ان سب کا جائزہ لینے کے بعد یہ طے ہوا ہے کہ گرامیؔ جالندھری۱۸۵۶ءیااس سے ایک دوسال پہلے پیدا ہوئے تھے۔آپ کے والدمحترم کا نام شیخ سکندر بخش تھا۔خود انہوں نے اپنے فرزند کا نام غلام قادر رکھا ہے اوراس پر گرامیؔ جالندھری کو ہمیشہ فخر رہا۔گرامیؔ جالندھری نے خود اپنے نام کے بارے میں لکھتے ہیں:

''غلام قادر فرخند نامم
گرامیؔ غوث اعظم راغلامم''[۱]

(دیوان گرامی جالندھری،ص۱۴۴)

ابتدائی تعلیم محلے کی مسجد میں حاصل کر کے خلیفہ ابراہیم کے مکتب میں داخلہ لیا۔مکتب میں ہی خلیفہ ابراہیم نے گرامی جالندھری کے اندر پوشیدہ صلاحتیوں کو پہچان لیا۔بعد ازاں تحصیل علم کے شوق میں آپ نے اورینٹل کالج میں داخلہ لیا۔وہاں آپ نے منشی عالم اور منشی فاضل کے امتحانات پاس کئے۔ وکالت کی ڈگری حاصل کی،لیکن وکالت کو پیشہ کے طور پر کبھی بھی نہیں اپنایا اور امرتسر میں مدرس کے طور پر کام کرنے لگے،پھر یکے بعد دیگرے ملازمت کے سلسلے میں جالندھر،کپورتھلہ،لدھیانہ اور مالیر کوٹلہ بھی پہنچے۔نازک مزاج ہونے کی وجہ سے کسی بھی ملازمت سے مطمعن نہ رہے ۔پھر پٹیالہ کے وزیراعظم نے مشورہ دیے کران کو دکن جانے کے لیے کہا،لیکن گرامی جالندھری کے مالی وسائل اتنے نہیں تھے کہ وہاں جا سکے،مگر تقدیر میں ان کا دکن جانا منظور تھا،اس لیے یکے بعد دیگرے اسباب مہیا ہونے لگے۔اس سلسلے میں کئی روایات دیکھنے کو ملتی ہیں۔ایک یہ کہ گرامی جالندھری نے داتا گنج بخش کے آستانے پر حاضری دیکر ایک منقبت لکھی،جو بہت مقبول ہوئی اور آپ کو خواب میں دکن جانے کی بشارت ملی۔اسی طرح حضرت معین الدین چشتی کی شان میں منقبتوں کا سلسلہ ''بیسہ اخبار'' میں شائع ہوا تھا۔گرامی جالندھری نے بھی منقبت کہی جو مقبول ہوئی اور آپ کو آخر دکن جانا نصیب ہوا۔دکن جا کر انہیں پنجاب کے وزیراعلیٰ خلیفہ محمد کی سفارش کی وجہ سے وہاں کے دربار میں بہت جلد رسائی ممکن ہوئی۔

آخر کار ذیابطیس سے آپ کو آخری دم تک نبرد آزما رہنا پڑا اور اسی کے سبب ۱۹۲۷ء کی درمیانی شب کو اپنی جاں جان آفرین کے سپرد کر دی اور ہوشیار پور کے قبرستان کندن شاہ بخاری میں دفن کئے گئے،جو حضرت نور جمال الدین کے مزار کے بلکل نزدیک ہے۔گرامی جالندھری نے آخری وقت صرف ایک وصیت کی تھی جس کو طارق کفایت نے اس طرح رقم طراز کیا:

> **''گرامی نے اپنی ایک نعت اور رباعی قبر میں اپنے ساتھ دفن کرنے کی وصیت کی تھی مگر دفن کے وقت وصیت یاد نہ رہی تو بعد میں یہ دونوں چیزیں سرخ پتھر پر کندہ کرائے آپ کے مزار پر لگوا دگئیں اور یہ پتھر اب بھی موجود ہیں۔''[۲]**

(ملک الشعرا گرامی جالندھری،ص۱۴)

مولوی عبدالحق نے گرامی کی شخصیت و کردار کے بارے میں اس طرح بیان کیا ہے:

> **''کبھی بھی خیال نہیں ہوا کہ شاعر موصوف ایسا صاحب ذوق شخص تھا اگر چہ مدتوں وہ آبہ گنگو جمن میں رہا مگر لب ولہجہ سے ٹھیٹ پنجابی تھا۔''[۳]**

(چند ہم عصر،ص۵۸؛۱۵۷،اردو اکیڈیمی سندھ،کراچی)

مولانا گرامؔی جالندھری بہت زندہ دل اور نازک مزاج کے شخص تھے۔ سادگی آپ کی زندگی کا خاصہ تھا دربار سے لوٹ کر ڈھیلا ڈھالا لباس پہن کر مسند یہ تکیہ لگا کر بیٹھ جاتے ،حقہ پینے کے ساتھ فکر شعر میں بہت مصروف رہتے تھے۔ بہت دیر تک عالم محویت میں خود گنگناتے رہتے اور پھر مسلسل طور ان کے ذہن سے اشعار تخلیق ہوتے تھے۔عزیز ملک صاحب یوں رقم طراز ہیں:

''گرامی پر ہمیشہ استغراق کی سی کیفت طاری رہتی ،جیسے نشے میں ہوں ۔ بجھے ہوئے حقے کو منھ سے لگی رہتی اور دماغ فکر سخن میں ہوتا،عقیدت مند شاگرد اور احباب محفل میں بیٹھے ہوتے ،لیکن مولانا کو سوااور ماسوا کی مطلق خبر نہیں ہوتی ۔ایسے میں کوئی مخاطب نہیں کر لیتا تو عالم بلا سے یوں پلٹتے جیسے خواب گراں سے جو نکے ہیں۔''[۴]

(ملک الشعرا گرامی جاندھری،ص۱۴)

گرامؔی جالندھری کی عادت تھی کہ رات کے آخر میں بیدار ہو جاتے اور فکر سخن میں مصروف ہو جاتے ۔ان کی طبیعت بہت رواں تھی۔ شعر پر شعر انکے ذہن میں آتے اور اپنی لڑکی کو لکھواتے تھے۔شعروشاعری کے سوا اُن کا کوئی کام نہ تھا۔شعر گوئی پر ہی آپ کی زندگی کا دارمدار تھا آپ کی عمل زندگی میں بھی شعر گوئی کو کافی دخل تھا۔اس کا انداز اس بات سے کیا جاتا ہے کہ منشی فاضل کے امتحان میں چند سوالوں کے پورے کے پورے جواب شعر میں ہی دئے ۔اسی طرح بعد میں ایک مقدمے میں اپنا جواب دعویٰ فارسی نظم میں پیش کیا۔عبدالمجید سالک نے علامہ اقبالؔ کی رائے کو گرامؔی جالندھری کے بارے میں اس طرح بیان کیا ہے:

''گرامی شعر میں تلمیز روح الامین ہے اور باقی معاملات میں چغد۔ابوالاثر حفیظ جالندھری فرماتے ہیں فنا فی اللہ لوگ شائد بہت ہونگے لیکن فنا فی الاشعر جسے کہنا چاہئے وہ میری دانست میں گرامؔی جالندھری ہی تھے۔''[۵]

(مخزن،شمارہ گرامؔی جالندھری،اگست ۱۹۲۷ء،ص۱۵)

غلام قادر گرامؔی جالندھری کے نزدیک عشق ایک ازلی جذبہ ہے۔کائنات کی تخلیق کے ساتھ ہی عشق کی تخلیق بھی ہوئی۔انسان نے اس دنیائی رنگ و بو میں قدم رکھا تو عشق کا تصور بھی اُسے وراثت میں ملا۔لفظ عشق کی مختلف تاویلات ازل سے ہی کی جارہی ہے اور ابد تک کی جاتی رہے گی۔انسان اپنے نقطہ آغاز سے ہی اس جذبہ کی اصل کو سمجھنے کی کوشش میں مصروف نظر آتا ہے۔دنیا بھر کی ادبیاتِ عشق کے موضوع پر لکھی گئی نگارشات سے بھری ہوئی ہیں۔بالخصوص شاعری کا یہ

محبوب ترین موضوع پُر شاہکار تصنیفات میں لکھا گیا ہے۔ فارسی ادب بالخصوص فارسی شاعری اسی موضوع کی بہت مرہون منت ہے۔ شاعروں نے ابتدا ہی سے اس کی تشریح کی طرف توجہ دی ہے۔ صوفی شعرا کے ہاں تو یہ لفظ کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ مولانا گرامی جالندھری اور ان کے کئی معاصرین ہم مشرب عشق کو زندگی کی قوت محرکہ خیال کرتے ہیں۔ جس کے ذریعے زندگی ذوق تخلیق اور لذت ارتقاء سے بہرہ ور ہوتی ہے۔ عشق کی ولولہ انگیز رہنمائی میں انسان زندگی کے ارفع نصب العین یعنی مبدا اصلی تک رسائی میں کامیاب ہوتا ہے۔ بعد میں آنے والے تمام فارسی شعرا نے بغیر کسی تمیز و امتیاز کے عشق کو اپنا موضوع سخن بنایا اور ہر ایک نے اس لفظ سے جو مفہوم، معنی مراد لیا وہ خالصتاً اس کے نجی مشاہدات اور قلبی احساسات سے اخذ کئے گئے ہیں۔ ہر ایک نے اپنی واردات ہی کو عشق کا نام دیا۔ ہر ایک کے ہاں یہ نئی صورت میں جلوہ آرا ہے۔ اسی لئے کئی شاعروں کے عشق کا مفہوم متعین کرنے کے لئے اسے شاعروں کی جملہ شاعری کے سیاق وسباق میں دیکھنا چاہیے ۔ گرامی جاندھری کے درجہ ذیل اشعار کو ملاحظہ فرمائیں:

وفا دشمن رہ عاشق نوازی برنمی گیرد ہر دو رفیق در ازل ہر دو شفیق در عمل
چہ برگیرم کہ آہ آتشینم برنمی گیرد عشق وفا خمیر ما عقل ادب سرشت ما[۶]

(ملک الشعرا گرامی جالندھری، ص۳۲، طارق کفایت)

گرامی جالندھری کا عشق جس نمایاں صفت سے متصف نظر آتا ہے وہ ہے وفاداری اور خلوص۔ آپ سے ایسا ہی دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ کیونکہ وفاداری خود شاعر کا ذاتی مسلک بھی ہے۔ وفا نا آشنا شخص کبھی عاشق ہو ہی نہیں سکتا۔ شاعر کی نظر میں عشق و عاشقی کی دنیا سب سے الگ ہوتی ہے، جہاں موت زندگی دکھائی دیتی ہے اور نا اُمیدی اُمید بن جاتی ہے۔ اول تو یہ کہ موت وحیات اور امید و یاس کا امتیاز ہی عشاق کے لئے باقی نہیں رہ جاتا۔ اگر اُمید کا شعور و احساس باقی بھی ہو تو نا اُمیدی کی کیفیت اس قدر شدید ہوتی ہے کہ وہی امید بن جاتی ہے۔ اسی طرح انتہائی مصائب کے عالم میں عاشق کا آخری سہارا موت ہی رہ جاتا ہے۔ وہ زندگی سے بڑھ کر موت کی تمنا کرتا ہے۔ مثلاً:

''شہر عشق را نازم طرفہ دارد آئینہ شو
مدعا ست نومیدی مرگ زندگانی ہاست
شہر عشق ا ست ز نو میدی و ا میدمگو
رہ عشق است امید از زمین یاس می روئید
دریں صحرِ ادل ہر زرہ یوسف بچہ دارد''[۷]

(دیوان گرامی، ص۱۷۷)

بیشتر اشخاص جو دنیا داری میں نہایت تجربہ کار ہوتے ہیں،لیکن وہ عشق کے معاملات میں انجان ہوتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کوقدرت نے وہ دل ہی نہیں، جوعشق میں مبتلا ہونے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہو

''رموز عشق گرامیؔ جالندھری ماچہ می داند

چہ پختگان کہ دریں راہ خام کار انند'' ۸

(ملک الشعرا گرامیؔ جالندھری،ص ٦٦)

بہرحال گرامیؔ جالندھری فارسی کے ایک مستند شاعر گذرئے ہیں۔ان کی شاعری سے مولانا رومی کی قادرالکلامی ،کہنہ مشقی اور پختہ گوئی ظاہر ہوتی ہے۔ان کو الفاظ پر حیرت انگیز قابو حاصل ہے۔شاعر نے اپنے اخلاقی شاعری کے ذریعے انسانیت کو پستی سے نکالنے کی بے حد کوشش کی تھی۔ ملک الشعرا گرامیؔ ہندوستان میں فارسی شاعری کے عظمتِ رفتہ کے یادگار تھے۔لیکن اس قابلِ احترام شاعر کو داد و رس نہیں دی گئی جس کے وہ مستحق تھے کیوں کی اس وقت فارسی کا بول بالا بہت کم ہو چکا تھا۔گرامیؔ کے شعری کارناموں پر پردہ پڑ گیا اورآپ کے حصے میں اس شہرت ونمود کا عشر وعشیر بھی نہیں آیا۔گرامی کوتخلیقی جوہر پروازِ تخیل فنی دسترس فکری میلانات اور شعری نظریات پر بہت قابو تھا۔بیسویں صدی کے اس معروف فارسی شاعر نے پنجاب کی تعریف وتوصیف یوں بیان کی ہے:

''برآمد لفظ پنجاب اززبانم

زبان شُد موج کوثر دردھانم'' ۹

(اردو فارسی اور پنجاب،ص ۵۴)

حوالہ جات

۱۔ دیوان گرامیؔ جالندھری،مولانا غلام قادر، گیلانی پرس لاہور۔

۲۔ ملک الشعرا گرامی جاندھری، ڈاکٹر طارق کفایت،امروز کتب مالیرکوٹلہ ،۱۹۸۷۔

۳۔ چند ہم عصر،مولوی عبدالحق،اردو اکیڈیمی سندھ، کراچی۔

۴۔ ملک الشعرا گرامی جاندھری، ڈاکٹر طارق کفایت،امروز کتب مالیرکوٹلہ ،۱۹۸۷۔

۵۔ مخزن،شمارہ گرامیؔ جالندھری، لاہور،اگست ۱۹۲۷۔

۶۔ ملک الشعرا گرامی جاندھری، ڈاکٹر طارق کفایت،امروز کتب مالیرکوٹلہ ،۱۹۸۷۔

۷۔ دیوان گرامیؔ جالندھری،مولانا غلام قادر، گیلانی پرس لاہور۔

۸۔ ملک الشعرا گرامی جاندھری، ڈاکٹر طارق کفایت،امروز کتب مالیرکوٹلہ ،۱۹۸۷۔

۹۔ اردو فارسی اور پنجاب، ڈاکٹر محمد جمیل، روشان پرنٹرس دہلی، ۲۰۱۷۔

عمران عاکف خان
ریسرچ اسکالر جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

ایران میں اردو: تاریخ، تدریس، فروغ

ابتدائیہ

ہندو پاک سے باہر اردو زبان کا جہاں جہاں چرچا ہے نیز اس نے جن مقامات پر اپنی جگہ بنائی یا بنانے کے لیے کوشاں ہے، ان میں اسلامی جمہوریۂ ایران بھی خصوصی اہمیت اور تذکرے کا حامل ہے۔ اسلامی جمہوریۂ ایران، جسے عرف عام میں ''ایران'' کہا جاتا ہے، [سنسکرت میں اسے آریاؤں کی سرزمین کہا گیا ہے] اردو زبان وادب کی گونئ اور نصف صدی سے بھی کم تاریخ رکھتا ہے، تاہم اس کے مضبوط اور غیور ارادوں کے باعث ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اردو زبان وادب سے اس کے رشتے قدیمی اور گہرے ہیں اسی طرح وہاں کے باشندے اس کے تئیں سچی طلب اور مثبت سوچ وفکر رکھتے ہیں۔ یہ کہنا سیاسی اور ملک گیری کی حد تک تو درست ہوسکتا ہے کہ ایران کا اردو زبان وادب کے تئیں سنجیدگی اور فکرمندی اختیار کرنا، اس احسان اور عنایت کا بدلہ ہے جسے صدہا برس تک برصغیر، فارسی زبان وادب کو اپنی سرکاری، عدالتی اور کاروباری زبان بنا کر کرتا رہا ہے، لیکن علمی اور فکری طور پر یہ ماننا درست نہیں ہے۔ اس مقام پر تو یہی کہا جاسکتا ہے کہ اردو زبان وادب کی ذاتی کشش اور اس کی اندرونی خوبی ہی ایسی ہے جو عظیم الشان تہذیب وتمدن، شیراز واصفہان جیسے شہر، رستم وسہراب اور جمشید جیسے شجاع، ان کی شجاعتوں کی کہانیاں اور معرکۃ الآرا زبان وبیان رکھنے والی اقوام کو بھی اپنا گرویدہ بنا رہی ہے۔ چنانچہ ایران کشاں کشاں اردو زبان وادب کا گہوارا اور مسکن بنتا جارہا ہے۔ اردو زبان کی یہ خوش بختی ہے کہ یہ عربی اور فارسی سے، رسم الخط، تراکیب الفاظ، بحور واوزان اور مذہبی، معاشرتی وسماجی میلان رکھتی ہے، بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ عربی، فارسی اور اردو مسلمانوں کی مذہبی، ملکی اور قومی زبانوں کی ''اقانیم ثلاثہ'' تصور کی جاتی ہیں اور ان تینوں زبانوں کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔

فصل

ایران میں اردو زبان وادب کے آغاز کا اگر تاریخ کے پروں پر چل کر سراغ لگایا جائے تو پتا چلتا ہے کہ ایران میں اردو زبان وادب کے سب سے پہلے شناور اور پناہ دار سید محمد تقی فخر داعی گیلانی تھے جو 1905 میں ہندوستان آئے۔ یہ سفر انھوں نے اپنے استاذ ملاّ محمد کاظم خراسانی [رحمۃ اللہ علیہ] کے حکم پر کیا تھا۔ وہ تقریباً 15 برس ہندوستان میں مقیم رہے

۔سب سے پہلے وہ اندور کالج میں عربی و فارسی کے استاد مقرر ہوئے، بعد ازاں انھیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بحیثیت استاد فارسی، عربی اور فلسفہ مدعو کیا گیا۔ دوران قیام علی گڑھ میں انھوں نے علامہ شبلی نعمانی کی ''شعر العجم''۔ ''الکلام''۔''سوانح مولانا روم'' اور'' کتب خانہ اسکندریہ'' کے علاوہ ''تاریخ ہندوستان'' اور سرسید احمد خاں ''تفسیر القران '' کی وغیرہ جیسی اہم اور عظیم الشان کتابوں کو فارسی کا ترجماتی پیرہن عطا کیا۔اس کے بعد جب وہ ایران واپس آئے تو انھوں نے وہاں اردو زبان کی بنیاد رکھی۔

داعی گیلانی کے بعد ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید عرفانی کا نام اس سلسلے میں اہمیت کا حامل ہے۔عرفانی تشکیل پاکستان کے بعد ثقافتی اتاشی برائے پاکستان، ایران متعین ہوئے۔ وہ وہاں ادبی محافل میں اردو زبان کو متعارف کراتے اور اقبال کے فارسی اور اردو کلام کی توضیح وتفسیر کرتے تھے۔ایران کلاس طبقہ عرفانی کی ان خدمات کا آج بھی معترف ہے اور انھیں محسن ایران گردانتا ہے۔

ایران میں اردو کی تدریس، آغاز وارتقا، موجودہ منظر نامہ:

مذکورہ بالا چیدہ چیدہ کوششوں کے بعد جب ایران میں باضابطہ طور پر اردو زبان وادب کے درس وتدریس کا جائزہ لیا جاتا ہے تو یہ چشم کشا حقائق ہمارے سامنے آتے ہیں کہ ایران میں اردو زبان کی سرکاری سطح پر تعلیم کی شروعات لگ بھگ 1954 میں ہوجاتی ہے۔اس دور میں تہران یونیورسٹی کے شعبہ زبان وادب میں شوق رکھنے والوں کے لیے صرف چند یونٹس میں اردو زبان سکھائی جاتی تھی۔ پھر اس شوق کے دن بدن روز افزوں ہونے اور طلبا وشائقین کی تعداد میں اضافے کے پیش نظر 1969 میں تہران یونیورسٹی میں غیر ملکی زبان اور ادب کا مستقل شعبہ قائم کیا گیا اور 1988 میں اس شعبے کو کالج کے طور پر تسلیم کرلیا گیا۔حالیہ دنوں اس کالج کو یونیورسٹی میں ضم کردیا گیا ہے اور اس کا ''دانش کدہ زبانہائے خارجی'' رکھا گیا ہے۔اپنے اس نئے نام کے ساتھ یہ ادارہ دیگر غیر ملکی زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو زبان وادب کی تدریس اور فروغ میں مصروف عمل ہے۔

یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ انقلاب ایران 1979 کے بعد جب ایران کی جمہوری حکومت دنیا بھر میں اپنے ہم خیال، ہم مذہب اور ہم فکر وتہذیب ممالک سے خیر سگالی اور برادرانہ تعلقات استوار کررہی تھی، ان دنوں جب باہمی بین المملکی دوستیوں اور وفاداریوں کے اصول و ضابطے مرتب ہورہے تھے نیز جانبین سے ان پر وعدے قسمیں ہورہی تھیں۔اس مشن اور فکر کا نام ''اکنامک کو۔آپریشن آرگنائزیشن'' کا نام دیا گیا تھا، جسے عرف عام میں ECO[ایکو] کہا جاتا ہے۔جس کے بڑے حصے دار ایران، پاکستان اور ترکی تھے۔ای سی او کے تحت، ثقافتی شعبہ بھی زیر غور لایا گیا۔اسی دوران ایران میں اردو اور اردو کے تئیں محبت، چاہت اور لگاؤ کا سلسلہ ایسا دراز ہوا کہ ایران، پاکستان اور ترکی ں کے

درمیان جہاں دیگر معاشی، اقتصادی، دفاعی، خارجی اور داخلی معاملات وامور متعین ہوئے، وہیں ایران میں اردو زبان، ادب، ثقافت اور تہذیب کے فروغ کے لیے بھی ای سی او کے کلچرل ونگ کے تحت ایک معاہدہ کیا گیا جس کی رُو سے دونوں ملکوں کے درمیان یہ قرارداد پاس ہوئی کہ بی۔اے آنرز کی سطح پر استنبول یونیورسٹی، ترکی اور یونیورسٹی آف تہران، ایران میں اردو زبان اور ادب کا شعبہ قائم کیا جائے۔ چنانچہ ایران میں 91-1990 سے اردو زبان کی سرکاری سطح پر تعلیم شروع ہوئی۔ اس شعبے کے اولین اساتذہ میں ڈاکٹر نور محمد خان مہر، ڈاکٹر شاہد چوہدری اور ڈاکٹر شہریار باحیدر نقوی کا شمار ہوتا ہے جن کی ان تھک اور مصمم کوششوں سے اردو زبان ایک الگ نصاب کے طور پر ''غیر ملکی زبانوں کے کالج'' میں داخل ہوئی اور اسی طرح بی۔اے کورس کا آغاز ہوا۔ پروفیسر نور محمد خان، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز [NUML] اسلام آباد، پاکستان سے مدعو کیے گئے تھے، موصوف نے ماہرین تعلیم وتدریس کی ایک مؤقر ٹیم کے ساتھ اردو زبان اور ادب کا مطلوبہ نصاب مرتب کیا۔

ڈاکٹر نور محمد خان کی پاکستان واپسی پر، ڈاکٹر محمد سلیم اختر، جو کہ فارسی اور تاریخ کے استاد تھے، بطور وزیٹنگ پروفیسر تہران یونیورسٹی کے شعبۂ اردو پہنچے اور پانچ سال تک اپنی خدمات انجام دیتے رہے۔

اس کے بعد تو یونیورسٹی آف تہران کے شعبۂ اردو میں اردو اسکالرز اور اساتذہ کی آمد کا سلسلہ جاری رہا جنھوں نے وقتاً فوقتاً اور موقع موقع پر اس شعبے کی شان ورونق میں اضافہ کیا۔ اُن اردو نوازوں میں شاہد چوہدری کا بھی شمار ہوتا ہے۔ وہ دو سال تک بطور استاد اردو زبان وادب کے شعبے سے منسلک رہے۔ اس سے قبل انھوں نے تہران یونیورسٹی سے فارسی زبان اور ادب میں پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ان کی دو اہم کتابیں ''فرھنگ واژھائ فارسی در زبان اردو'' اور ''دستور کامل وآموزش زبان اردو برائے فارسی زبانان'' قابل ذکر ہیں۔

ماقبل مذکور استاد شہریار باحیدر نقوی کچھ عرصہ اصفہان یونیورسٹی سے وابستہ رہیں۔ اس دوران بہت اہم کتابیں اور علمی وتحقیقی مقالات لکھے جو ایرانی اور پاکستانی جرائد ورسائل میں شائع ہوئے۔ ان کا ایک بڑا کارنامہ ''اردو۔ فارسی لغت'' کی ترتیب ہے۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ انھوں نے اپنا ذاتی کتب خانہ، جو اردو زبان کی منتخب ادبی اور علمی کتابوں پر مشتمل تھا، تہران یونیورسٹی کے غیر ملکی زبانوں کے کتب خانے کو بطور تحفہ دیا تھا۔

جنوری 2004 میں معروف ادیب، ماہر استاد اور ممتاز دانشور پروفیسر ڈاکٹر تحسین فراقی اورینٹل کالج، لاہور سے اردو چیئر اور ''مطالعہ پاکستان'' کے استاد کے طور پر اردو شعبے میں تشریف لائے۔ انھوں نے تین سال تک مسلسل درس وتدریس کے ساتھ ساتھ، مختلف پبلشرز سے کتابیں، جریدے اور اخبارات خرید کر شعبے کے متعلقہ کتب خانے کے علمی وادبی سرمائے میں خاصا اضافہ کیا۔

اس وقت تو ایران میں اردو زبان و ادب کی باد بہاری چلنے لگی جب نومبر 2012 میں 'ECO' کے ثقافتی شعبے کے سربراہ کی حیثیت سے 'ستارۂ امتیاز' ڈاکٹر افتخار حسین عارف [افتخار عارف] کو تہران مدعو کیا گیا۔ آپ نے اپنی کوششوں اور کاوشوں کو سمت و رفتار دینے کے لیے 'حلقۂ احباب اردو، تہران' کی بنیاد ڈالی۔ حلقے کے زیر اہتمام/انتظام نہ صرف وہاں ہندو پاک کے طرز پر مشاعروں اور ادبی انجمنوں کی داغ بیل ڈالی بلکہ عرصے تک ان کے روح رواں کے طور پر خدمات انجام دیتے رہے۔ ایک وقت تو ایسا آیا کہ ایران کی ادبی و شعری نشستیں اور ڈاکٹر افتخار عارف لازم و ملزوم بن گئے، یعنی جہاں کہیں ان نشستوں کے انعقاد کا اعلان ہوتا، وہاں موصوف کی حاضر لازمی جز ٹھیرتی۔

ڈاکٹر افتخار عارف نے محض یہی نہیں کہ دیار فارسی میں اُردو رواج کی بنیادوں کو مضبوط کیا بلکہ دیار اُردو میں فارسی زبان و ادب کی تدریس و تعلیم پر بھی زور دیا۔ اس طرح وہ جہان اردو و فارسی کے مابین ایک پُل بن گئے۔ اس طرح سے وہ اُن گزرگاہوں کے سفیروں اور راہیوں کے رہ نما بھی بن گئے۔ ایران و پاکستان اور اردو و فارسی کو اس جوہر ثمین پر بجا طور پر فخر ہے۔ اب یہ نیّر تاباں پاکستان آ چکا ہے تاہم اس کی نورانی کرنیں ایران کے طول و عرض میں اپنی روشنی بکھیر رہی ہیں۔

2008، ایسا برس ہے جس میں تہران یونیورسٹی میں اردو تعلیم اور کورس میں اضافہ کرتے ہوئے ایم اے کی تعلیم کا بھی آغاز کر دیا گیا۔ اس کا سہرا ڈاکٹر کیومرثی سابق صدر شعبۂ اردو یونیورسٹی آف تہران کے سر جاتا ہے۔ آپ ایران نژاد اور جی سی یونیورسٹی، لاہور کے فاضل ہیں، آپ نے وزارت تعلیم، حکومت ایران سے اس کے لیے باضابطہ طور پر لائسنس حاصل کیا۔ ایم۔اے کورس میں دیگر شرائط داخلہ کے ساتھ ساتھ انٹرس امتحان کا ضابطے کا تعین بھی ڈاکٹر کیومرثی کی جدت طرازی ہے۔ جس سے محنت اور میرٹ کا توازن برقرار رہتا ہے۔

موجودہ وقت میں بی۔اے آنرز، بی اے پروگرام، ٹرانسلیشن اور ایم۔اے جیسے اہم ترین کورسز کے ساتھ شعبۂ اردو یونیورسٹی آف تہران کامیابی کی منزلوں کی جانب رواں دواں ہے۔ موجودہ وقت میں مذکورہ شعبے میں ڈاکٹر کیومرثی [صدر شعبہ] کے علاوہ ڈاکٹر علی بیات [سابق صدر شعبہ] ڈاکٹری علی کاوسی نژاد، ڈاکٹر زیب النسا علی خاں، ڈاکٹر وفا یزدان منش، ڈاکٹر فرزانہ اعظم لطفی اور ڈاکٹر راشد عباس نقوی اپنی ہمہ وقتی، گوناگوں اور مختلف الجہات کوششوں سے شعبے کی بقا اور فروغ اردو کی پاسبانی و آبیاری میں مصروف ہیں۔

بلاگر فاضل کا وہ بیان ایران میں اردو زبان و ادب اور تدریس کے حوالے سے خاصا اہمیت کا حامل ہے جو ان کے سفرنامۂ ایران کی سطور میں درج ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> **دانش گاہ تہران، ایران کی سب سے پہلی یونیورسٹی ہے۔ مجھے اس بات کا علم نہیں تھا کہ اس میں اردو کا شعبہ بھی ہے۔ اس وقت اس بارے میں معلوم ہوا، جب اردو محفل میں، یونس عارف**

صاحب سے آشنائی ہوئی۔ یونس عارف صاحب، ہمدان کے رہنے والے ہیں، اور علامہ اقبال سے متاثر ہوکر، اردو ادب میں بیچلرز کر رہے ہیں۔ اردو محفل کی برکت سے مجھے تہران یونیورسٹی کے اردو ڈیپارٹمنٹ جانے کا موقع ملا، جس کی روداد یہاں لکھ رہا ہوں۔

خیر، ہم دانش کدہ زبانہائے خارجی میں داخل ہوئے اور عارف صاحب کے ساتھ ان کی کلاس میں جا بیٹھے۔ ڈاکٹر بیات لیکچر دے رہے تھے۔ موضوع، غالب کے شعری ادوار، تھا۔ لیکچر اردو میں دے رہے تھے۔ ڈاکٹر بیات صاحب نے دو یا تین برس پہلے، پنجاب یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی ہے۔ روانی سے فارسی لہجے میں اردو بولتے ہیں۔ ان کی چند کتابیں اور تراجم شائع ہو چکے ہیں۔ انھوں نے ہماری عزت افزائی فرمائی اور کلاس میں بیٹھنے کی اجازت دی۔ کلاس میں ہم دونوں کے علاوہ تقریباً تیرہ طلبہ تھے۔ جن میں سے صرف دو لڑکے تھے۔

کلاس کے بعد ہم کتابخانہ دیکھنے گئے۔ یہاں کتابخانے میں داخلہ منع ہے۔ اگر کسی کو کوئی کتاب پڑھنی ہے، تو فہرست میں سے اس کا نمبر بتا کر کتاب حاصل کر سکتا ہے۔ عارف صاحب نے کتابخانہ دار سے بات کی اور انھوں نے ہمیں اندر جانے کی اجازت دے دی۔ کتابخانے میں مختلف زبانون میں کتابیں موجود ہیں۔ اردو شعبہ تقریباً اٹھارہ سال پہلے یہاں شروع ہوا ہے۔ لیکن اس کے باوجود، میرے اندازے سے کم اردو کتابیں یہاں موجود ہیں۔ لیکن کتابیں اچھی اور مفید ہیں۔

سال گزشتہ یعنی 2018 میں جی سی یونیورسٹی آف لاہور اور یونیورسٹی آف تہران کے مابین ایک معاہدہ طے پایا جس کی خبر پاکستان کے معروف جریدے ''اردو پوائنٹ'' نے اس طرح نشر کی:

لاہور، 23 فروری 2018۔ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی آف لاہور اور یونیورسٹی آف تہران، ایران کے مابین تحقیقی و تدریسی معاہدہ، وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر حسن امیر شاہ اور ایرانی یونیورسٹی کے صدر شعبہ اردو ڈاکٹر کیومرثی نے معاہدے پر دستخط کیے جبکہ اس موقع پر ڈین آف لینگویج پروفیسر ڈاکٹر اقبال شاہد، صدر شعبہ اردو ڈاکٹر خالد محمود سنجرانی، رجسٹرار صبور احمد خان، نامور شاعر ڈاکٹر تبسم کاشمیری بھی موجود تھے۔

تحقیقی معاہدے کے تحت دونوں جامعات کے شعبہ جات علمی، ادبی اور تحقیقی امور میں ایک

دوسرے کی معاونت کریں گے، باہمی تعاون کی بنیاد پر دونوں شعبوں کے طلبہ وطالبات اور اساتذہ ایک دوسرے کے علمی وادبی سرمائے سے فائدہ حاصل کریں گے۔

شعبۂ اردو، یونیورسٹی آف تہران کے طلبا دوران درس مطالعہ پاکستان اور نصاب پاکستان پڑھتے ہیں۔اسی کے ساتھ ساتھ اساتذہ کی نگرانی میں مشاہیر اردو پر مقالات بھی تحریر کرتے ہیں۔ مقالات میں تحقیق، تنقید، فکشن، اردو نثر و نظم اور سوانح وغیرہ پر مضامین قلم بند کرتے ہیں۔

I ایران میں غیر تدریسی طور پر اردو کا فروغ [انجمن، اداروں اور مجالس کے حوالے سے]

تدریسی اور شعبہ جاتی طور پر فروغ اردو کے علاوہ ایران بالخصوص دارالحکومت تہران میں ایسے ادارے اور مجلسیں قائم ہیں جو ہمہ وقت فروغ اردو کے لیے کوشاں اور مصروف عمل ہیں۔ بسا اوقات وہ اپنے ہفتہ وار یا ماہانہ پروگرامس پاکستان کے اردو اداروں کے اشتراک سے منعقد کرتی ہیں۔ان پروگرامس میں عوامی طبقے سے لے خواص اور اساتذہ وطلبا کثرت سے شرکت کرتے ہیں۔ان کی سرگرمیوں نے ایران میں اردو کو بقا اور اعتبار بخشا ہے۔ان میں سے قابل ذکر یہ ہیں:

- حلقۂ احباب اردو، تہران

21 جنوری 2016 کو ایران میں حلقۂ احباب اردو، کا قیام عمل میں آیا۔جس کی اطلاع ایران کی معروف نیوز ایجنسی ''الوقت'' کے شعبۂ اردو کی رپورٹ سے ملتی ہے۔رپورٹ میں درج ہے:

> **ایران کے دارالحکومت تہران میں ''حلقۂ احباب اردو، تہران'' نے اپنی پہلی نشست کا انعقاد کیا۔اس نشست کا موضوع ''اردو ادب میں نعت کا مقام'' تھا۔نشست کا آغاز ڈاکٹر درانی کی تلاوت قرآن مجید سے ہوا اور اس کے بعد نعت پڑھی گئی۔نعت کے بعد تہران یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی استاد محترمہ ڈاکٹر وفا یزدان منش نے منتخب موضوع پر عمدہ اور علمی مقالہ پڑھا۔ نشست میں پاکستان کے معروف شاعر اور ای سی او کے ثقافتی شعبے کے سربراہ افتخار حسین عارف، تہران بلدیہ کے ایک اعلی عہدیدار ڈاکٹر سید عبداللہ حسینی نے مذکورہ موضوع پر مفید اور معلوماتی تقریریں کیں۔اس سے پہلے تہران یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر جناب ڈاکٹر علی بیات نے ''حلقۂ احباب اردو، تہران'' کے قیام اور اس کی مجلس عاملہ کے اراکین کے ناموں کا اعلان کیا۔ اعلان کے مطابق پروفیسر افتخار حسین عارف ''حلقۂ احباب اردو، تہران'' کے سرپرست ہوں گے اور ڈاکٹر علی بیات صدر ہوں گے۔اس انجمن کے تین نائب**

صدور ڈاکٹر محمد کیومرثی ڈاکٹر محمد حسین تسبیحی اور سید مصطفیٰ زیدی ہوں گے جبکہ ڈاکٹر راشد نقوی کو جنرل سکریٹری کے عہدے کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر وفا یزدان منش معاون جنرل سکریٹری، ڈاکٹر فرزانہ اعظم لطفی سکریٹری نشر واشاعت، ڈاکٹر معصومہ غلامی معاون سکریٹری نشر واشاعت اور ڈاکٹر علی کاوسی نژاد کو کوآرڈینیٹر چنا گیا ہے۔ اس نشست میں اعلان کیا گیا کہ حلقۂ احباب اردو کی طرف سے اردو ادب سے متعلق موضوع پر ماہانہ نشست کا اہتمام کیا جائے گا۔ اس نشست میں ریڈیو تہران کی اردو سروس سے وابستہ براڈ کاسٹر ہاشم علی مغموم نے ''حلقۂ احباب اردو، تہران'' کے قیام کی مناسبت سے اپنی ایک نظم بھی پڑھی۔ پروگرام میں دیگر اہم شخصیات کے علاوہ ریڈیو تہران کی اردو۔ ہندی سروس کے ڈائریکٹر قمر عباس اور ریڈیو تہران کے دو سابقہ ڈائریکٹروں ساجد رضوی اور اظفر کاظمی نے بھی خصوصی شرکت کی۔ آخر میں ''حلقۂ احباب اردو، تہران'' کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر راشد نقوی نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ اس نشست میں تہران میں مقیم ہندوستانی اور پاکستانی خواتین وحضرات کے علاوہ اردو دوست ایرانی اور یونیورسٹی طلبہ بھی موجود تھے۔

- انجمن احباب اردو

یہ انجمن یونیورسٹی آف تہران کے طلبائے اردو کی جانب سے بہ نام ''انجمن احباب اردو'' رجسٹرڈ شدہ ہے۔ انجمن مخصوص ایام میں اردو ادیبوں اور شاعروں کی برسیوں پر یادگاری پروگرام منعقد کراتی ہے۔ انھیں خراج تحسین پیش کرتی ہے اور ان کی کاوشوں کو اپنے دیار میں عام کرتی ہے۔ ایسا ہی ایک پروگرام 2 مارچ 2016 کو معروف فکشن نگار انتظار حسین کی یاد میں منعقد ہوا جس کی رپورٹنگ ''الوقت'' نیوز ایجنسی نے ان الفاظ میں کی ہے:

تہران یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے زیر اہتمام ''انجمن احباب اردو'' نے انتظار حسین کی یاد میں ایک پروگرام منعقد کیا۔ اس نشست میں پہلے ڈاکٹر معصومہ غلامی نے انتظار حسین کی شخصیت اور فن پر اپنا تفصیلی مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے اپنے مقالے میں انتظار حسین کی شخصیت، فن اور سوانحی حالات پر روشنی ڈالی۔

ڈاکٹر راشد عباس نقوی نے انتظار حسین کی کالم نگاری اور ترجمہ نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی ادبی شخصیت کے ان پہلوؤں کو اچھے انداز میں اجاگر کیا۔ ڈاکٹر فرزانہ اعظم لطفی انتظار

حسین کی تصنیف ''کلیلہ ودمنہ'' کو پیش نظر رکھتے ہوئے حاضرین محفل کی خدمت میں ایک کہانی پیش کی اور انتظار حسین کے فن قصہ گوئی اور ان کے ہاں علاماتی اور استعاراتی نظام کا جائزہ پیش کیا۔

شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر محمد کیومرثی نے انتظار حسین کی افسانہ نگاری اور ان کی حلقۂ ارباب ذوق میں شمولیت کا جائزہ پیش کیا۔اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے اس ادبی نشست کا مجموعی جائزہ سامعین کی خدمت میں پیش کیا۔

اس ادبی نشست کی نظامت ڈاکٹر علی کاوی نژاد نے سرانجام دی۔ادبی نشست میں صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر علی بیات اور شعبہ اردو کے دیگر اساتذہ ڈاکٹر محمد کیومرثی، ڈاکٹر فرزانہ اعظم لطفی، ڈاکٹر وفا یزدان منش نے شرکت کی۔اس نشست میں شعبہ اردو کے طلبا اور باہر سے تشریف لائے ہوئے معزز مہمانوں نے بھی شرکت کی۔

- اردو علمی وادبی انجمن

مذکورہ انجمن اسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو یونیورسٹی آف تہران ڈاکٹر وفا یزدان منش کی سربراہی میں مصروف عمل ہے۔اس انجمن کے متعدد جلسوں اور پروگرامس میں شعبۂ اردو کے بی۔اے تا ایم۔اے کے طلبا کو شرکت کا موقع ملتا ہے۔مذکورہ طلبا اس میں مشاہیر ہندو پاک اپنے گراں قدر علمی، ادبی اور فکری مقالات پیش کرتے ہیں نیز باہمی تبادلۂ خیال کرتے ہیں۔

- اردو اسپیکنگ اسٹوڈینٹس یونین، تہران

شہر تہران میں کشاں کشاں اردو اسپیکنگ اسٹوڈینٹس یونین بھی جنم لے رہی ہے جس کے مدیر و مسئول سید ابن حسن ہیں۔یونین نے اپنا ایک شاندان اجلاس، مجلس وحدت مسلمین پاکستان کے اشتراک سے 15 جون 2018 کو ایک سے می نار بہ عنوان ''امام خمینی رہ احیاء گر مسئلہ قدس'' منعقد کیا

II ایران میں غیر تدریسی طور پر اردو کا فروغ [ریڈیو، ٹی وی اور خبر رساں ایجنسیوں/نیوز پورٹلس کے حوالے سے]

انجمنوں اور اردو مجالس کے علاوہ ایران میں فروغ اردو کے لیے جو سرکاری اور نیم سرکاری نشریاتی، اطلاعاتی و ابلاغی ادارے مصروف عمل ہیں، ان کی تفصیل اس طرح ہے:

انقلاب ایران 1979 کے بعد ایران میں سرکاری سطح پر رسالہ ''راہ اسلام'' کا آغاز ہوا جس کا مقصد اسلامی حکومت کی حقیقی شبیہ اجاگر کرنا تھا۔ ماہنامہ ''راہ اسلام کا پہلا'' شمارہ مارچ 1982 میں شائع ہوا۔ اس کے بعد تو تسلسل سے اس کی اشاعتیں ہوتی رہیں۔ ہندوستان و پاکستان کے ایرانی سفارت خانوں نے بھی اسی کے محاذ میں ''راہ اسلام'' جاری کیے جن میں مقامی مذہبی ادبا، دانشوران اور مفکرین کے مضامین جگہ پانے لگے۔ اس کے بعد جب 1990 میں حکومت ایران کے ذیلی ادارے ''سازمان تبلیغات اسلامی'' کا قیام عمل میں آیا تو اس کی ترجمانی کے لیے موسوم بہ ''التوحید'' رسالے کا اجرا عمل میں آیا۔ جس کے اردو سیکشن کا مدیر علامہ مرتضی حسین صدرالافاضل کو بنایا گیا۔ ''دی اکنامسٹ'' بھی ایران کی میگزینس میں نمایاں مقام رکھتی ہے جس کا اردو ورژن اسی نام سے شائع ہوتا ہے۔ غیر سرکاری رسائل میں، ماہنامہ پیام ہدا، مجلّہ عصر، ششماہی فکر و عمل، کیہان اردو منتقلی میگزین، تہران وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

صحافتی اور مجلّاتی ذرائع کے علاوہ ریڈیو ایران کے دو اسٹیشنوں تہران اور زاہدان سے بھی اردو نشریات پیش کی جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ جو ایرانی پرائیویٹ نیوز ایجنسیاں اپنے اردو شعبوں کے ساتھ فروغ اردو میں مصروف ہیں ان میں تسنیم نیوز ایجنسی، سحر عالمی نیٹ ورک، اسلامی جمہوریہ نیوز ایجنسی IRNA، مہر خبر رساں، اردو نگار، اردو شفقنا، مجلس وحدت مسلمین، آستان قدس رضوی گلوبل، اسلام ٹائمز اور الوقت وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہ تمام ادارے عالمی خبروں، بین الاقوامی فیصلوں، اقتصادی اور معاشی پالیسیوں، بین الملکی رابطوں اور باہمی تعاون کی اطلاعات و نشریات، فیچرس پر مبنی شوز اور ضمیمے پیش کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ عالمی، ادبی، ثقافتی، تہذیبی، لسانی اور تدریسی فیچرز بھی ان نیوز ایجنسیوں سے ہمہ وقت نشر ہوتے ہیں۔

- ایران میں قدیم ہندی شعرا کے مطالعے کا شوق:

ایران میں تدریسی اور روایتی طریقوں کے علاوہ فروغ اردو میں مصروف و معاون وہ افراد بھی ہیں جو قدیم و جدید اور ترقی پسند شعرا ہند و پاک سے متاثر ہیں اور ان کے کلام کی اصل روح کو سمجھنے کے لیے ان کی زبان، یعنی اردو سیکھنے کے بے حد مشتاق ہیں۔ اسی طرح وہاں کی حکومت نے ان شعرا ادبا اور مفکرین کی علمی و ادبی خدمات سے متاثر ہو کر ان کی یادگاریں قائم کی ہیں اور اپنے تعلیمی اداروں کے نام ان کے نام پر رکھ لیے ہیں۔ ''اقبال لاہوری انسٹی ٹیوٹ آف ہائر ایجوکیشن، مشہد'' ایک ایسا ہی ادارہ ہے۔ اس ادارے میں سوشل سائنسز اور انجینئرنگ کی تعلیم دی جاتی ہے۔

ایران کے معاشرے میں علامہ اقبال بہت مقبول اور جانی پہچانی شخصیت ہیں، بچوں، جوانوں حتیٰ کہ ٹیکسی ڈرائیور سے لے کر اعلیٰ سرکاری حکام تک تقریباً ہر شخص علامہ اقبال کے کچھ نہ کچھ فارسی کلام کو جانتا تھا۔ ایک وقت تھا جب اقبال کی شاعری جیسے زبور عجم۔ 1979 کے ایرانی انقلاب میں حصہ لینے والے بہت سے جوان لوگوں کے لیے تحریک کا ایک اہم

ذریعہ بنی ہوئی تھی۔ان دنوں لوگ پارکوں اور دوسری جگہوں پر علامہ اقبال کے خون گرما دینے والے کلام کو سننے کے لیے جمع ہوتے تھے۔اقبال کی ''اسرارخودی'' اور ''بال جبرئیل'' بھی ایرانیوں کی پسندیدہ کتابوں میں سے ہیں۔قصہ مختصر یہ کہ ایرانی عوام علامہ اقبال کے کلام سے حددرجہ متاثر ہیں۔وہ علامہ کو رومی، حافظ وسعدی شیرازی کی ردیف میں قرار دیتے ہیں اور ہمیشہ ان کے پیغام سے فیض والہام پاتے ہیں۔

ایران میں ایسے افراد بڑی تعداد میں موجود ہیں جنھوں نے اردو اس غرض سے سیکھی ہے کہ وہ میر تقی میر، مرزا غالب، علامہ محمد اقبال اور دیگر ہندو پاک کے مشاہیر شعرا کے اردو کلام اور اردو فکروں کو سمجھ سکیں۔ایسے افراد کی ایک اچھی خاصی اور قابل تحریر تعداد موجود ہے۔یہ روز افزوں تعداد مستقبل میں ایران میں اردو ادب کی ضمانت اور یقین دہانی کراتی ہے اور پاسبانان اردو زبان وادب کے لیے یک گونہ اطمینان بخش بھی ہے۔

تادم تحریر یہ تمام سرگرمیاں اسی رفتار سے جاری وساری ہیں اور سرزمین ایران میں اردو خوب پھل پھول رہی ہے، پنپ رہی ہے اور اپنے نئے زمان ومکان تلاش کررہی ہے۔اسی طرح اس کی اس مہم جوئی میں ایرانی طلبا، اساتذہ اور اردو شائقین ہمہ وقت کوشاں ہیں۔ان کی کوششوں سے بہت جلد یہ امکان متوقع ہے کہ اردو کا نصف النہار ایران میں بھی شبستانوں کو روشن کرے گا۔ابھی تو وہاں اردو مقالات لکھے جارہے ہیں، وہ دن بھی دور نہیں جب شعروسخن کی بادبہاری بھی چلے گی۔

فصل

....میری تلخ نوائی بھی گوارا کر[ہندوستان کے حوالے سے]

میں جب ایران کلچر ہاؤس واقع خیابان تلک مارگ، نئی دہلی سے فارسی کورس کررہا تھا، اس وقت ہمارے استاد آغا مہدی باقر نے ہند وایران کے کلچرل تعلقات کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ مہاتما گاندھی ایران میں نہایت ادب احترام سے دیکھے جاتے ہیں۔اقوام ایران انھیں عدم تشدد کا دیوتا مانتی ہیں۔ایران میں ان کے نام پر سڑکیں اور دیگر یادگاریں قائم ہیں۔نیز انھوں نے بتایا کہ ایران ہندوستان کو خصوصی اہمیت دیتا ہے۔وہ اسے کلچرل طور پر خارجی ملک نہیں مانتا، اسی طرح ایرانی سیاح ہندوستان آتے وقت وزارت خارجہ سے رجوع ہونے کے بجائے وزارت داخلہ سے اجازت طلب کرتے ہیں۔اس کے برخلاف پاکستان کو ایران خارجی ملک مانتا ہے اور ایرانی سیاح وزارت خارجہ سے اجازت طلب کرکے پاکستان آتے ہیں۔ممکن ہے اس بات کے سیاسی اور دیگر ذرائع سے کچھ بھی معانی اور مطالب ہوسکتے ہیں مگر میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ یہ ایران کی ہندوستان کے تئیں فراخ دلی اور علویت کا اظہار ہے۔اس کے جواب میں ہونا تو یہ چاہیے

کہ تھا کہ ہندوستان پاکستان سے پہل کرتے ہوئے وہاں اپنے اردو اساتذہ بھیجتا اور ایرانی جامعات میں اردو ،زبان،ادب اور کلچر کے فروغ کے لیے کوششیں کرتا ،مگر افسوس !وہ ایسا نہ کرسکا۔آج بھی اس کی سردمہری کا وہی عالم ہے۔حقیقت تو یہ ہے کہ پاکستان اپنی ایران دوستی اور وفاداری میں ہندوستان سے بازی لے گیا۔حالاں کہ ہند۔ایران کے تعلقات قدیم ہیں اور تاریخی وثقافتی اعتبار سے دونوں ممالک کے درمیان بہت سی قدریں مشترک ہیں۔یہ صورت حال جہاں تشویش ناک ہے وہیں لمحۂ فکریہ بھی ہے۔وہیں بہت سارے سوالات بھی کھڑے کرتی ہے۔ایسے وقت میں ایران اور ہندوستان کے لسانی،ثقافتی اور سفارتی تعلقات مزید کشمکش میں پڑ جاتے ہیں جب یہاں کے سب سے بڑے ادارے یو پی ایس سی نے فارسی زبان کو اپنے نصاب سے نکال باہر کردیا ہے۔ایران اور باشندگان ایران پھر بھی بڑے دل کے مالک ہیں،وہ ہندوستان کی جانب پھر بھی اردو نوازی اور اردو ترسیل کے حوالے سے اسی طرح دیکھ رہے ہیں جس طرح ان کا مرجع پاکستان بنا ہوا ہے۔اب یہ ذمے داری ہندوستانی حکومت اور ہندوستانی پروفیسروں کی ہے وہ کس طرح تشنگان ایران کی سیرابی کرتے ہیں۔

افادات

اردو پوائنٹ، پاکستان

اسلام ٹائمز،اردو

ایران و پاکستان کی متعدد نیوز ایجنسیوں کے شعبہ ہائے اردو

ڈاکٹر وفا یزدان منش کا خطبہ ''ایران میں اردو زبان وادب کا منظر نامہ'' اردو اکادمی، دہلی

عالمی اردو اخبار،مقتدرہ قومی زبان،راول پنڈی

فاضل کا بلاگ: نیا زمانہ نئے صبح وشام پیدا کر

شاہ وید میر
ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو
پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ (پنجاب)

سیرت نگاری کی ابتداء اور اہمیت ادب کے آئینے میں

برصغیر ہندو پاک میں سیرت نگاری کے آغاز وارتقاء اور میلادنات ورجحانات کا جائزہ لینے سے پہلے ضروری ہے کہ فن سیرت نگاری کا علمی وتاریخی جائزہ لیا جائے تا کہ ''سیرت'' کے متعین مفہوم خصوصیات اور مآخذ ومصادر کی روشنی میں برصغیر میں سیرت نگاری کی نوعیت اور قدر و قیمت کا صحیح اندازہ لگایا جاسکے۔ مسلمانوں کی دینی وعلمی روایات میں سیرت نبوی ﷺ کو ایمانی واعتقادی درجہ حاصل ہے۔ آپ ﷺ کی نبوت ورسالت پر ایمان، آپ کی اتباع واطاعت اور آپ ﷺ سے عقیدت واظہار کے بناء اسلام کا صحیح مفہوم اور پہچانِ الٰہی کا حاصل ہونا ممکن نہیں۔ رسول پاک ﷺ کی سیرت پاک قران کے بعد اسلام کے تعارف وتفہیم کا دوسرا بنیادی ذریعہ اور مصادر و مآخذ ہے۔ جس کے ذریعے انسان اسلام کے بارے میں صحیح رہنمائی حاصل کرسکتا ہے۔ اللہ جل شان نے حضور اکرم ﷺ کی سیرت پاک کو انسانوں کے لیے سب سے اچھا تقلیدی نمونہ قرار دیا ہے۔ تمدنی ارتقاء کے ساتھ سیرت کے معنی ومفہوم، وسعت وتنوع اور تحریری مواد میں اضافہ ہوتا گیا تاہم ایمان وعقائد کے اعتبار سے بھی سیرت کا دینی مرتبہ ومقام روز اول کی طرح آج بھی جز وایمان بلکہ عین ایمان ہے۔

> **'عربی لغت میں اسم ''سار'' لفظ سیرت سے لیا گیا ہے۔ (سورہ کہف) جس کے معنیٰ سنت وطریقہ ہیت اور حالات کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ پہلے پہل لفظ ''سیرت'' صرف تاریخ اور واقعہ نگاری کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ علم کلام سے اس کا کوئی واسطہ نہ تھا'**۔ (سیرت نبوی شبلی نعمانی ص ۹)

لغت میں سیرت کے معنیٰ ہیں طریقہ اور راستہ بعد میں یہ لفظ عام لوگوں کے حالات کے لئے استعمال کیا جانے لگا پھر حضورؐ کے حالات افکار اور تعلیمات کے مجموعے پر اس لفظ کا اطلاق ہوا۔ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ (۱۲۳۹ھ) نے سیرت کی تعریف یوں بیان کی ہے'' جو کچھ ہمارے صحابہؓ اور آلِ عظام کے مبارک وجود کے ساتھ اور آنجنابؐ کی پیدائش سے وفات تک واقعات پر مشتمل ہوا اِسے سیرت کہتے ہیں۔ سیرت کے ماخذ جس قدر مستند اور قابل

اعتماد ہیں تاریخ کو اس کا دسواں حصہ بھی حاصل نہیں، تاریخ کا مدار صحت مند ماخذ کے بجائے قیاس پر زیادہ ہوتا ہے۔لیکن سیرت میں قیاس کو دخل نہیں، بلکہ روایات جس طرح پہنچی انہیں من وعن ذکر کردینا سیرت نگار کا پہلا فرض ہے۔

سیرت نگاری کی ابتداء:

شروع سے ہی احکام اور سیرت نبوی سے متعلق تحریری سرمایہ موجود تھا۔مگر تصنیف وتالیف کا مذاق نہیں ہوا تھا اس لئے کافی عرصہ یہ سرمایہ تدوین وترتیب سے محروم رہا بعد میں امراء اور حکام کی وجہ سے اس کا ذوق پیدا ہوا اور اہل علم تصنیف وتالیف میں مصروف ہوئے، سب سے پہلے حضرت معاویہؓ نے عُبید بن شریح کو یمن سے بلا کر قدماء کے حالات لکھوائے اور تحریری سرمایہ کا نام ''اخبار الماضیین'' رکھا۔(بخاری شریف ج ا ص ۲۲) پھر عبدالملک بن مروان نے حضرت سعید بن جبیر سے تفسیر قرآن پاک لکھوائی۔

امراء میں علوم اسلامیہ کی تدوین ترتیب کا سہرا حضرت عمر ابن العزیز م ۱۰۱ھ کے سر ہے۔عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے پہلے علم حدیث کی تدوین ابن شہاب زہری نے کی حاجی حلیفہ صاحب ''کشف الظنون'' کی رائے ہے۔''مغازی میں سب سے پہلے امام محمد بن اسحاق ابن یسار رائیس اہل مغازی نے تصنیف فرمائی'' دور حاضر کے محقق ڈاکٹر مصطفٰے صبری کی تحقیق ہے کہ سیرت کے موضوع پر سب سے پہلے ابان ابن عثمانؓ نے قلم اٹھایا۔انہوں نے ''موقف العقل والعلم'' میں لکھا ہے سیرت نگار بہت سے ہیں ابن ہشام مقدم نہیں سیرت نگاری کا آغاز حضرت ابان ابن عثمان سے ہوا پھر عروہ بن زبیر اور شرجیل ابن سعد نے اس موضوع پر قلم اٹھایا پھر زہری نے اور زہری امام بخاری کے استاد ہیں۔سہیلی کی رائے یہ ہے کہ سیرت کے موضوع پر سب سے پہلے امام زہری نے لکھا ہے یہ پہلی سیرت کی کتاب ہے جو اسلام میں تالیف کی گئی ہے۔

> ''سیرت نگاروں کے اولین دور میں ابان بن عثمان 'عروہ بن زبیر' شرجیل ابن سعد اور وہب بن بنہ کا نام لیا جاتا ہے۔دوسرے دور میں ابوبکر بن ہضم انصاری، عاصم بن قتادہ انصاری اور ابن شہاب زہری کے نام سرفہرست ہیں، شہاب زہری اس لئے بھی اہم ہین کہ انکی ذاتی کوشش سے فن سیرت نگاری کو ترقی ملی اور علمائے میں اس کے مطالعے کا ذوق پیدا ہوا اور درس مغازی کے حلقے بھی قائم کئے۔موسیٰ ابن عقبی (م ۱۶۱ھ) اور محمد بن اسحاق ابن یسار م امام زہری کے نام ور شاگرد ہیں تدوین سیرت کا تیسرا دوران ہی دونوں بزرگوں سے شروع ہوتا ہے۔ابن اسحاق کے بعد سیرت نگاروں میں جس شخص کا نام اہم ہے وہ محمد بن عمر ابن الواقدی م ۲۰۷ھ سیرت میں انکی روایت قبول کی جاتی ہے سیرت نگاروں میں ابن اسحاق اور واقدی

ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔محمد ابن سعد واقدی کے ایسے ہی ممتاز شاگرد ہیں جیسے ابن ہشام ابن اسحاق کے ابن سعد نے الطبقات الکبریٰ تصنیف کی اس کتاب کی دو جلدیں سرکار دو عالمہ کے حالات پر مشتمل ہیں باقیہ جلدوں میں صحابہ اور تابعین کے احوال درج ہیں۔ان حضرات کے بعد عربوں میں سیرت نگاری کا ذوق پیدا ہو گیا تھا اور تالیفات کا سلسلہ شروع ہو گیا'۔(سیرت النبیؐ از شبلی نعمانی ص ۸ تا ۳۸ جلد ۱)

اردو میں سیرت نگاری کی ابتداء ترجموں سے ہوئی اس موضوع پر سب سے پہلے جو اہم کتاب فارسی سے اردو میں منتقل ہوئی وہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی م ۱۰۵۲ھ کی (مدارج النبوۃ) ہے جس کا ترجمہ خواجہ عبدل الحمید نے کیا ہے (سرورِ المحزون) کے نام سے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی م ۱۱۷۶ھ نے فارسی میں ایک مختصر رسالہ سیرت پر لکھا ہے۔جس کے کئی ترجمے اور شروح موجود ہیں،شوکت علی شاہ جہاں پوری نے (دُرِّ مکنون) کے نام سے اس کا ترجمہ کیا ہے۔۱۲۸۵ھ میں اس سے مطبع رونقِ ہند کان پور کے نام سے اس کا ترجمہ شعبۂ فارسی دارالعلوم دیوبند کے سابق صدر خلیفہ عاقل مرحوم نے کیا۔1857 کی ناکام بغاوت کے بعد سرسید نے جہاں قوم کے دوسرے شعباجات میں ترقی و بہبودی کی فکر کی وہیں اس کے مذہبی عقائد کی پاسداری کرتے ہوئے 1870ء میں سرولیم میور کی تصنیف The Life Of Mohammad کا جواب ''خطبات احمدیہ'' جیسی شہکار کتاب لکھ کر دیا یہ کتاب ''سیرت محمدیہ'' کے نام سے بھی مقبول ہے۔

اردو میں سیرت پر جتنی کتابیں لکھی گیئں ان میں ضخامت اور حُسنِ بیان کے لحاظ سے مولانا شبلی نعمانی اور سیدّ سلیمان ندوی کی مشترکہ تالیف سیرت نبی پر فوقیت لی گئی ہے،ان کے علاوہ جدید دور میں پیر کرم شاہ صاحب کی ضیاالنبیؐ جامع کتاب ہے۔مولانا ادریس کاندھلوی اور مولانا مودودیؒ کی سیرت سرورِ عالم اعلیٰ کتب میں شمار کی جاتی ہیں۔

مطالعہ سیرت کی اہمیت:

حضورؐ نے جس عالمی مشن کا مکہ سے آغاز فرمایا تھا وہ آپ کی حیات ظاہری میں ہی کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہوا،پھر کامیابی و کامرانی کا یہ عمل حضورؐ کی وفات کے بعد بھی جاری رہا۔مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں:

''قرآن حکیم نے جابجا حضرت ختم المرسلین وصاحبہ اُسوہ حسنہ عالمؐ کی حیات کو بطور ایک مستقل دلیل و شاہد ثابت پیش کیا ہے،اور نہایت کثرت کے ساتھ انکی سیرت وسوانح اور وقائع وایام پر مختلف پیرایوں اور مختلف لواحق اور روابط کے ساتھ بار بار توجہ دلائی ہے''۔(سیرت اور مطالعہ سیرت نقوش رسول نمبر ص ۱۲۰)

قاری محمد طیب (محترم دارالعلوم دیوبند) سیرت کے بنیادی اصول بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''سرکار دو عالمؐ رسولِ ثقلین کی سیرت مقدسہ اپنی ظاہری و باطنی وسعتوں اور پہنائیوں کے لحاظ سے کوئی شخص سیرت نہیں بلکہ عالمگیر اور بین الاقوامی سیرت ہے جو جہانوں کے لئے ایک مکمل دستور حیات ہے۔ جوں جوں زمانہ ترقی کرتا جائے گا اس حد تک انسانی زندگی کی استواری و ہمواری کے لئے اس سیرت کی ضرورت شدید سے شدید تر ہوتی چلی جائے گی۔ آپ کی سیرت ایک عملی قرآن ہے جو اوراق میں محفوظ ہے۔ اور عملی قرآن یعنی سیرت ہے۔ جو ذاتِ نبوی میں محفوظ ہے (نقوشِ رسولؐ نمبر جلد اول ص ۳۸) سیرت رسولؐ زندگی کے ہر شعبے میں اہمیت کی حامل ہے سیرت کی ایک سیاسی و ریاستی اہمیت ہے حضورؐ نے اپنے وطن مکہ سے ہجرت فرمانے کے بعد مدینہ کی ایک بستی میں ریاست قائم کی اور تاریخ میں پہلی بار باقاعدہ دستور ریاست تیار فرمایا پھر دس سال کے قلیل عرصہ میں جزیرہ نما عرب جنوبی فلسطین اور جنوبی اعراق تک اس ریاست کو اُس وقت دنیا کی سب سے بڑی اور مستحکم مملکت بنایا۔ سیرت کی تنظیمیں انتظامی اہمیت بھی ظاہر ہے۔ آپؐ نے جو دستور اور نظام حکمرانی مرتب فرمایا وہ آپ کے حسِ نظم کی تابندہ مثال ہے۔ آپؐ نے قیام امن کے لئے دعوتی تبلیغی اور معاہداتی پالسیاں اختیار فرمایں ان سے تمام قومیں مسخر ہو کر رہ گیئں۔ نظام مشاورت اور سفارت سے بیرونی دنیا سے روابط کئے حکما اور عُمال سلطنت کے لئے ضابطے اور احتساب کے نظام اجرار جاری کیا۔ حکومتوں سے تعلقات کے لئے خارجاہ پالسی وجود میں آئی سیرت رسول کی انسانی اور اخلاقی اہمیت ظاہر ہے اس تعلق سے آپ کی شخصیت اس قدر عظیم ہے کہ آپ کے دشمن اس چیز کے معتراف ہیں کہ حضورؐ کے انسانی و اخلاقی اقدار کے حوالہ سے حضرت حدیجہؓ کا سب سے پہلا بیان جو انہوں نے پہلی وحی کے نزول کے موقع پر ارشاد فرمایا ملا خطہ ہو۔ ''ہرگز نہیں خدا کی قسم اللہ آپ کو رسوا نہیں کرے گا آپؐ صِلہ رحمی کرتے ہیں لوگوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں ناداروں کی خبر گیری کرتے ہیں مہمان نوازی کرتے ہیں اور مصائب میں لوگوں کی مدد کرتے ہیں''۔

اسی طرح آپؐ کا کردار ایک شعری کے طور پر ایک ہمسائے کے تعلق سے ایک دوست، ایک تاجر ایک حاکم غرض ہر خیشیت سے بے داغ قابلِ تعریف اور اخلاق کی اعلیٰ قدروں سے معمور ہے۔ خدمت خلق اور حسنِ خلق میں آپ کی کوئی مثال نہ تھی۔ آپ نے تھوڑے عرصے میں پورے معاشرے کو ایک عادلانہ نظام اور اعلیٰ قدروں سے روشناس فرمایا، معاشی اعتبار سے تقسیم وگردش دولت کا خوبصورت نظام نافذ فرمایا۔ جس میں تقسیم وو راثت تحریر وصیت، حرمت سود اور حکم انفاق اور سرمایا دولت پر زکات وعشر کے محصولات کی مثالیں مذکورہ تصور کو سمجھنے کیلئے کافی ہیں، معاشرے کے غریب، مساکین، یتیم، مزدور غلام اور مستحقین کو اجتمائی دولت میں حصہّ دار بنایا۔ معاشرے کو منظّم کیا، افراد خاندان سے لے کر حاکم وریاست تک سب کے حقوق اور فرائض کا نظم واضع کیا تعلیم وخواندگی کی مہم شروع کی، تہذیب وثقافت کے فروغ کے اقدام کئے، سماجی و سیاسی اصول نافذ کئے عوام کو بنیادی انسانی حقوق عطا کئے، آزادی رائے اور اختلاف رائے کی اجازت دی گئی غیر مسلم اقلیتوں کے حقوق کو تسلیم کر کے تحفظ دیا گیا۔

اردو ادب میں سیرت نگاری:

اردو نثر کے ارتقاء میں کتب سیرت کافی تاخیر سے شامل ہوئی ہیں۔ لیکن اردو میں منظوم کتب سیرت کا آغاز گیارہویں صدی میں ہو چکا تھا۔ لیکن نثر میں سیرت نگاری کی ابتداء تیرہویں صدی سے ہوئی اور سیرت میں اسی پیش قدمی کا شرف دکن کو حاصل ہوا۔ مغلوں کے دور زوال میں دکن میں فقہ وعقائد کے ساتھ ساتھ کتب سیرت کا آغاز بھی ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں محمد باقر آگاہ، (متوفی 1220ھ / 1805ء مولانا محمد غوث) (متوفی 1238ھ/1823ء اور قاضی بدرالدولہ (متوفی 1280ھ/1863ء کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ ان بزرگوں نے تفسیر، حدیث، فقہ، سوانح اور سیرت پر کتابیں لکھنے کی طرح ڈالی۔

بہرحال حضورﷺ کی سیرت پاک ایک تاریخی داستان ہے جو ایک انسان کے پیکر میں جلوہ گرہ ہوئی وہ زندگی سے کٹے ہوے درویش کی سرگزشت نہین بلکہ ایک انسان ساز کی روداد ہے وہ اپنے اندر عالم نو کے معمار کے کارنامے پر تفصیل اپنے اندر لیے ہویے ہے سرکار دو عالم کی سیرت غار حرا سے لیے کر غار ثور تک، حرم کعبہ سے لیے کر طائف کے بازاروں تک امہات المومنین کے حجرو ں مبارک سے لیے کر میدان جنگ تک ہر طرف پھیلی ہوئی ہے

کتابیات:

۱۔ ادب اسلامی:۔ ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی

۲۔ سیرت نبوی شبلی نعمانی

۳۔ ''از نقوشِ رسول'' ندیم واجدی

۴۔ عبدالعزیز دہلوی۔ ترجمہ فارسی ۱۲۳۹ھ

۵۔سیرت نبیؐ از شبلی نعمانی جلد نمبر ا۔
۶۔سیرت اور مطالعہ سیرت نقوش رسولؐ
۷۔از نقوش رسولؐ جلد نمبر اوّ
۸۔سیرت نبوی مع سیرت نگار عین الحق

شاہد عالم
شعبۂ فارسی، جواہر لال نہرو یونیورسیٹی

مرزا غالب کی حبسیہ شاعری

'حبسیہ' ایک ایسی منظوم و منثور صنف ہے جو زندان میں نظر بندی کے دوران یا زندان سے رہائی کے بعد شاعر یا ادیب اپنے اسیری کے واقعات و حالات، غم و اندوہ، اپنی بے چارگی، دوستوں اور گھر والوں/اپنوں کی بے پروائی و عدم تعلق، قید خانے کی صعوبات، اس پر گذرنے والی ذہنی کیفیات اور اپنی ذاتی مشاہدات کو بیان کرتا ہے۔ وکی پیڈیا میں حبسیہ کی تعریف یوں ہے:

"Prison literature is a literary genre characterized by literature that is written while the author is confined in a location against his will, such as a prison, jail or house arrest.[1] The literature can be about prison, informed by it, or simply co-incidentally written while in prison. It could be a memoir, nonfiction, or fiction."

ج۔ع۔واجد نے اپنے مقالہ 'حبسیات' میں 'حبسیہ' کی تعریف یوں کیا ہے:

''ایک باقاعدہ تصنیف، منظوم یا منثور، جس میں حقیقی قید یا کسی بھی خلاف مرضی پابندی مثلاً نظر بندی کے واقعات و حالات، وہاں کی روزمرہ کی زندگی، مصنف کے ذاتی مشاہدات و تاثرات اور مصنف پر گذرنے والی ذہنی کیفیات کا واقعی بیان ہو۔''(۲)

اور دوسری جگہ یوں لکھتے ہیں:

''یہ قطعی ضروری نہیں کہ حبسیہ قید خانے میں (یا قید کے دوران) ہی لکھی جائے۔

حبسیہ قید سے رہائی کے بعد، جیل سے باہر آ کر.....بطور یادداشت.....لکھی جاسکتی ہے۔'' (۳)

اردو میں حبسیہ نگاری کا اولین سراغ خوشحال خان خٹک کی شاعری میں ملتا ہے۔ جو سترہویں صدی عیسوی میں آگرہ کے رہتمبور میں ایام زندانی کے دوران، بہت سی نظمیں اور غزلیں کہیں اور اپنی مشہور کتاب ''دستار نامہ'' لکھا۔ علاوہ ازیں مرزا غالب، بہادر شاہ ظفر، علامہ فیض الحق خیرآبادی (صورت الھند یہ، جسے عبدالشاہد خان شیروانی نے 'باغی ہندوستان' کے نام سے عربی زبان سے اردو میں ترجمہ کیا)، جعفر تھانیسری (نصائح جعفری اور کالا پانی)، محمد علی جوہر (مائی لائف: اے فریگمنٹ)، چوہدری افضل (زندگی)، ظفر علی خان (حبسیات)، حسرت موہانی (مشاہداتِ زندان)، فیض احمد فیض (صلیبیں میرے دریچے میں، دشت صبا، اور زندان نامہ)، مولانا ابوالکلام آزاد (غبارِ خاطر اور ابوالکلام کی کہانی خود ان کی زبانی)، واجد علی شاہ (خطوط)، سجاد ظہیر (نقوش زندان)، شورش کاشمیری (پس دیوار زندان، تمغہ خدمت، اور موت کی واپسی) وغیرہ نے حبسیہ لکھا۔ حبسیہ کو دوسری زبان میں ایک ادبی صنف کی حیثیت حاصل ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ اردو ادب میں اس کو کوئی صنفی حیثیت حاصل نہیں ہے۔

مرزا غالبؔ نے اپنی شاعری میں زندانی پہلو کو بحسن وخوبی پیش کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مرزا غالب چوسر اور شطرنج کھیلنے کے جرم میں دو بار جیل گئے۔ وہ پہلی بار ۱۵/اگست ۱۸۴۱ء میں جیل گئے۔ جس میں انھیں سو روپئے کا جرمانہ اور اس کی عدم ادائیگی کی صورت میں چار ماہ کی سزا مقرر کیا گیا۔ لیکن وہ سو روپیہ بطور جرمانہ دے کر رہا ہو گئے۔ اس واقعے کا ذکر ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کی کتاب ''کلاسکی ادب'' کے علاوہ اور کہیں نہیں ملتا ہے۔ (۶) غالب کی اس گرفتاری کی خبر سب سے پہلے معروف اردو اخبار ''دہلی اردو اخبار'' میں مورخہ ۱۵/اگست ۱۸۴۱ کو یوں چھپی تھی:

> سنا گیا ہے کہ ان دنوں تھانہ گذر قاسم خان میں مرزا نوشہ کے مکان سے اکثر نامی قمار باز پکڑے گئے، مثلاً ہاشم علی خان وغیرہ کے۔۔۔، کہتے ہیں، بڑا قمار ہوتا تھا لیکن باسبب رعب اور کثرت مرداں کے یا کسی طرح سے، کوئی تھانہ دار دست انداز نہیں ہوسکتا تھا۔ اب تھوڑے دن ہوئے یہ تھانہ دار قوم سے سید اور بہت جری سنا جاتا ہے، مقرر ہوا ہے۔ یہ پہلے جمعدار تھا۔ بہت مدت کا نوکر ہے۔ جمعداری میں بھی یہ بہت گرفتاری مجرموں کی کرتا رہا ہے، بہت بے طمع ہے۔ یہ مرزا نوشہ ایک شاعر نامی اور رئیس زادہ شمس الدین قاتل ولیم فریزر صاحب کے قرابت قریبہ میں سے ہے۔ یقین ہے کہ تھانیدار کے پاس بہت رئیسوں کی سعی وسفارش بھی آئی۔ لیکن اس نے دیانت کو کام فرمایا، سب کو گرفتار

کیا۔عدالت سے جرمانہ اعلیٰ قدر مراتب ہوا۔مرزا نوشہ پر سو روپے۔ادا نہ کریں تو چار مہینے قید۔۔۔۔؛(۷)

غالب، دوسری مرتبہ ۲۵ رمئی ۱۸۴۷ء/۱۲۶۴ھ میں گرفتار ہوئے۔جس میں انھیں چھ ماہ قید اور دو سو روپیہ جرمانہ مقرر ہوئی۔کہا جاتا ہے کہ غالب اور کوتوال کے درمیان تلخ کلامی ہوگئی تھی اور وہ کوتوال جس کا نام فیض الحسن خان تھا، موقع غنیمت پا کر مرزا غالب کو قمار بازی کے الزام میں گرفتار کرلیا۔اس واقعہء گرفتاری کے متعلق سب سے پہلے اطلاع معروف اخبار ''فوایدالناظرین، دہلی'' میں ملتی ہے جو غالب کی گرفتاری کے چھ روز بعد مورخہ ۳۱ رمئی ۱۸۴۷م میں اس طرح شائع ہوئی تھی:

''خبر دہلی، ۲۵ رمئی کو بیچ مکان جناب مرزا نوشہ اسداللہ خاں صاحب کے قمار بازی ہو رہی تھی، چنانچہ کوتوال خبر پا کر وہاں گئے اور جناب مرزا صاحب کو مع چند اور قمار بازوں کے گرفتار کر کے کوتوالی میں لے آئے۔اب دیکھا چاہیے کہ صاحب مجسٹریٹ ان کے متعلق کیا حکم دیتے ہیں۔'' (۸)

اور مورخہ ۲ رجولائی ۱۸۴۷م کے خبروں میں غالب کے اس مقدمے کا ذکر یوں ملتا ہے:

''مرزا اسداللہ خاں غالب پر عدالتِ فوجداری میں جو مقدمہ دایر تھا۔اس کا فیصلہ سنا دیا گیا۔مرزا صاحب کو چھ مہینے قید با مشقت اور دو سو روپیے جرمانے کی سزا ہوئی۔ اگر دو سو روپے ادا نہ کریں تو چھ ماہ قید میں اضافہ ہو جائے گا۔مقرر جرمانے کے علاوہ اگر پچاس روپے زیادہ ادا کیے جائیں تو مشقت معاف ہو جائے گی۔۔۔'' (۹)

غالب کے اس اسیری کا پس منظر، ان کے ایک معاصر گھنشام لال عاصی نے اس طرح بیان کیا ہے:

مرزا نوشہ شاعر بے بدل دہلی، رند مشرب، المتخلص بہ اسد و غالب سے فیض الحسن خان کوتوال دہلی کو ناحق عداوت پیدا ہوگئی اور اس نے بعلت قمار بازی ان کو قید کرا دیا۔جس کی مندرجہ ذیل تاریخ نکالی گئی.... بروقت گرفتاری کوتوال صاحب رتھ میں بیٹھ کر موقع پر گئے اور ظاہر کیا کہ سواریاں زنانی آئی ہیں۔اس دھکے سے اندر داخل ہو گئے اور اندر مکان کے ضربات جوتی باہم اس قدر ہوئیں کہ باہر تک آواز آتی تھی۔مگر زینہ کے اندر بہت جمعیت تھی اور کئی امدادی برقنداز پہنچ گئے۔گرفتار کر کے قید کرا دیا۔بہت سے رئیس اور شرفا اس حرکت سے ناراض ہوئے۔اور عدالت میں ساعی ہوئے مگر قید ہو ہی گئی۔

(۱۰)

علاوہ ازیں عاصی نے، غالب کے اس گرفتاری کے متعلق ایک قطعہ تاریخ کہا، جس کا ذکر بہت کم ملتا ہے۔ ان کے اس قطعہ تاریخ سے پانچ تاریخیں نکلتی ہیں۔ پہلی فصلی، دوسری سنہ عیسوی، تیسری اور چوتھی سنہ ہجری، اور پانچویں سنہ بکرمی کو ظاہر کرتی ہیں: (۱۱)

سرابجد سے فصل میں تو سب اظہار طوفاں ہے — اور اٹھارہ سو سینتالیس میں قید غریباں ہے

۱۲۵۷ فصل — ۱۸۴۷عیسوی — ۱۲۶۲ھجری

قلق غالب نہ کیونکہ موش اور گربہ کے دل پر ہو — دبی بلی کٹائی کان چوہوں سے بدنداں ہے

۱۲۶۳ھجری

رہائی روز بد سے میرزا نوشہ کی کیوں کر ہو — زغمخوار بن کرواں گیا فیض الحسن خاں ہے

۱۹۰۴ بکرمی

سر بازو پکڑ کر شحنۂ تقدیر نے عاصی؛ — اسد کو جوتیوں سے گھیر کر ڈالا بزنداں ہے

مرزا غالب کی سزا چھ ماہ بہ قید مشقت ہوئی تھی لیکن ڈاکٹر راس سول سرجن کے سفارش پر تین ماہ سزا کاٹنے کے بعد معاف کر دیئے گئے۔ جبکہ ان کی معافی کی اصل وجہ ان کی صحت کا خراب ہونا تھا۔ (۱۲) یہ واقعہ انھیں بڑا ناگوار گذرا۔ اس واقعے کا ذکر ان کے ہی فارسی مکتوب میں ملتا ہے۔ جس کا اردو ترجمہ درج ذیل ہے:

> ''کوتوال میرا دشمن اور مجسٹریٹ مجھ سے ناواقف تھا۔ فتنہ گھات میں تھا اور ستارہ گردش میں۔ باوجودیکہ مجسٹریٹ کتوال کا حاکم ہے میرے باب میں وہ کوتوال کا محکوم بن گیا اور مجھے برباد کرنے یا بے عزت وزسوا کرنے کے لیے میری قید کا حکم جاری کر دیا۔ سیشن جج باوجودیکہ میرا دوست تھا اور ہمیشہ مجھ سے دوستی ومہربانی کے برتاؤ برتتا تھا اور اکثر محفلوں میں بے تکلفانہ ملتا تھا اس نے بھی چشم پوشی (اغماض) اور تغافل اختیار کر لیا۔ صدر میں اپیل کیا گیا مگر کسی نے ایک بھی نہ سنا۔ اور وہی ظالمانہ فرمان جاری رہا۔ مجھے معلوم نہیں کہ کیا وجہ ہوئے کہ جب آدھی میعاد گذر گئی تو مجسٹریٹ کو مجھ پر رحم آیا۔ اور میری رہائی کے لیے صدرِ عدالت سے درخواست کی اور اس کی درخواست قبول کر لی گئی اور حکام صدر نے ایسی رپورٹ بھیجنے پر اس کی تعریف کی۔ سنا ہے کہ قوم کے نیک لوگوں نے مجسٹریٹ کو نفریں رملامت کی اور میری پایہ آزادی اور خاکساری سے اس کو مطلع کیا رواقف کروایا

یہاں تک کہ وہ خود بہ خود میری رہائی کا حکم صادر کیا۔اس نے عذر پیش کیا، معافی مانگی اور دل جوئی کی۔اور میں خود اس وجہ سے کہ ہر کام کو خدا کی طرف سے سمجھتا ہوں اور خدا سے لڑا نہیں جا سکتا، جو کچھ گذرا اس سے خوش، اور اس کے ننگ سے آزاد ہوں۔چوں کہ آرزو کرنا آئین عبودیت بندگی کے خلاف نہیں۔

عشق است وصد ہزار تمنا، مرا چہ جرم
گر خواہشی کند دل شیدا، مرا چہ جرم

(ترجمہ: ایک طرف عشق ہے اور دوسری طرف ہزاروں خواہشیں، تو اس میں میرا کیا جرم ہے۔اگر یہ فریفتہ دل کوئی خواہش کرتا ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے)

خواہم نپرس در جہان نباشم
وگر باشم در ہند نباشم

(ترجمہ: میں چاہتا ہوں کہ اب اس دنیا میں نہ رہوں اور اگر رہوں تو ہندوستان میں نہ رہوں)

روم ہے، مصر ہے، ایران، بغداد ہے، یہ بھی جانے دو، خود خانہ کعبہ آزادوں کی جائے پناہ اور آستانہ رحمتہ العالمین دلدادوں کی بس تکیہ گاہ ہے۔دیکھیے وہ وقت کب آئے گا کہ درماندگی کی قید سے، جو اس گذری ہوئی قید سے زیادہ جانفرسا ہے۔نجات پاؤں اور بغیر اس کے کہ کوئی منزل مقصود قرار دوں، سر بہ صحرہ نکل جاؤں۔

آنست آنچہ بر ما رفت واین است آنچہ می خواہم والسلام

(ترجمہ: یہ وہ ہے جو کچھ مجھ پر گذرا، اور یہ ہے جس کا میں آرزومند ہوں) (۱۳)

اور غالبؔ اپنے دوسرے فارسی خط بنام منشی نبی بخش حقیر اکبرآبادی سرشتہ دار فوجداری کول، میں یوں لکھتے ہیں:

گفتنی نیست کہ بر غالب ناکام چہ رفت
می توان گفت کہ این بندہ خداوند نداشت

اندیشہ گواہ است و مشاہدہ شاہد کہ کاستن از بہر آراستن است و زودون از برای نمودن۔سرد را چون بیارایند بہ پیرایند، و بادہ را تا پیماند بپالایند نی پارہ را تا بہ بریدن پارہ ازان بہ خوردگی نہ رود صورت قلم نتوان داد، آری در کارگاہ کون وفساد، ہیچ فساد بی کون وہیچ

کون بی فساد نیست۔ بسپہرم بردند و چندی ہم بران پایہ نگذاشتند ، وسپس برزمین زدندتا پیکرم چنان بخاک نقش بست کہ آن نقش بہ ہیچ کذالک از خاک نتوان ستردگوئی و درین کون وفساد کہ ناگاہ روی داد، مرابردند وخستہ را بجای من آوردند کہ مرگ از زیستن وخندہ از گریستن نشناسد۔ یارب این پیکر کہ بخاک نقش بستہ واین نقش کہ ازان پیکر بخاک نشستہ زود باشد کہ از روی خاک تہ خاک سپرند۔ درین روزگار زبندستم رستگار وبندغم گرفتار بودم۔ سخن درجادو بیان از خود رفتہ لال ہرگوپال تفتہ را بسرم گذار افتاد۔ شنیدم کہ آن لطف گستر بوطن رفتہ بودند۔ و اینک آمدہ اند، عجب آمد کہ بنامہ نیز اختند۔ ہمانا ہم نشینی وہم زبانی من با تفتہ ہم زبانی وہم نشینی با خویش شناختند وحقا کہ حنن است۔ دوش یکی از شاہزادگان تمر خانیہ بزم سخن آراستہ بود وسخن سنجان را بہ غزل خوانی خواندہ، مرا کہ بگفتن ریختہ سری نماندہ۔ اگر چہ بگفتن غزل مامور شدم و دل بداں نہ بستہ بودم، اما روزی کہ شب بدان انجمن باید رفت۔ خاصہ وقتی کہ سوارہ رہ می بریدم، بیتی چند بی خواست از دل غمزدہ سر برزد، چنان کہ بشما نیز می فرستم و می خواہم کہ درین زمین غزلی گفتہ بمن فرستند۔ (۱۴)

مندرجہ بالا خط، غالب نے اپنی رہائی کے بعد ماہ فروری ۱۸۴۸عیسویں میں لکھا تھا۔ یہ خط پنچ آہنگ اورکلیات نثر کی پہلی اشاعت ۱۸۶۸ام، میں موجود ہے۔ (۱۵)

اس حادثے سے مرزا غالب بہت دل برداشتہ ہو گئے تھے۔ کیونکہ اس واقعے سے پورے شہر وقوم وملت میں ان کی بڑی رسوائی ہوئی تھی۔ یہ واقعہ غالب کو اتنا نا گوار گذرا کہ وہ موت کی خواہش کرنے لگے یا موت کے آرزومند ہو گئے۔ اس حادثے کا ذکر تفتہ کے نام ایک خط میں یوں کرتے ہیں:

''سرکار انگریزی میں بڑا پایہ رکھتا تھا۔ رئیس زادوں میں گنا جاتا تھا۔ پورا خلعت پاتا تھا۔ اب بدنام ہو گیا ہوں اور ایک بڑا دھبہ لگ گیا۔''(۱۶)

غالب کے ہاں صرف سات بندوں پر مشتمل ایک فارسی ترکیب بند کا سراغ ملتا ہے جو ان کے آخری مجموعہ کلام ’سبد چین‘ میں موجود ہے۔ جسے حالی (یادگار غالبؔ) اور ماہرین غالب مثلاً غلام رسول مہر (غالبؔ) اور مالک رام (ذکرِ غالبؔ) وغیرہ نے اسے غالب کی عمدہ ترین نظموں اور حبسیہ میں شمار کیا ہے۔ لیکن کسی نے اس نظم کا کوئی تفصیلی جائزہ نہیں لیا۔ مرزا غالب نے اس ترکیب بند میں اپنی بے آبروئی، غم واندوہ، دوستوں کی عدم تعلقی اور دوسرے مشاہدات وکیفیات کا ذکر کیا ہے۔ حالانکہ وہ زندان میں اس طرح آرام سے رہتے تھے جس طرح اپنے گھروں میں زندگی بسر کیا کرتے تھے۔

لیکن وہ اس حادثہ کو اپنی بے آبروئی سمجھتے تھے کیوں کہ عزت ہی ہر ممتاز شخص کی سب سے قیمتی سرمایہ ہوتی ہے۔ ذرا سی بے آبروئی اس کی شخصیت اور انانیت کو اندر سے بالکل تباہ و برباد کر دیتی ہے اور وہ شخص گھُٹ گھُٹ کر جینے لگتا ہے حتیٰ کہ اس کے دوست و احباب بھی اس سے ملنے سے کتراتے ہیں۔ یہی حال مرزا غالب کے ساتھ ہوا۔ جس کا ذکر انھوں نے اپنی اس فارسی ترکیب بند میں کیا ہے، ملاحظہ ہو: (۱۷)

☆ خواہم از بند بزندان سخن آغاز کنم — غم دل پردہ دری کرد فغان ساز کنم
بنوای کہ زمضراب چکاند خوناب — خویشتن را بہ سخن زمزمہ پرداز کنم
در خرابی بجہان میکدہ بنیاد نہم — در اسیری بہ سخن دعوی اعجاز کنم
بی مشقت نبود قید بشعر آویزم — روزکہ چند رسن تابی آواز کنم
چون سرایم سخن انصاف زمجرم خواہم — چون نویسم غزل اندیشہ زغماز کنم
☆ شمع ہر چند بہر زاویہ آسان سوزد — خوشتر آنست کہ برنطع در ایواں سوزد
عود من ہرزہ مسوزید وگر سوختنی ست — بگذارید کہ در مجمر سلطاں سوزد
خانہ ام زآتش بیدادِ عدو سوخت دریغ — سوختن داشت زشمعیکہ شبستاں سوزد
منم آن خستہ کہ گرزخم جگر بنمایم — برمن از مہر دل گبر و مسلماں سوزد
منم آن سوختہ خرمن کہ زافسانہ من — نفسِ را ہر دو رہزن و دہقاں سوزد
☆ پاسبانان بہم آئید کہ من می آیم — در زندان بگشائی کہ من می آیم
ہر کہ دیدی بدر خویش سپاسم گفتی — خیر مقدم بسرائید کہ من می آیم
جادہ نشناسم وز انبوہِ شما می ترسم — راہم از دور نمائید کہ من می آیم
رہروِ جادہ تسلیم درشتی نکند — سخت گیرندہ چرائید کہ من می آیم

مرزا غالب جیل سے رہائی کے بعد بھی بہت سے غزلیں اور نظمیں کہے، جس کا موزوں اسیری اور اس کے متعلقات پر ہے۔ ان غزلوں اور اشعار کو پڑھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ واقعہ غالب پر بہت ناگوار گزرا۔ حادثہ اسیری پر لکھی ہوئی غالب کے چند حبسیہ اشعار ملاحظہ ہوں:

☆ کوئی امید بر نہیں آتی — کوئی صورت نظر نہیں آتی
آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی — اب کسی بات پر نہیں آتی
☆ اور وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ ننگ و نام ہے — یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

☆ حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے آخر گناہ گاہوں، کافر نہیں ہوں میں
☆ تم سے بے جا ہے، مجھے اپنی تباہی کا گلہ اس میں کچھ شا ئبہ خوبی تقدیر بھی تھا
تو مجھے بھول گیا ہو، تو ، پتہ بتلا دوں ؟ کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا
قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد ہاں کچھ اک رنج گرا نباری زنجیر بھی تھا
☆ پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا
☆ جس دن سے کہ ہم غمزدہ زنجیر بپا ہیں کپڑوں میں جوئیں بخیئے کے ٹانکوں سے سوا ہیں (۱۸)

حواشی وحوالہ جات:

۱۔حبسیات،فکر وتحقیق،شمارہ۲،جلد۸،اپریل تا جون،۲۰۱۵م،ص:۸

۲۔ایضاً

۳۔ایضاً، ص:۷ تا ۸

۴۔ ایضاً،ص:۸

۵۔ چکیدہ،حبسیہ سرائی درشعرعربی وفارسی،ازدکتر تورج زینی وندو پیمان صالحی،ص: ۲۹

۶۔کلاسکی ادب،ص:۴،ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، جولائی ۱۹۵۳م

۷۔ بحوالہ نقوش،شمارہ۸۳۔۸۴،مشمولہ غالب اور حادثہ اسیری،ڈاکٹر گوپی چند نارنگ،اگست ۱۹۶۰م،ص:۱۷

۸۔ ایضاً،ص:۱۸۔۱۹

۹۔ ایضاً،ص:۱۹

۱۰۔ ایضاً ص:۲۲

۱۱۔ ایضاً،ص:۲۱۔۲۲

۱۲۔ ایضاً،ص:۳۱

۱۳۔ 'باغ دودر' ۔تصحیح بہ وزیرالحسن عابدی،لاہور، ۱۹۷۰م،ص:۱۴۹،

۱۴۔ بحوالہ نقوش،شمارہ۹۴،مشمولہ حادثۂ اسیری اور غالب،نثار احمد فاروقی، جولائی ۱۹۶۲م،ص:۳۳

۱۵۔ ایضاً،ص:۲۹

۱۶۔ غالب: شاعر ومکتوب نگار،نورالحسن نقوی،ایجوکیشنل بک ہاؤس،علیگڑھ،ص:۲۷

۱۷۔ سبدچین،مکتبہ جامعہ،لاہور،۱۹۳۸م،ص:۲۴۔۳۰

۱۸۔ بحوالہ نقوش،شمارہ۸۳۔۸۴،مشمولہ غالب اور حادثہ اسیری،ڈاکٹر گوپی چند نارنگ،اگست ۱۹۶۰م،ص:۳۰

محمد حاذق
ریسرچ اسکالر، شعبہ علوم اسلامیہ
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

سوامی لکشمن پرشاد کی علوم اسلامیہ میں خدمات

سیرت نگاری پر چودہ سو سال سے لے کر آج تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور تا قیامت انشاءاللہ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کے ہر گوشے پر لکھا گیا ہے لیکن جب بھی کوئی محقق قلم اٹھاتا ہے تو زمانے کو کوئی نہ کوئی نیا پیغام دے دیتا ہے اور اس پر جتنا کچھ بھی لکھا جائے لکھنے والے کی چاشنی کبھی ختم نہیں ہوتی۔ آپؐ کی ذات گرامی صرف مسلمانوں کے لئے مختص نہ تھی بلکہ آپؐ کو دنیا کے لئے رحمۃ اللعالمین یعنی پوری دنیا کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا تھا۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

وما ارسلناک الا رحمة للعالمین (سورۃ انبیاء:۱۰۷)

آپ کی ذات مبارک تمام عالم کے لئے اسوۂ حسنہ ہے اور انسانیت کے لئے ایک نمونہ بھی۔ سیرت رسولؐ نہ صرف مسلمانان عالم کے لئے مشعل راہ ہے بلکہ اغیار کے لئے بھی مینارۂ ہدایت ہے۔ بطور خاص مسلمانوں کے لئے آپؐ کی حیات مبارکہ کی معلومات از حد ضروری ہے کیونکہ مسلمانوں کی ہدایت کی روشنی اور رہنمائی کا راستہ آپؐ کی ذات مبارکہ سے مختص ہے۔ سوامی لکشمن پرشاد کی ادبی شاہکار ''عرب کا چاند'' بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوة حسنة (سورۃ احزاب:۲۱)

سوامی لکشمن پرشاد کی ادبی شاہکار ''عرب کا چاند'' موصوف نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے موصوف ایک غیر مسلم ہونے کے باوجود قومی تعصب سے بالاتر ہو کر خاتم الانبیاء نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کو ایسے انداز میں پیش کیا ہے کہ اس کے مطالعہ کرنے سے لوگوں کے دلوں میں رشک پیدا ہو جاتا ہے۔

سوامی لکشمن پرشاد ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۳۹ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ موصوف بے حد محنتی، حق گو اور بے باک شخص تھے۔ انہوں نے زندگی کے مختصر ایام پائے، سوامی جی کرشن کنور کے نام ٹوہانہ ضلع حصار سے شائع ہونے والا رسالہ ''آب حیات'' کو ایڈٹ کرتے رہے۔ طبی دنیا میں آپ نے کرشن کنور کے نام سے شہرت حاصل کی۔ موصوف نے اپنی زندگی کا مقصد تاریخ اور طب کو بنایا طب سے بیمار لوگوں کا علاج ممکن ہے جب کہ تاریخ سے بیمار قوموں کا علاج کیا جاتا

ہے۔موصوف نے ۲۶ سال کی قلیل مدت میں ہی ایسی ادبی کاوش ہم لوگوں کی نذر کر گئے جو رہتی دنیا تک ایک ادبی شاہکار کی شکل میں موجود ہے۔سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اپنے ضمیر کے خلاف کچھ نہیں کہتے تھے مثال کے طور پر ان کا بہت مشہور واقعہ ہے کہ:

''ایک مرتبہ ایک ہندو دوست موصوف کو بہت سی رقم دلانے کا وعدہ کرتا تھا کہ اگر وہ سوامی دیانند کی سوانح عمری لکھ کر انہیں دے دیں مگر سوامی لکشمن جی نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ میں سوامی دیانند کو اس قابل نہیں خیال کرتا کہ اس کی زندگی کے حالات قلم بند کرنے کے لئے اپنی قلم کو حرکت میں لاؤں۔''(۱)

زیر تبصرہ کتاب ''عرب کا چاند'' سچی عقیدت کا نمونہ ہے مقدمہ سمیت ۴۱۴ صفحات پر مشتمل یہ کتاب اپنی زبان کی مٹھاس، سادگی، بیان کی معنویت اور موضوع سے خلوص کی دلیل ہے کتاب کے مقدمہ میں انہوں نے خود لکھا ہے کہ:

''کتاب کے نفس مضمون میں نہ میں کسی کا شرمندہ اصلاح ہوں نہ کسی کا شرمندہ صلاح۔میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ اپنی تحقیق اور تدقیق سے۔جو کچھ کیا ہے وہ اپنے ضمیر سے ہمنوا ہو کر۔میں بھی عام انسانوں کی طرح ایک انسان ہوں اور انسانی کمزوریوں سے مبرا نہیں ہوں ممکن ہے کسی واقعہ پر اظہار رائے کرتے ہوئے صداقت کامل کے اعتبار سے میں نے کسی شدید غلطی کا ارتکاب بھی کیا ہو اور کون جانتا ہے کہ نئے علم کی روشنی میں مجھے اپنی کسی رائے کو تبدیل کرنے کی ضرورت پڑ جائے، بایں ہمہ میں خوش ہوں کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے اپنے ضمیر کی روشنی میں کہا ہے اور کسی فرد بشر یا قوم کی خوشنودی کی خاطر اپنے ضمیر کو دھوکا نہیں دیا ہے۔(۲)

تاجدار مدینہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ سے سوامی جی کو کتنا لگاؤ تھا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ سیرت پر لکھی گئی کتاب ''عرب کا چاند'' اس بات کا بین ثبوت ہے کہ آپؐ سے ان کی بے لوث محبت قاری کو اس کتاب میں پڑھتے ہوئے صاف جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے۔سوامی جی نے اپنی اس تصنیف میں فارسی کا لفظ استعمال کر کے نہ صرف اردو داں طبقے کو حیران کر دیا بلکہ یہ پیغام بھی دیا کہ زبان کسی کی ملکیت نہیں ہے۔جب کہ یہ حقیقت ہے کہ

''اردو لکھنے کی صلاحیت اور خاص طور پر ادبی رنگ میں پیش کرنے کی صلاحیت اہل ہنود میں کم پائی جاتی ہے''(۳)

واقعہ یہ ہے کہ سوامی جی سے کسی نے سوال کیا کہ سوامی جی آپ نے اتنے اچھے طریقے سے سیرت پر روشنی ڈالی

ہے کہ قاری کا ایمان تازہ ہوجاتا ہے پھر کیا وجہ ہے کہ آپ اس کی روشنی سے منور نہ ہو سکے۔ سوامی جی نے جواب دیا جب میں کتاب کو لکھنے کے لئے بڑی بڑی امہات کتب کا مطالعہ کیا تو مجھے حضورؐ کی عظمت کے گوشے اور حضورؐ کی سیرت کے جمال مجھے نظر آئے تو یہ جذبہ میرے دل میں بھی پیدا ہوا کہ میں اس آقا کا غلام بن جاؤں لیکن جب میں موجودہ دور کے مسلمان کا کردار دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ میں ہندو ٹھیک ہوں۔ حکیم عبداللہ نے جو مقدمہ سے پہلے اس میں سوامی لکشمن پرشاد کے بارے میں لکھا ہے یا لوگوں کو یہ یقین دلایا ہے کہ یہ کتاب میں نے نہیں بلکہ سوامی لکشمن نے لکھی ہے اس میں انہوں نے ان کے ایک خط کو بھی شامل کیا ہے جس میں انہوں نے اس بات کی طرف نشاندہی کی ہے کونسی چیز غیر مسلموں کو اسلام کی طرف آنے سے روکتی ہے۔

جب میں مسجد کے سامنے سے گزرتا ہوں:

''جب میں مسجد کے سامنے سے گزرتا ہوں تو میری رفتار خود بخود سست پڑ جاتی ہے گو یا کوئی میرا دامن پکڑ رہا ہو۔ میرے قدم وہیں رک جانا چاہتے ہیں۔ گویا وہاں میری روح کے لئے تسکین کا سامان موجود ہو! مجھ پر ایک بے خودی سی طاری ہونے لگتی ہے۔ گویا مسجد کے اندر سے کوئی میری روح کو پیام مستی دے رہا ہو۔ جب مؤذن کی زبان سے میں اللہ اکبر کا نعرہ سنتا ہوں تو میرے دل کی دنیا میں ایک ہنگامہ سا بپا ہوجاتا ہے۔ گویا کسی خاموش سمندر کو متلاطم کر دیا گیا ہو۔ جب نمازیوں کو میں خدائے قدوس کے سامنے سربسجود دیکھتا ہوں تو میری آنکھوں میں ایک بیداری سی پیدا ہوجاتی ہے۔ گویا میری روح کو ایک متوحش خواب سے جھوڑ کر جگا دیا گیا ہو۔

لیکن جب مسجد سے چند قدم آگے بڑھ جاتا ہوں تو پھر:۔

میری آنکھوں کے سامنے مسلمانوں کی روزمرہ کی زندگی کا نقشہ آتا ہے رنگ کس قدر پھیکا! خطوط کس قدر غیر متناسب! حدود کس قدر غلط! برتن کس قدر تنگ! (۴)

مصنف نے کئی وجوہات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ کیا وجہ ہے کہ مسلمان اسلامی تعلیمات سے آراستہ ہونے کے باوجود مسلمان اپنے عمل سے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر پاتے اور اس عمل سے ان گنت لوگ دنیا میں اسلام کی چاشنی سے ناآشنا رہ جاتے ہیں اس پر ہم سب کو بہت غور وخوض کرنے کی ضرورت ہے کہ ہماری تعلیمات کیا ہیں اور ہمارے عمل کیا ہیں۔ ہمارے نبیؐ نے کس طرح کی زندگی بسر کی اور ہم امت محمدی کا دعویٰ کرنے والے کس حد تک ان کی تعلیمات پر عمل پیرا ہیں۔ اس پر لکھنے اور پڑھنے سے زیادہ ہر فرد کو سوچنے کی ضرورت ہے کہ صرف لفظی دعویٰ کرنے سے کچھ نہیں ہوگا یا زبانی

دعووں سے بات نہ بنے گی بلکہ اپنے عمل سے لوگوں کے دلوں میں اسلامی تعلیمات کو منور کرنا پڑے گا۔ایسے الفاظ کہاں سے لاؤں جو قلب کو گرما دے، یا دماغ کو جھنجھوڑ دے اور اسلام کی صحیح تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمادے۔

یہ مسلمان جو صرف اس لئے مسلمان کہلاتے ہیں کہ وہ مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے ہیں یا صرف اس لئے کہ وہ پانچ وقت کی نماز پڑھتے ہیں اور خوف خدا ان کی دلوں میں نہیں ہے ایسا لگتا ہے کہ جیسے وہ ایک فرائض کی آدائیگی کر رہے ہیں اس فرض سے اتنی رغبت نہیں ہے جتنی ہمارے آقا کو درکار ہے۔مسلمان جن کے کلام میں اسلام تو دیکھا جاسکتا ہے لیکن ان کے کردار میں اسلام کی روح نہیں دکھتی قرآن کریم میں ارشاد ہے کہ:

یاایھا الذین آمنولم تقولون مالاتفعلون (سورہ صف:۲)

جس طرح سے مسلمانوں نے سیرت پر قلم اٹھایا اسی طرح سے غیر مسلم مصنفین اور مستشرقین نے بھی اس میدان میں ان گنت تحریر چھوڑی۔لیکن ''عرب کا چاند'' اس کتاب کی تحریر قاری کے دلوں میں رنگ چھوڑ جاتی ہے اور مصنف نے جس سرشاری سے قلم کو تھاما ہے کہ پڑھنے والا حیرت زدہ رہ جاتا ہے وہ دنیا و مافیھا سے بے خبر ہو کر سیرت مصطفیٰ کی وادی میں دوڑتا چلا جاتا ہے وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کے ساتھ اکثر و بیشتر جگہ ''ﷺ'' لکھتے ہیں۔

کتاب سیرت

سوامی لکشمن پرشاد نے اپنی اس کتاب سیرت کو جہاں ایک طرف تحقیق سے بھرپور انداز میں لکھا ہے وہیں دوسری طرف زبان کا بہت خاص خیال رکھا ہے جس انداز میں انہوں نے اس کو لکھنا شروع کیا ہے اسی انداز میں اس کتاب کا اختتام کیا ہے۔زبان اور اسلوب کا خاص خیال رکھا ہے مثال کے طور پر مصنف نے ''ایمان و کفر کی جنگ میں خون کا پہلا قطرہ'' اس حادثات کی عکاسی جن لفظوں میں کی وہ آپ کے گوش گزار ہے۔

> **''شمع توحید کے پروانوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی محافظت میں جانیں لڑا دینے سے دریغ نہ کیا۔اسی مدافعت میں حارث بن اہالہ جو ایک جاں نثار مسلمان تھے جام شہادت نوش کر گئے۔اسلام کی راہ میں یہ خون کا پہلا قطرہ تھا جس سے زمین رنگین ہوئی۔متعصب معترضین جو اسلام پر یہ اعتراضات لگاتے ہیں کہ اس کی نشر و اشاعت تلوار کے زور سے ہوئی ہے، یہ ملال انگیز واقعہ یاد نہیں کریں گے جس میں ایک بے گناہ کا خون مخالفان اسلام نے پانی کی طرح بہادیا؟ مجھے اعتراف ہے بے شک**
>
> **آزادی اسلام کا افسانہ رنگین**

لکھا ہوا ہے سرخی خون شہدا سے

مگر کفار کے ساتھ مسلمانوں کی صف آرائی جارحانہ نہ تھی بلکہ مدافعانہ تھی۔ ایمان وکفر کی جنگ میں سب سے پہلی خون آشام تلوار جو نیام سے باہر ہوئی وہ کفار کی تھی اور وہ پہلا خون کا قطرہ جس سے زمین رنگین ہوئی ایک مسلمان کا خون کا قطرہ تھا جو کہ اشاعت اسلام میں نہیں بلکہ مدافعت اسلام میں بہا تھا۔'' (۵)

مصنف دنیا کی مایہ ناز شخصیتوں کی سوانح حیات لکھنا چاہتے تھے، جنہوں نے دنیا کی شب تاریکی میں اپنے علم وعرفان سے دنیا کی روشنی دکھائی ہو اور اپنے عیش وآرام کو چھوڑ کر سماج کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔ لیکن مصنف نے سب سے پہلے خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کا انتخاب کیوں کیا؟ تو اپنے انتخاب کے سلسلے میں مصنف خود فرماتے ہیں۔

''میں نے دنیا کی ان عظیم المرتبت اور نادرہ روزگار ہستیوں کے حالات بابرکات صفحہ کو قرطاس پر لانے کا ارادہ کرلیا ہے جنہوں نے دنیا کی جہالت کی شب تاریک میں علم وعرفان کی ضیاپاشیوں سے روشنی پھیلائی اور اپنے اصول کے مذبح پر اپنی زندگی کے تمام عیش وعشرت کے بے دریغ قربان کردیا۔ دنیا کی ان جلیل القدر ہستیوں میں جن کے اسمائے گرامی ہاتھ کی انگلیوں پر شمار کئے جاسکتے ہیں۔ رحمۃ للعالمین، شفیع المذنبین، سیدالمرسلین، خاتم النبیین، باعث فخر موجودات، سرور کائنات حضرت محمد مصطفیٰ، احمد مجتبیٰ علیہ الصلوۃ والتسلیم کو کئی اعتبار سے ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔ اسی لئے میں نے سب سے پہلے اسی قابل تعظیم، فخر روزگار ہستی کی حیات مطہرہ کے حالات قلمبند کرنے کا شرف حاصل کیا ہے۔'' (۶)

نیز ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ جس وقت انہوں نے اس کتاب کو لکھا اس وقت کے ہندوستان کے جو حالات تھے اس کی بھی انہوں نے عکاسی کی اور ''موجودہ دور کا ہندوستان اور دور جاہلیت کا عرب'' ان کے درمیان مماثلت بھی دکھائی ان کا خیال تھا کہ جیسے اس وقت اس ذات گرامی نے سماج میں ایک روح پھونکی اسی طرح سے سوامی جی بھی اپنی اس تصنیف کے ذریعہ لوگوں بھولا بسرا سبق یاد دلانے کی سعی کی۔ اپنی تحریر سے موجودہ دور کا ہندوستان اور دور جاہلیت کا عرب کی عکاسی کی۔

''آج وہی حالات کم وبیش صورت میں ہندوستان میں پیش آرہے ہیں۔ اُس وقت بت پرستی عام طور پر رائج تھی۔ آج کل بت پرستی اور نفس پرستی دونوں کو فروغ

ہے۔اس وقت خونخوار بھیڑیے کے لباس میں ایک انسان دوسرے انسان کے خون کا پیاسا تھا۔آج کل ظاہری محبت اور زبانی عذب البیانی کی میٹھی چھری سے ایک انسان دوسرے انسان کو ذبح کرنے کی کوشش کرتا ہے۔''(۷)

عرب کا چاند پہلے ایک ہی حصہ مکی دور تک شائع ہوا تھا۔لیکن موجودہ ایڈیشن مکمل طور پر شائع کیا گیا ہے۴۱۴ صفحات پر مشتمل یہ کتاب مکتبہ تعمیر انسانیت، اردو بازار، لاہور سے شائع کی گئی ہے۔اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کو ایک غیر مسلم شخص نے کسی دوسرے مذہب کے پیشوا کے بارے میں اس انداز سے لکھا ہے کہ اس مذہب کے پڑھنے والوں کو شک وشبہات میں ڈال دیتا ہے۔ یہ کتاب ادبیانہ انداز میں لکھی گئی ہے اور ساتھ ہی ساتھ تاریخی حقائق کے بیان کرنے میں بھی عام طور پر امہات کتب تاریخ وسیر سے انحراف نہیں کرتی ہے۔کتاب میں حوالے بہت مختصر ہیں صرف انگریزی محققین کے حوالے دستیاب ہیں جیسے ورڈز وتھ، کارلائل، ولیم میورانہیں کے کتابوں کے حوالے کتاب میں درج ہیں۔ حیرت اس بات پر ہے کہ انگریزی محققین سے استفادہ کرکے ایسی سلیس اردو کا استعمال اپنی کتابوں میں کیا ہے۔کتاب کو انہوں نے دوحصوں میں بانٹا ہے پہلا حصہ مکی دور اور دوسرا حصہ مدنی دور ہے۔

حصہ اول (مکی دور)

کتاب کے حصہ اول میں موصوف نے ہندوستان کے سماجی، سیاسی ومعاشی حالات کی بھی عکاسی کی ہے۔ موجودہ دور کے ہندوستان اور دور جاہلیت کے عرب کی مماثلت بھی دکھائی ہے مکی دور کی ابتدا جاہلیت عرب کے حالات، سیاسی، اخلاق، معاشی، اور سماجی حالات سے ہوتا ہے اس کے آپ ﷺ کی ولادت کا واقعہ، حلیمہ کے یہاں پروان چڑھنا، شق صدر کا واقعہ، دادا اور چچا کی کفالت، حضرت خدیجہؓ سے شادی اور ان کی ایثار وقربانی، دعوت کا پیغام خفیہ واعلانیہ، حضرت خدیجہؓ، ابوبکر صدیقؓ اور حضرت علیؓ کا قبول اسلام، مسلمانوں پر کفار کے ظلم وستم، ہجرت کے لئے مجبور کرنا ان سارے واقعات کو بڑی پرشکوہ زبان میں حسب ذیل ۲۶ عناوین کے تحت قلم بند کئے گئے ہیں۔فہرست درج ذیل ہیں۔

۱- دنیا میں تحیر خیز ہنگامہ ترقی
۲- خیالات کا سحر کا راثر
۳- دنیا کی مایہ ناز شخصیتوں کے سوانح حیات
۴- موجودہ دور کا ہندوستان اور دور جاہلیت کا عرب
۵- چودہ سو برس پہلے عرب کا چاند
۶- بعثت
۷- شمع حرم (نظم)

۸- شمع حرم کی شعاع ریزیاں

۹- حضور ﷺ کے والد محترم

۱۰- حضرت عبداللہ کا نکاح مبارک

۱۱- نور محمدی ﷺ کی برکات عظیمہ

۱۲- حضور انور ﷺ کی آفرینش کی صبح درخشاں

۱۳- بت شکن پیغمبر بتوں کے حضور میں

۱۴- حضور انور ﷺ آغوش مادر میں

۱۵- حضور انور ﷺ دادا کی کفالت میں

۱۶- حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا کی قابل اعتبار شہادت

۱۷- ازدواجی زندگی کا مہکتا گلشن

۱۸- ام المومنین خدیجۃ الکبری رضی اللہ عنہا کی بے مثال شیفتگی

۱۹- کفر کی تاریکیوں میں ایمان کی روشنی

۲۰- دو برائے نام خیالی لغزشیں

۲۱- ہجرت حبش

۲۲- ظالم موت کے دو جاں گداز واقعات

۲۳- عرب کے میلوں اور جلسوں میں اسلام کی دعوت

۲۴- افسوں گر پر افسوں چلا گیا

۲۵- نقش حق

۲۶- بیعت عقبہ ثانیہ

حصہ دوم (مدنی دور)

جب ظلم وستم حد سے زیادہ بڑھ گیا اور مسلمانوں کے لئے مکہ کی زمین بالکل تنگ کردی گئی اور ہجرت کے علاوہ ان کے پاس کوئی چارہ نہ بچا تو اکثر و بیشتر مسلمان پہلے ہی ہجرت کر چکے تھے صرف آپؐ اور آپ کے ساتھی ابوبکر صدیقؓ اور کچھ معذور شخص جو ہجرت نہ کر سکتے تھے وہی لوگ موجود تھے جب دارالندوہ میں آپؐ کے قتل کے بارے میں سرداران مکہ صلاح ومشورہ کر رہے تھے کہ کونسی ترکیب نکالی جائے اسی وقت اللہ نے نبیؐ کو ہجرت کا حکم دیا اور آپؐ اپنے صدیق کے

ساتھ اس سفر کے لئے نکل پڑے۔مصنف نے سفر ہجرت سے پہلے کے حالات اور سفر ہجرت، مدینہ میں استقبال، میزبانی کا شرف، قبا مسجد کی تعمیر، مسجد نبوی کی تعمیر، یہودیوں کے پیشوائے اعظم کا مشرف بہ اسلام ہونا، عہد مواخات، میثاق مدینہ، صلح حدیبیہ، بیعت رضوان، خطبہ حجۃ الوداع، سانحہ وفات تک ۲۴ عناوین کے ساتھ کتاب کا اختتام کیا گیا ہے۔فہرست درج ذیل ہیں

۱- ہجرت کی تیاریاں
۲- مدینہ منورہ میں حضورؐ کا پہلا خطبہ
۳- جنگ بدر سرداران یہود سے حضورؐ کا معاہدہ
۴- جنگ بدر کے چند خونچکاں نظارے
۵- ہجرت کا تیسرا سال
۶- جنگ احد
۷- ہجرت کا چوتھا سال
۸- ہجرت کا پانچواں سال
۹- واقعہ افک
۱۰- جنگ احزاب
۱۱- ہجرت نبوی کا چھٹا سال
۱۲- کفار کی عیارانہ چالوں کا ایک ادنیٰ نمونہ
۱۳- صلح حدیبیہ
۱۴- بیعت رضوان
۱۵- ہجرت نبوی کا ساتواں سال
۱۶- ہجرت نبوی کا آٹھواں سال
۱۷- حیات نبوی ک سب سے شاندار فتح
۱۸- جنگ حنین
۱۹- ہجرت کو نواں سال
۲۰- غزوہ تبوک

۲۱- ہجرت کا دسواں سال

۲۲- حجۃ الوداع

۲۳- ہجرت کا گیارہواں سال

۲۴- وفات مبارک

تجزیہ:

سوامی لکشمن پرشاد نے اپنی تصنیف ''عرب کا چاند'' سے صرف مشرق کو ہی نہیں بلکہ اہل مغرب کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے اتنے خوش اسلوبی سے آشنا کرایا۔ سوامی جی سے پہلے بہت سارے غیر مسلم حضرات نے سیرت پر اپنی تصنیف لکھی لیکن سوامی جی کی تصنیف ادبیانہ انداز میں لکھی گئی ہے۔ اس سے پہلے بہت سارے غیر مسلم حضرات نے سیرت پر قلم آرائی کی ہے لیکن نہ تو ان کی زبان اس اعلیٰ درجہ کی ہے اور نہ ہی اس پایہ کا انداز۔ مصنف نے مذہبی تعصّبات کی دبی تہوں کو بہت حد تک کم کرنے کی کوشش کی ہے جو کہ خوش آئند پہلو ہے۔ کتاب کی زبان اور الفاظ کی پختگی کو دیکھتے ہوئے اکثر لوگوں کو یہ شک ہوتا ہے کہ اس کے پیچھے کسی ادیب کا ہاتھ ہے اور یہ صرف نیک نامی یا خرید وفروخت کی غرض سے ایک ہندو مصنف کا نام درج کیا گیا ہے جس کی وجہ سے حکیم عبداللہ صاحب کو اس کی صفائی پیش کرنی کی ضرورت پڑی۔ چنانچہ کتاب ''عرب کا چاند'' کے شروعات میں بعنوان ''سوامی لکشمن مرحوم'' میں اس کی وضاحت کرتے ہیں:

> **''اس کتاب کی نگارش کا سہرا جس عزیز کے سر بندھا ہے اس کا نام نامی ''سوامی لکشمن'' ہے اکثر احباب کا خیال ہے کہ دراصل اس کتاب کو لکھنے والا کوئی مسلمان ہے۔ اور کسی تجارتی غرض یا تبلیغی مقصد کے لئے اس پر ''سوامی لکشمن'' کا فرضی یا اصلی نام لکھ دیا گیا ہے۔ بلکہ بعض احباب نے تو اس کتاب کا نگارندہ مجھے ہی گردانا ہے اور تعجب ہے کہ باوجود میرے بار بار انکار کرنے اور اصل معاملہ سے آگاہی دے دینے کے انہوں نے میری تصنیف نہ ہونے اور سوامی جی کے مصنف ہونے کو باور نہیں کیا۔''(۸)**

موصوف نے ۲۶ سال کی عمر پائی اور اس عمر میں سیرت پر ایسی تحریر لکھی کہ آج بھی اس کتاب کی ایک منفرد حیثیت ہے۔

حواشی ومراجع:

۱- سوامی لکشمن مرحوم پیش لفظ: از حکیم محمد عبداللہ، عرب کا چاند، سوامی لکشمن پرشاد، مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور۔ سولہواں

ایڈیشن۔ص،۱۱

۲- سوامی لکشمن پرشاد،عرب کا چاند،ا،مکتبہ تعمیر انسانیت،لاہور۔سولہواں ایڈیشن۔ص۲۹

۳- سوامی لکشمن مرحوم پیش لفظ:از حکیم محمد عبداللہ،عرب کا چاند،ص۴

۴- ایضاً۔ص۶

۵- سوامی لکشمن پرشاد،عرب کا چاند،ا،مکتبہ تعمیر انسانیت،لاہور۔سولہواں ایڈیشن۔۔ص۱۲۲

۶- ایضاً ص۲۲

۷- ایضاً ص۲۵

۸- سوامی لکشمن مرحوم:از حکیم عبداللہ،عرب کا چاند،ص۷

محمد شعبان
ریسرچ اسکالر، شعبہ فارسی
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عبدالحمید لاہوری کے پادشاہ نامہ کا اجمالی جائزہ

برصغیر پاک و ہند میں فارسی تاریخ نویسی کا آغاز ۶۰۲ھ میں مسلم سلطنت کے قیام کے ساتھ ہی شروع ہوا اور صدرالدین محمد حسن نظامی نیشاپوری کی کتاب تاج المآثر ۶۰۲-۶۱۲ھ کے درمیانی عرصے میں لکھی گئی، برصغیر میں تاریخ پر لکھی جانے والی پہلی کتاب شمار ہوتی ہے۔[۱] عہد سلاطین میں لکھی جانے والی دیگر تاریخی کتب میں منہاج الدین کی 'طبقات ناصری' امیر خسرو کی 'خزائن الفتوح' ضیاءالدین برنی کی 'تاریخ فیروز شاہی' یحییٰ بن احمد سرہندی کی 'تاریخ مبارک شاہی' وغیرہ کافی اہمیت کی حامل ہیں۔

تاریخ نویسی کا یہ سلسلہ مغلوں کے عہد میں بھی قائم رہا۔ تیموری بادشاہوں کو تاریخ نگاری سے خاص دلچسپی تھی اس لئے ہر ایک بادشاہ نے خصوصی توجہ دی اور اپنی سرپرستی میں اس دور کے ماہر علماء، فضلاء اور ماہر دانشوروں کو اس کام پر مقرر کیا جس کا نتیجہ یہ رہا کہ فارسی کی معتبر تاریخی تصانیف وجود میں آئیں، اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں کے زمانے میں متعدد تاریخی کتابیں لکھی گئیں۔ یہ سب سلاطین خود تنکلہ فہم اور سخن سنج تھے اور قدرت نے ایک فطری ذوق ودیعت کیا تھا اس لئے اتنا زبردست کام تاریخی نویسی وجود میں آیا کہ آج ہم کسی طرح اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتے اور ہندوستان کی تاریخ اس سرمایہ کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی ہے۔

شہاب الدین محمد شاہ جہاں نے گرچہ علمی میدان میں کوئی کارنامہ نہیں چھوڑا لیکن وہ صاحب ذوق تھا اور شاہی بخششوں اور عنایتوں سے ادباء، شعراء اور فنکاروں کو فیض یاب کر رہا تھا۔ ابوطالب کلیم ہمدانی کو ملک الشعراء کا خطاب عطا کر کے شعر و ادب کی مستقل آبیاری کرتا رہا۔ شاہجہانی دور جہاں بہت ساری تاریخی یادگاریں اور جاودانی کارناموں کے لئے مشہور ہے وہیں فارسی تاریخ نگاری کے اعتبار سے درخشندہ اور یادگار دور ہے۔ اس دور میں شاہجہاں نے تاریخ نویسی کی ترویج و اشاعت میں کلیدی رول ادا کیا اور ٹھوس اقدامات کئے۔[۲] گرچہ شاہجہاں کو بابر ہمایوں اور جہانگیر کی طرح علمی انہماک نہ تھا اس لئے ان کی طرح کوئی علمی تصنیف نہیں چھوڑی لیکن پھر بھی اس کے ذوق علمی کا صفحہ دلچسپیوں سے خالی نہیں۔

شاہجہاں اپنے گوناگوں مشاغل کے باوجود روزانہ کتابوں کا مطالعہ جاری رکھتا تھا جب تمام کاموں سے فارغ ہوکر رات کو سونے جاتا تو اس کے مقربان خاص پردے کے پیچھے سے کتابیں پڑھتے تھے۔ جو زیادہ تر انبیاء، اولیاء وسلاطین کی سوانح عمریاں اور تاریخیں ہوتیں، وہ ظفر نامہ اور واقعات بابری کو بہت پسند کرتا تھا۔[۳]

شاہجہاں کی زر پاشیوں اور علم نوازیوں کے سلسلہ میں ایک واقعہ قابل ذکر ہے:

یمین الدولہ نے ترہت کے دو برہمنوں کو دربار میں پیش کر کے عرض کیا کہ یہ دونوں دس بندی بیتیں جو دس شاعروں نے تازہ کہی ہوں اور کسی نے نہ سنی ہو ایک بار سن کر یاد کر لیتے ہیں اور اسی وزن اور مضمون میں دس شعر فی البدیہہ کہہ دیتے ہیں، امتحان ہوا تو سچ ثابت ہوا، شاہجہاں نے دونوں کو خلعت اور ہزار ہزار روپے انعام میں دیئے۔[۴]

شاہجہاں کو جہاں ایک طرف شعراء وادباء سے کافی شغف ولگاؤ تھا وہیں دوسری طرف مؤرخین بھی وہ کافی عزت واحترام کرتا تھا کیونکہ اس کو تاریخ سے خاص ذوق رہا ہے اس لئے اس کے عہد حکومت میں تاریخ نویسی کو کافی مقبولیت ملی۔ شاہجہاں نے اپنے اس ذوق کی تکمیل کے لئے متعدد اہل قلم کی خدمات حاصل کی اور اس دور میں بے شمار کتب تواریخ لکھی گئی جن میں لاہوری کا پادشاہ نامہ بھی سرفہرست ہے۔

عبدالحمید لاہوری

عبدالحمید لاہوری متوفی ۱۰۶۵ھ/۱۶۵۴ء کی ولادت شہر لاہور میں ہوئی اور لاہوری علماء سے مختلف علوم وفنون میں دسترس حاصل کی۔ اس کے بعد ابوالفضل ابن مبارک ناگوری جو بادشاہ اکبر کے وزیر خاص، اور ''اکبر نامہ'' و'' آئین اکبری'' جیسی شاہکار تصانیف کے مولف ہیں۔ ان سے سخن طرازی کا انداز سیکھا۔ اس لئے اس کی (لاہوری) تحریر کا اسلوب بعینہ وہی تھا۔[۵] لیکن زمانے کی نامساعدت سے ۱۰۴۶ھ میں آکر عزلت نشین ہوگیا تھا۔ شاہ جہاں کو جب اس کی علمی صلاحیت کا پتہ چلا تو عبدالحمید لاہوری کو پٹنہ سے آگرہ بلوالیا۔ عبدالحمید لاہوری سرکاری ملازمت سے سبک دوش ہوکر دربار شاہ جہانی میں حاضر ہوا، بادشاہ کی خواہش تھی کہ ابوالفضل کی ''اکبر نامہ'' کے طرز پر اس کے دور حکومت کی بھی تاریخ لکھی جائے۔ لہٰذا عبدالحمید لاہوری کو بادشاہ نے اس کام کے لئے مامور کر دیا۔ لاہوری عہد شاہ جہانی کا وہ مورخ تھا جس نے اپنے ''پادشاہ نامہ'' کے ذریعہ شاہ جہاں کی امیدوں پر کھرا اترا اور اس کی خواہش کو پائے تکمیل تک پہنچایا۔ لاہوری نے یہ کام شاہ جہاں کے دور حکومت کے بارہویں سال شروع کیا۔ محمد وارث کے مطابق لاہوری نے یہ کام ۹ نومبر ۱۶۴۸ء میں مکمل کیا اور ۳۰/اگست ۱۶۵۴ء میں اس دنیا سے ہمیشہ کے لئے چلا گیا۔[۶]

مولانا عبدالحئ مصنف ''نزہۃ الخواطر'' نے لاہوری کو ابوالفصل کا شاگرد تحریر کرتے ہوئے انہیں تاریخ وانشاء

وشعر کے بہت ماہر علماء میں شمار کیا ہے چنانچہ رقم طراز ہیں:

شیخ فاضل عبدالحمید لاہوری تاریخ وانشاء اور شعر کے ایک بہت بڑے عالم ہیں۔ لاہور میں پیدا ہوئے اور وہیں پر پلے بڑھے، اور لاہوری علماء سے استفادہ کیا۔ اس کے بعد ابوالفضل ابن مبارک ناگوری کی شاگردی میں رہ کر مزید علوم وفنون حاصل کی۔ ایک لمبے عرصے تک بادشاہوں اور امراء کے دربار سے وابستہ رہے۔ اس کے بعد تنہائی کی زندگی اختیار کرلی۔ اور شہر عظیم آباد (پٹنہ) میں گوشہ نشین ہوگئے۔ اور اسی راستے پر ایک لمبے زمانہ تک قائم رہے، اس کے بعد شاہ جہاں ابن جہانگیر تیموری نے انہیں اپنے پاس بلوالیا۔ اور ان کو اپنی سیرت سے متعلق ایک کتاب تصنیف کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ لاہوری نے عہد شاہ جہانی سے متعلق ایک کتاب تصنیف کی جس کا نام ''پادشاہ نامہ'' رکھا۔ اور جو ''شاہ جہاں کے نامہ'' کے نام سے بھی مشہور ہے۔ اس عظیم الشان کارنامے کو انجام دینے کے چھ سال بعد یعنی ۱۶۵۴ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔[8]

عبدالحمید لاہوری نے فن تاریخ نویسی میں جو بیش بہا خدمات انجام دی ہے وہ تاریخ ہند کا ایک ذرین باب اور ناقابل تردید حصہ ہے۔ اس کا سب سے عظیم کارنامہ عہد شاہ جہانی کی وہ تاریخ ہے جس کو ہم ''پادشاہ نامہ'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ لاہوری نے اس تاریخ کو ۱۰۵۲ء مطابق ۱۶۴۲ء میں لکھنا شروع کیا اور ۱۰۵۸ھ مطابق ۱۶۴۸ء میں مکمل کردیا۔ مصنف نے دس سال کی تاریخ کو دو جلدوں میں قلم بند کیا ہے اس کتاب کی نظر ثانی خود مصنف نہ کر کے شاہ جہاں کے وزیر سعداللہ خان سے کروائی۔ جیسا کہ ''تذکرہ مورخین'' کے مصنف لکھتے ہیں کہ:

''لاہوری اپنے خراب صحت اور کمزوری کی وجہ سے مسودے کی نظر ثانی نہ کر سکے۔ اور علامہ سعداللہ خان نے اس خدمت کو بخوبی انجام دیا۔[9]

عبدالحمید لاہوری نے پادشاہ نامہ کا تیسرا حصہ ۱۵/اپریل ۱۶۵۰ء میں لکھنا شروع کیا تھا۔ لیکن لاہوری کی عمر اب جواب دینے لگی تھی اور دور شاہ جہانی کے آخر چار سال کی تاریخ لاہوری کے شاگرد محمد وارث نے لکھی۔

اس کتاب کی جلد اول میں ۱۰۳۷ھ مطابق ۱۶۲۷ء تا ۱۰۴۷ھ مطابق ۱۶۳۷ء تک کی تاریخ لکھی گئی ہے۔ دوسری جلد ۱۰۴۷ھ مطابق ۱۶۳۷ء تا ۱۰۵۷ھ مطابق ۱۶۴۷ء تک کے واقعات پر مشتمل ہے۔ جلد اول میں تقریبا وہی حالات ملتے ہیں جو پادشاہ نامہ امین قزوینی میں رقم ہیں۔ البتہ اس میں شاہ جہاں کے پیشرو اور اس کے ایام طفلی کے حالات چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ دونوں کے اسلوب تحریر اور ابواب تقسیم میں نمایاں فرق ہے[10] کیونکہ عبدالحمید لاہوری کا طرز ''اکبر نامہ'' کے مصنف ابوالفضل علامی کی طرح ہے۔

کتاب کی دونوں جلدوں میں تاریخی واقعات اور حالات جو عہد شاہ جہانی میں رونما ہوئے سب کو ترتیب وار بیان کئے گئے ہیں۔اس میں سال بہ سال کی جنگی مہموں شورش پسندوں کی سرکوبی، شمسی قمری اور نوروز کے جشنوں، انعام وکرام، بخششوں، نئی تعمیر ہونے والی عمارات، سیر کشمیر شہزادگان کی رسوم، کتخدائی، اسلامی تقریبات پر خیرات وانعامات، درباری زندگی کے کوائف درج کئے گئے ہیں۔دونوں جلدوں کا اختتام علماء ومشائخ، شعراء وحکماء کے مختصر بیان پر ہوا ہے۔ ''پادشاہ نامہ'' عہد شاہ جہانی پر ایک اہم اور مستند ماخذ ہے جس سے برصغیر اور یورپ کے مورخین نے خوب استفادہ کیا ہے ۔یورپ کے مورخین میں بالخصوص ایلیٹ اور ڈاؤسن نے خوب استفادہ کیا ہے۔

عبدالحمید لاہوری کا ''پادشاہ نامہ'' عہد شاہ جہانی کی ایک مستند تاریخی کتاب مانی جاتی ہے۔''منتخب اللباب'' کے مصنف خافی خان نے شاہ جہاں کے ابتدائی ۲۶ سالہ دور حکومت کی تاریخ لکھنے کے لئے لاہوری کے پادشاہ نامہ کو اپنا بنیادی ماخذ بنایا ہے۔لاہوری کے ''پادشاہ نامہ'' سے متعلق جو سب سے بڑا اعتراض ہے وہ یہ کہ اس میں مرکب قسم کے اسلوب یا انداز بیان تحریر کئے گئے ہیں۔جس کی شروعات ہندوستان میں ابوالفضل اور اس کے بھائی فیضی نے کی تھی۔جیسا کہ محمد صالح لکھتا ہے کہ:

> ''لاہوری نے سخن طرازی کا انداز ابوالفضل سے سیکھا ہے۔اور اس فاضل بدل کے فیض کلام سے پورا حصہ پایا ہے۔چنانچہ عبدالحمید کی تحریر کا اسلوب بھی بعینہ وہی ہے کہ اس کے پیشوائے نکتہ دانی کے قدم بہ قدم چلتا ہے۔انشاء نگاری میں کامل ہے ۔اور نکتہ سنجی میں معاصروں سے آگے ہے۔قلم سے مضامین ومعانی کے جوہر چھڑتے ہیں۔عقل ودانش اس کے قلم کو عصائے رہبر سمجھتی ہیں۔اس نے زمانہ شباب میں علوم وفنون کی تکمیل کر لی تھی۔فن انشاء کی تحصیل خوب کی تھی۔اب بڑھاپا ہے لیکن عبارت آرائی میں وہی چستی ومتانت موجود ہے۔ضعف پیری کے سبب مٹھی بھر ہڈیاں رہ گئی ہیں۔اور لکھتے وقت عبارت آرائی کا حق ادا کر دیتا ہے۔شاہ بحر وبر کے حسب الحکم ان کے اولین بیس سالہ عہد حکومت کے حالات لکھنے پر مامور ہوا تھا۔اس تاریخ نگاری میں طبع ارجمند کی مدد سے ہر جگہ لطف کلام پیدا کیا''۔[۱۱]

پادشاہ نامہ ایک عام تاریخ ہے اور اس کی بہترین نقول مہیا ہیں، مسٹر مورلے کا بیان ہے کہ:

> اس کتاب کی ایک نقل جو رائل ایشاٹک سوسائٹی میں موجود ہے مشرقی فن خوشنویسی کا بہترین نمونہ ہے۔کرنل لیز نے بادشاہ نامہ کے دوسرے حصے میں ذکر کیا ہے۔جس پر شہنشاہ شاہ جہاں کے دستخط

ہیں۔[۱۲]

تاریخی اہمیت:

تاریخ کی مشہور و معروف کتاب پادشاہ نامہ تاریخی اور ادبی لحاظ سے ایک مشہور و معروف کتاب ہے جسے عبدالحمید لاہوری نے تصنیف کیا ہے، اس میں شاہ جہاں (1628-1658) بادشاہ کے سوانحی حالات درج کئے گئے ہیں۔اس کتاب کے مخطوطہ کو اودھ کے نواب نے ۱۷۹۹ء میں جیورج سوئم کو پیش کیا تھا اور ۱۸۳۰ء کے ابتدائی ایام سے ہی اسے Windsor Castle کے رائل لائبریری میں رکھا گیا تھا۔۱۹۹۴ء میں مخطوطات کے تحفظاتی عمل نے اس امر کو ضروری کر دیا کہ اس مخطوطے کے تمام اجزا کو یکجا کر کے اور اس کے علاوہ جو دیگر مخطوطات لائبریری میں موجود ہیں ان کو بھی صاف ستھرا کر کے مزید نکھارا جائے اور پھر عوام کے سامنے نمائش کے طور پر پیش کیا جائے۔اس عمل کے تحت اس مخطوطے سے متعلق ۴۴ مرقعات کو پہلی بار اس لائبریری میں نمائش کے لئے رکھا گیا۔[۱۳] اس مخطوطے کو ہندوستان کی راجدھانی نئی دہلی میں ۱۹۹۷ء میں بہ طور نمائش رکھا گیا۔[۱۴]

پادشاہ نامہ کی تخلیق کے پسِ پشت یہ مقصد کارفرما تھا کہ شاہی انداز میں رسمی طور پر ایک ایسا مرقع تخلیق کیا جائے جس میں بشمولِ بادشاہ اس کی سلطنت کے تمام حالات و واقعات مندرج ہوں، اس مرقع سازی کا التزام تحریری اور تصویری دونوں شکلوں میں کیا جائے، جس قدر زور تحریری شکل میں واقعات کی پیش کش پر ہو اسی قدر شاہی معاملات کو تصویروں کی مدد سے پیش کئے جانے پر بھی زور دیا جائے۔اس بات کی ہدایت تھی کہ متن میں رسمی واقعات کا بیان ہو، شاہی درباری نظام سے وابستہ معاملات کا ذکر ہو، شاہی دربار کے رسوم و عادات کی تفصیل ہو، بادشاہ کے دور حکومت میں لڑی جانے والی جنگوں کا بیان ہو اور اس طرح کے دیگر شاہی واقعات و معاملات کا تفصیلی بیان شامل ہو۔ان ہدایات کے نتیجے میں ہم پادشاہ نامہ میں دیکھتے ہیں کہ اس میں چھوٹے چھوٹے واقعات کو بیان کرنے کی غرض سے ڈھیر ساری تصویروں کی مدد لی گئی ہے اور کسی بھی واقعے کو اس طور پر پیش کیا گیا کہ دیکھنے والوں کو تصویر سے ہی معاملات کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ان خوبیوں کے باعث پادشاہ نامہ مصوری اور مرقع نگاری کا ایک بہترین نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔وندسور کے مقام پر پادشاہ نامہ کا جو مخطوطہ موجود ہے جس میں شاہ جہاں کے عہد کے واقعات کی عمدہ پیش کش پائی جاتی ہے۔ پادشاہ نامہ کے لئے جن مصوروں نے مصوری کی، وہ اپنے عہد کے سب سے عظیم مرقع نگار تھے۔اس کتاب میں شامل تمام ۴۴ مرقعات شاہ جہانی عہد کے شاہی درباری نظام اور حکومتی معاملات کی عمدہ عکاسی کرتے ہیں۔جس میں شاہ جہانی عہد میں موجود دولت و ثروت کی فراوانی،

مغلیہ سلطنت کی عظمت و وجاہت اور مغلیہ سلطنت کے جاہ وجلال اور اس کی اختیارات کا بھر پور بیان شامل ہے۔اس کتاب میں اس بات کا ذکر نہیں کہ مغلیہ سلطنت اور یوروپین تاجروں کے مابین کسی قسم کا کوئی تصادم رہا ہو۔اس حوالے سے پادشاہ نامہ ایک نئی صورت حال کا پتہ دیتی ہے کیوں کہ اب تک جتنے شاہی دستاویز مغلیہ حکمرانوں کے ذریعہ مرتب کروائے گئے تھے ان میں کسی نہ کسی واقعات وحالات کی مصوری اور مرقع کشی کرنے والے فن کار بھی اپنے عہد کے نایاب مرقع نگار و مصور تھے۔ پادشاہ نامہ میں مصوری کے ذریعے جہاں لوگوں کے رسوم وعادات کا بیان شامل ہے وہیں پر اس میں ان کے اشیائے خوردونوش، ان کے ملبوسات، آلات واوزار، ان کے رہن سہن، تعمیرات اور ان کے تمام معاملات کی بہترین عکاسی کی گئی ہے۔ پادشاہ نامہ میں موجود ساری تصویریں عہد شاہ جہاں میں مروجہ شاہی درباری نظام کے حوالے سے ایک حقیقی تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہیں۔

رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی لائبریری میں موجو مخطوطہ کا آغاز چار تصویروں سے ہوتا ہے جن سے اس بات کا پتا چلتا ہے کہ شاہی دستاویز کی حیثیت سے پادشاہ نامہ کی کیا اہمیت ہے۔پہلی تصویر میں دو چمکتے ہوئے سورج کو دکھایا گیا ہے جو کہ حد درجہ روشن ہے۔۔اس مخطوطہ کے آغاز میں ہی اس تصویر کو شامل کیا جانا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ پادشاہ نامہ کے مصنف کو شاہی اثر ورسوخ حاصل تھا اور خود اس معاملے میں بادشاہ کی سرپرستی بھی حاصل تھی۔شاہی جاہ وجلال کو مزید بعد میں آنے والی تصویروں کے ذریعہ بھی واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ایک تصویر میں تیمور لنگ کے خدوخال کو پیش کیا گیا جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ اس کے ہاتھ میں ایک شاہی تاج ہے جسے وہ بادشاہ شاہ جہاں کے سامنے پیش کررہا ہے جو اس کے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔

ان کتاب میں شامل دیگر تصویروں میں مغل بادشاہ شاہ جہاں کے ابتدائی پندرہ سالوں کے حالات تصویروں کی مدد سے تاریخی تناظر میں بیان کئے گئے ہیں۔اس تصویر میں موضوع کی حیثیت سے اس کی بہادری اور شہزادے کی حیثیت سے اس کی جنگی صلاحیتوں اور میدان جنگ میں دکھائے گئے اس کے کارناموں کو پیش کیا گیا ہے اس کے بعد ایک بادشاہ کی حیثیت سے اس کے دور حکومت میں مغلیہ سلطنت کی کارکردگی کا احاطہ کیا گیا ہے۔

عبدالحمید لاہوری کے ذریعہ ترتیب دیا گیا پادشاہ نامہ مغلیہ عہد حکومت کے حوالے سے آخری تاریخی دستاویز ہے جس میں شاہ جہانی عہد کے بیشتر حالات وواقعات کو مرقع کشی اور مصوری کی مدد سے نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۱۶۶۸ء میں اورنگ زیب عالمگیر جو کہ شاہ جہاں کے بعد مسندِ بادشاہت پر جلوہ گر ہوئے انہوں نے مذہبی مبادیات کی بنیاد پر شاہی مصوری کے رواج کو ناپسند کیا اور مدتوں سے مرقعات اور تصویروں کی مدد سے سلطنتِ مغلیہ کی تاریخ نویسی کا جو سلسلہ چل رہا تھا اسے منقطع کیا۔ اس ضمن میں یہ کہنا بے جا ہوگا کہ پادشاہ نامہ میں شاہ جہاں کی زندگی کے تمام حالات و واقعات کو سمو دیا گیا ہے کیوں کہ جب پادشاہ نامہ کا متن تیار ہوا اس کے اور ۱۶۵۸ء میں جب شاہ جہاں کی بادشاہت کا خاتمہ ہوا، دونوں کے درمیان صرف ایک ہی سال کا وقفہ دکھائی دیتا ہے۔ اس لئے یہ بات قابلِ قبول ہونے سے ذرا بعید نظر آتی ہے کہ پادشاہ نامہ میں شاہ جہانی عہد کے تمام حالات و واقعات مندرج ہیں۔ مزید یہ کہ اورنگ زیب نے جس وقت شاہ جہاں سے مسندِ حکومت چھینا اس وقت سے کچھ ہی سالوں پہلے پادشاہ نامہ کی ترتیب دہی شروع ہوئی تھی۔ ۱۵

مذکورہ بالا تاریخی پس منظر میں ہم عبدالحمید لاہوری کے پادشاہ نامہ کے حوالے سے ایک متوازن رائے زنی کر سکتے ہیں۔ مزید یہ کہ مغلیہ حکومت کے بانی بابر کے عہد سے شاہی حالات و واقعات کو قلمبند کرنے کا جو رجحان رائج رہا ہے وہ پادشاہ نامہ میں اپنی معراج کو پہونچا جو اپنی انفرادی پیش کش، مرقع نگاری اور تصویر کشی کے اعتبار سے مغلیہ سلطنت کے دیگر شاہی سوانحی خاکوں سے ممتاز اور منفرد نظر آتا ہے۔

پادشاہ نامہ کی ادبی اہمیت:

جس طرح سے تاریخی نقطۂ نظر سے پادشاہ نامہ کو ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے کہ اس میں عہد شاہجہانی کے واقعات و معاملات کو تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے اسی طرح سے اس کی ادبی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کیوں کہ اس کتاب میں عبدالحمید لاہوری نے مرصع و مقفع نثر کے اعلیٰ نمونے پیش کئے ہیں۔

پادشاہ نامہ میں جہاں کہیں شاہ جہاں کو مخاطب کیا ہے یا اس سے وابستہ واقعات و معاملات کو پیش کیا وہاں پر اس کی فنی کاریگری صاف طور پر نظر آتی ہے۔ ویسے تو پادشاہ نامہ میں اکثر جگہوں پر حالات و واقعات کی عکاسی ادبیت کے اعتبار سے عمدگی کے ساتھ کی گئی ہے اور صنائع و بدائع اور تشبیہات و استعارات کا استعمال فنی چابکدستی کے ساتھ ہوا ہے، جس سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ عبدالحمید لاہوری ایک قادرالکلام فارسی نثر نگار تھا، جس نے پادشاہ نامہ میں شاہ جہانی عہد کے حالات و واقعات کو بیان کرتے وقت ادبی تقاضوں اور فنی نزاکتوں کا بھرپور خیال رکھا ہے۔

پادشاہ نامہ کی ادبی اہمیت کے حوالے سے یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ اس میں عبدالحمید لاہوری نے

دوسرے شعرا کے اشعار سے استفادہ کرنے کے ساتھ ساتھ قرآنی آیات اور دیگر حکایات کی کتابوں سے بخوبی استفادہ کیا ہے۔حقیقتاً پادشاہ نامہ پُرتکلف نثر کا ایک شاہکار نمونہ ہے۔نثر وشعر کا پرتکلف ہونا بادشاہوں کے شعری مزاج کے عین مطابق تھا کیوں کہ اس عہد میں جن چیزوں کو شہرت دوام حاصل ہوئی ان میں زیادہ تر وہی چیزیں شامل ہیں جن میں تکلف وتصنع اپنے عروج پر رہی ہے۔اب پادشاہ نامہ سے پرتکلف نثر کا ایک چھوٹا سا اقتباس ملاحظہ ہو جس سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ عبدالحمید لاہوری نے کس انداز میں بادشاہ سے جڑے واقعات کو پرتکلف انداز میں پیش کیا ہے:

"درین روز میمنت افروز کہ افسر جہاں بانی نور وضیائی تازہ یافت وتخت ملک ستانی فروبہائی بی اندازہ، افضال رااب آرفتہ بجوی آمد ونوال را رونق گم شدہ بکوی۔از فزونی کرمش حرص گرسنہ چشم، دیر سیر با متلا افتاد وامید جہاں گرد بر بارگاہ سلاطین پناھش بار اقامت کشاد" ۱۶

ادبی نثر کی ایک بڑی خوبی، اس کا توصیفی اور واقعہ نگاری کے فنی مبادیات پر صادق آنا ہے۔ یہاں توصیفی نثر سے مراد یہ ہے کہ اس میں اشیا کا وصف اس انداز میں بیان کیا جائے جس سے ان کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے ،بعض حضرات اس طرح کی نثر کو محاکاتی نثر کا نام بھی دیتے ہیں۔واقعہ نگاری کے فنی مبادیات سے مراد حالات وواقعات کی پیش کش کی سطح پر تخلیق کار کا ایسا اندازِ بیان یا اسلوب نگارش کا استعمال کرنا جس سے کہ اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے آ جائے۔نثر کو توصیفی یا واقعہ نگاری کی صفت سے متصف کرنا مترادف العمل معاملہ ہے کیوں کہ دونوں کا مفہوم ایک ہے۔ یہاں پر اس بات کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شروع شروع میں اشیا کا توصیفی بیان شاعری کے ساتھ مخصوص تھا لیکن بعد کے زمانے میں اس کا اطلاق ہر طرح کی تحریر خواہ اس کا تعلق نثر سے ہو یا نظم سے ہر ایک صنف پر ہونے لگا۔اس اعتبار سے جب ہم پادشاہ نامہ میں عبدالحمید لاہوری کی توصیفی پیش کش یا اس کی مرقع کشی اور واقعی نگاری کے مبادیات ولوازم کو دیکھتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ تخلیق کار نے یہاں بھی اپنا اختصاصی رنگ وآہنگ کو قائم کرنے کی کوشش کی ہے اور اس نثری خوبی سے اپنی تخلیق کو آراستہ کر کے اسے ادبیت کی کسوٹی پر کھرا اترنے کے لئے راستہ ہموار کیا جس سے اس کتاب کی فنی

اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ پادشاہ نامہ کے توصیفی و واقعاتی نثر کا نمونہ ملاحظہ ہو:

"این جاندار کہ بیشتر در دشت می باشد و ہنگام تشنگی قطع مسافت بعیدہ نمودہ بآ بشخور معین کہ جز دران آب نخورد، خود را می رساند۔ در نواحی بھنبھر کہ بر کنار دریائے بہت واقع شدہ بسیار است و برائے خوردن آب بدریائے مذکور می آید۔ اللہ ویردی خان قراول بیگ با مرخا قانی جمعی بر گماشت کہ ہرگاہ بواسطۂ آب روبدریا آرد، سوراہ بگیرند" ۱۷

اس کے علاوہ پادشاہ نامہ دیگر ادبی وفنی وسائل سے بھی مزین ہے اور جس طرح سے تاریخ وانشا، شعر وحکمت فلسفہ کے لئے ایک اسلوب جلیل درکار ہوتا ہے اس کی جھلک پادشاہ نامہ میں بہ حسن وخوبی دیکھی جاسکتی ہے۔ مجموری طور پر یہ کہا جاسکتا ہے ہے تاریخی تناظر کے ساتھ ساتھ ادبی نقطۂ نظر سے بھی پادشاہ نامہ اپنی انفرادی خصوصیت رکھتا ہے جو عبدالحمید لاہوری کے ایک باکمال مورخ فارسی نثر نگار ہونے اور نثر نگاری کے فنی وادبی تقاضوں سے مہارت کی حد تک واقف ہونے کو صاف طور پر واضح کرتا ہے۔

مراجع ومصادر

۱-آفتاب اصغر، تاریخ نویسی در ہند و پاکستان، لاہور، ۱۹۸۵ء، ص ص (پیشگفتار) ب

۲-تاریخ ہند کا اہم مآخذ: ملخص شاہجہاں نامہ، محمد عابد حسین، در دبیر، سہ ماہی رسالہ، جلد سوم، شمارہ دوم، اپریل تا جون ۲۰۱۶ء، ص ۴۹

۳-عبدالحمید لاہوری، پادشاہ نامہ، جلد اول، کالج پریس۔ کلکتہ، ۱۸۶۷ء، ص: ۱۵۳ ۴-ایضاً، ص: ۲۶۹

۵-محمد صالح کنبوہ، شاہ جہاں نامہ، تلخیص وتحسین ممتاز لیاقت، لاہور سنگ میل پبلیکیشن، ۱۹۸۲ء، ص: ۵۸۱

۶-ایلیٹ ٹھٹھ کے بجائے پٹنہ لکھتا ہے۔ ایشیاٹک سوسائٹی کے مطبوعہ میں بھی پٹنہ لکھا ہے۔ لیکن اورینٹل لائبریری کے فاضل کیٹ لاگر نے صاف طور پر بتایا ہے کہ پٹنہ نہیں ٹھٹھ ہے۔ پٹنہ کتابت اور پڑھنے کی غلطی ہے۔ ملاحظہ ہو، بزم تیموریہ، جلد دوم، ص ۲۱۹

۷-سکسینہ، بنارسی پرشاد، تاریخ شاہ جہاں، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، طباعت چہارم، ۲۰۱۰ء، ص: ۲۰

۸-عبدالحی، نزھۃ الخواطر، جلد ۵، دائرہ معارف عثمانیہ، حیدرآباد، ۱۹۹۵ء، ص ۲۱۷

۹- نبی احمد سندیلوی، تذکرہ مورخین، دہلی عفیف پرنٹرس، اشاعت ثانی، ۲۰۱۶ء، ص: ۹۲

۱۰-اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۱۲، دانش پنجاب، لاہور، ۱۹۷۳ء، ص: ۸۵۴

۱۱-محمد صالح کنبوہ، عمل صالح معروف بہ شاہ جہاں نامہ، مترجم ناظر حسین زیدی، جلد سوم، مرکزی اردو بورڈ، لاہور، ۱۹۷۴ء، ص ص: ۸۵۹-۸۶۰

۱۲-اوجھا، شری کرشن، مغل کالین بھارت، ریسرچ پبلیکیشن، جے پور، ۱۹۸۵ء ص: ۴

۱۳- The Court Historian Journal by Routledge Teylor & Francis Group, Vol.20, 2015,P.277 for online acces visit:http:dx.doi.org/10.1179.43.11

۱۴-ایضاً،ص:۲۷۷ ۱۵-ایضاً،ص:۲۸۰

۱۶-عبدالحمید لاہوری، پادشاہ نامہ،کلکتہ،جلداول،ص:۱۱۶ ۱۷-ایضاً،حصہ دوم،ص:۶۰

محمد خان بیابانی
ریسرچ اسکالر، شعبہ فارسی
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

تذکرہ نویسی

زبان فارسی ایک قدیم وعظیم زبان ہے جو ایران میں پیدا ہوئی اور ہندوستان میں پروان چڑھی۔ سلاطین ھند کی سرپرستی کی وجہ سے اس زبان کو انیسویں صدی کے وسط تک عوامی اور دفتری زبان کی حیثیت حاصل رہی۔ عوام وخواص ہر دو نے اس کو اختیار کیا۔ علاوہ ازیں شاہان وقت کے متوجہ ہونے کے سبب یہ زبان گلی کوچوں سے نکل کر شاہی درباروں میں جا پہنچی تو صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ ایران سے بھی شعراء وادباء ان درباروں کی جانب مائل ہونے لگے اور بادشاہوں کی جانب سے ان کی خوب پذیرائی بھی ہونے لگی اس طرح علماء وشعراء کو اپنی صلاحیتوں کو نکھارنے اور اس کے اظہار کے خوب مواقع حاصل ہوئے۔ علماء وشعراء نے نہ صرف اپنے مافی الضمیر کے اظہار کیلئے اصناف ادبی کا سہارا لیا بلکہ تہذیب وتمدن وتاریخ کو اس کے ذریعہ زندہ رکھا ہے ایسے ہی اصناف ادبی میں تذکرہ بھی ایک اہم صنف ہے۔

تعارف تذکرہ نویسی:۔ تذکرہ نویسی ایک اہم ادبی وتاریخی صنف ہے۔ ادبی طور پر اس کی اہمیت اس طرح ہیکہ قاری اس صنف کے ذریعہ ہر دور میں زبان کی حیثیت سے واقف ہوتا ہے اور اس کی ترقی وتکامل سے آشنا ہوتا ہے۔ تاریخی طور پر اس صنف سے زمانے کے حوادث کا پتہ چلتا ہے درباری وتاریخی واقعات سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔

تذکرہ یہ عربی زبان کا لفظ ہے یہ ذَکَرَ یَذْکُرُ سے مشتق ہے اس کے معنیٰ یاد کرنا، یاد الٰہی میں مشغول ہونا اور ذکر کرنا ہے(۱)۔ کلمہ تذکرہ کا معنیٰ عربی زبان میں پند ونصیحت و یادداشت کے بھی آتے ہیں۔ ان ہی معنیٰ میں قرآن مجید میں بھی (۹) مقامات پر لفظ تذکرہ استعمال ہوا ہے (۲) فارسی زبان میں تذکرہ ان معانی میں استعمال ہوا ہے یادداشت، یاد کرنا، ٹکٹ اور پاسپورٹ، شعراء کے حالات وغیرہ۔ جیسا کہ علی اکبر دھخدا نے لغت نامہ دھخدا میں بیان کئے ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

بیاد آوردن ،یادآوردن، پنددادن، تذکیر یادداشت، شہادت
سفر، گذرنامہ، پاسپورت، کتابی کہ درآں خصوصاً احوال شعراء نوشتہ شدہ باشد (۳)

علاوہ اس کے دائرۃ المعارف الاسلامیہ میں قاضی حضرات کو منصب قضاءت عطا کرتے وقت دی جانے والی

سند کو بھی تذکرہ کہا گیا ہے(۴) ڈاکٹر سید علی رضا نقوی تذکرہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ تذکرہ دور صفوی سے پہلے دولت شاہ سمرقندی کے علاوہ تمام فارسی ادبی کتابوں میں یادگار و یادداشت کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے اور دور صفوی میں شعراء کے آثار و احوال کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔(۵)

ایران کی فارسی ادبیات میں تذکرہ شعراء کے احوال و آثار ہی کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے لیکن ہندوستان میں اس کے معنیٰ صرف شعراء کے احوال و آثار والی کتاب تک محدود نہیں ہے بلکہ مختلف شخصیات مثلاً علماء، صوفیاء و محققین وغیرہ کے احوال پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

آغاز وارتقاء تذکرہ نویسی:۔ابتداء میں منتخب اشعار بطور یادگار لکھ لئے جاتے تھے اس کو ''بیاض'' کہا جاتا تھا اور تذکرہ کی بنیاد یہی بیاض ہے جب بیاض میں شاعر کا ادبی و قلمی نام احوال و آثار کے ساتھ جمع ہونے لگا اس کو تذکرہ کہا جانے لگا ہے۔اس اعتبار سے تذکرہ نگاری درحقیقت بیاض کی ترقی یافتہ شکل کا نام ہے۔بعض تذکرے حروف تہجی کی ترتیب پر لکھے گئے ہیں تو بعض ابجدی ترتیب پر لکھے گئے ہیں۔سب سے پہلا تذکرہ جو لفظ تذکرہ سے موسوم ہوا وہ شیخ فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کا ''تذکرۃ الاولیاء'' ہے جو ساتویں صدی ھجری کے اوائل میں لکھا گیا ہے دوسرا تذکرہ شیخ نصیر الدین طوسی کا ''تذکرہ'' ہے جو بیس فصول پر مشتمل ہے۔تیسرا تذکرہ امیر دولت شاہ سمرقندی کا تذکرۃ الشعراء ہے۔

اہمیت تذکرہ نویسی:۔تذکرہ نویسی کو ادبی، تاریخی و سوانحی اہمیت حاصل ہے۔تذکرہ نویسی کو ادبی اعتبار سے اہمیت حاصل ہونے کی اہم وجہ یہ ہیکہ اگر تذکرے نہ ہوتے تو آج ہم ان قدیم شخصیات کے احوال، آثار اور افکار سے واقف نہ ہوتے جن کا تذکرہ تاریخ میں موجود نہیں ہے اور زمانہ قدیم کے ادب سے بھی نہ آشنا رہتے۔آج ہم زمانے قدیم کے ادب سے اور اس زمانے کے شعراء کے کلام سے واقف ہونا چاہتے ہیں تو یہ فقط تذکرہ نویسی کے سبب ممکن ہے۔جیسا کہ اگر آج ہم تیسری و چوتھی صدی ھجری کے شعراء اور انکے کلام، آثار و افکار سے واقفیت چاہتے ہیں تو عوفی کا تذکرہ ''لباب الالباب'' ہی ایک اہم ذریعہ ہے جس سے ہم اس زمانے کے ادب سے واقف ہو سکتے ہیں اس اعتبار سے ادبی دنیا میں تذکرہ نویسی کی اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

تاریخی و سوانحی اعتبار سے تذکرہ کی اہمیت سے متعلق ڈاکٹر فرمان فتح پوری یوں رقمطراز ہیں:

تاریخ اس کو کہتے ہیں جس میں واقعات یا حالات زمانہ اس طور پر لکھے جائیں کہ اس سے یہ معلوم ہو سکے کہ فلاں زمانے میں یہ حادثہ یا واقعہ گذرا۔بخلاف تذکرہ کے کہ اس میں ایک خاص قسم کے لوگوں کا حال لکھا جاتا ہے۔مثلاً تذکرۃ الشعراء یا تذکرۂ انبیاء یا تذکرۂ اولیاء وغیرہ۔اس سے معلوم ہوا کہ تذکرہ خاص ہے اور تاریخ عام۔(۶)

شرائط تذکرہ نگاری:۔تذکرہ نگار کو چاہئے کہ وہ درج ذیل شرائط کو ملحوظ رکھے:

(۱) تذکرہ نگار کو ذوق بھی ہو اور اس کی استعداد علمی و ادبی بھی شعر و سخن سے آشنائی تک بڑھی ہوئی ہو۔

(۲) تذکرہ نگار صاحب تذکرہ کے بارے میں درج ذیل تفصیلات حاصل کرے

(ا) صاحب ذکر کا اسم، کنیت، القاب و تخلص۔

(ب) صاحب ذکر کا سنہ و جائے ولادت۔

(ج) اس زمانے کے سیاسی و اجتماعی احوال

(د) صاحب ذکر کی تحصیلات و شاگردی اور ان کے اساتذہ کے نام۔

(ہ) مشاغل۔

(و) آثار

(ز) فرزندان و شاگردان

(ح) علمی مقام و مرتبہ

(۳) صاحب ذکر سے متعلق تفصیلات معتبر مآخذ سے حاصل کرے اور اس میں معتبر ترین ماخذ خود صاحب ذکر ہیں اور اگر صاحب ذکر نہ ہوں تو تذکرہ نویس کو چاہئے کہ ایسے سے معلومات اخذ کرے جس کی صاحب ذکر سے ملاقات ثابت ہو مثلاً فرزندان، احباب و شاگردان۔

(۴) تذکرہ نگار کو چاہئے کہ وہ نقد ادبی میں جانبداری اور تعصب و گروہ بندی کا شکار نہ ہو(۷)

حواشی:

(۱) معجم الوسیط، حرف الذال

(۲) سورۃ طٰہٰ، آیت ۳، ۔سورۃ الواقعہ، آیت ۷۳۔سورۃ الحاقۃ، آیت ۱۲۔سورۃ الحاقۃ، آیت ۴۸۔سورۃ المزمل، آیت ۱۹۔سورۃ المدثر، آیت ۴۹۔سورۃ المدثر، آیت ۵۴۔سورۃ الدھر، آیت ۲۹۔سورۃ عبس، آیت ۱۱۔

(۳) لغت نامہ دھخدا، جلد ۶، صفحہ ۱۸۰۶، حرف التا۔

(۴) دائرۃ المعارف الاسلامیہ، جلد ۶، صفحہ ۱۸۵، زیر اہتمام دانش گاہ پنجاب لاہور۔

(۵) تذکرہ نویسی فارسی در ھند و پاکستان، از ڈاکٹر سید علی رضا نقوی، صفحہ ۲، چاپ علی اکبر علمی تہران۔

(۶) اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری، از ڈاکٹر فرمان فتحپوری، صفحہ ۱۹، مجلس ترقی ادب لاہور

(۷) اردو تذکرے، از عبدالجبار، صفحہ ۱۵، مطبع لکھنو پریس۔

پروفیسر رضوان اللہ آروی
پٹنہ، بہار

بہار کے فارسی اساتذہ سیریز۔۲

پروفیسر غلام مجتبیٰ انصاری۔شخصیت اور علمی کارنامے

پروفیسر غلام مجتبیٰ انصاری، بہار میں فارسی تحقیق وتنقید کی اُس روشن روایت کے وارث وامین تھے جو پروفیسر سید حسن، پروفیسر عطا کاکوی، پروفیسر محمد صدیق، پروفیسر متین احمد، پروفیسر فیاض الدّین حیدر اور پروفیسر انوار احمد وغیرہ کی تحریروں، ان کے تحقیقی کارناموں اور ان کی تنقیدی بصیرتوں سے عبارت تھی۔ بہار میں صف اول کے ان فارسی اساتذہ کی رحلت کے بعد ایسا لگ رہا تھا کہ ' خیال وخواب ہوا برگ وبار کا موسم ' لیکن ایسا نہیں ہوا کہ ان کے بعد پروفیسر غلام مجتبیٰ صاحب اس چمن کی آبرو بن کر ابھرے اور انہوں نے اپنے علمی وادبی کارناموں سے اس روایت کی توسیع بھی کی اور اس خلا کو پُر بھی کیا۔ اور یوں 'برگ وبار کا موسم' اُس وقت تو 'خواب وخیال' ہونے سے بچ گیا لیکن ۲۰ ستمبر ۲۰۱۸ء کو خود پروفیسر مجتبیٰ صاحب کے انتقال کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ' ایک سناٹا بچھا ہے اس جہاں میں ہر طرف '

پروفیسر غلام مجتبیٰ صاحب اپنے پیشروؤں کے علمی وادبی ورثہ کے تحفظ میں کامیاب رہے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی ذات میں علم ودانش کے ساتھ اُس جذبہ کا وفور بھی تھا جو زندگی کی آخری سانس تک علم وادب اور تصنیف وتالیف کے لئے خود کو وقف کر دینے کی تحریک بخشتا ہے۔ علم ودانش کا بحران اور اس جذبہ کا فقدان دور حاضر کا بڑا المیہ ہے اور پروفیسر غلام مجتبیٰ صاحب جیسے لوگوں کے گزرنے کے بعد یہ المیہ مزید گہرا ہو جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اب ' اُن دریچوں پہ گہرے دبیز پردے ہیں ' جہاں سے علم وادب کی کرنیں پھوٹ کر باہر نکلتی تھیں اور کارگاہ سخن کو روشن ومنور کرتی تھیں۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی صحیح ہے کہ اس سناٹا اور تاریکی میں پروفیسر غلام مجتبیٰ صاحب کے روشن حروف اور محترم الفاظ ہمیشہ ان کے ہونے کی گواہی دیتے رہیں گے ' لفظ میرے، مرے ہونے کی گواہی دیں گے '

پروفیسر غلام مجتبیٰ صاحب کے دانشورانہ افکار سے مزین ان کے علمی آثار کا تجزیہ نہ میرا منصب ہے اور نہ میری حیثیت۔ پروفیسر مجتبیٰ صاحب کی تخلیقات اور ان کے علمی سرمائے کے حوالے سے یہ تحریر صرف ایک تاثر ہے اور ایک تعارف۔ لیکن پروفیسر مجتبیٰ صاحب کے علمی کارناموں کے تعارف سے قبل ان کی سوانح حیات پر ایک نظر ڈالنا مناسب ہوگا۔

پروفیسر غلام مجتبیٰ انصاری صاحب ضلع ویشالی کے عطاء اللہ پور نامی بستی میں ۱۸ر مئی ۱۹۳۸ء میں عالم وجود میں آئے۔ یاد رہے کہ یہی وہ سال ہے، جس سال علامہ اقبال اس دنیا سے رخصت ہوئے تھے۔ پروفیسر غلام مجتبیٰ صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے والد محترم مولانا محمد نصیر الدّین سے حاصل کی جو لعل گنج کے ایک اسکول میں بحیثیت استاد اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ اس کے بعد آپ کا داخلہ دانشگاہ پٹنہ میں ہوا جہاں سے آپ نے ۱۹۵۴ء، ۱۹۵۶ء اور ۱۹۵۸ء میں بالترتیب آئی۔ اے، بی۔ اے (فارسی آنرز) اور ایم۔ اے (فارسی) کے امتحانات میں کامیابی حاصل کی۔ بعد ازاں اسی دانشگاہ سے آپ نے ۱۹۶۰ء میں اردو زبان وادب میں ایم۔ اے کیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر محمد صدیق صاحب کے زیر نگرانی درویش حسین والہ ہروی کی حیات وخدمات پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹر آف فلاسفی کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد بھی آپ کا علمی سفر جاری رہا۔ چنانچہ حکیم شیخ حسین شہرت شیرازی کی شخصیت اور علمی کارناموں پر تحقیقی مقالہ لکھ کر آپ ڈی لٹ کی سند سے سرفراز ہوئے۔ بعد میں جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی نے بھی آپ کو جدید فارسی میں جواز عطا کیا۔ ۱۹۹۰ء میں یو جی سی کے ایک پروجیکٹ ''ہندوستان کی فارسی شاعری میں ہندوستانی تہذیب وثقافت کی جھلک'' کے تحت آپ نے مواد کی جمع آوری کے لئے انگلستان کا سفر کیا۔ ۱۹۹۴ء میں آپ حکومت ایران کی دعوت پر ایران تشریف لے گئے اور تقریباً ایک ماہ وہاں قیام کے دوران وہاں کے تاریخی آثار، مذہبی مقامات اور تعلیمی اداروں کا دورہ کرنے کے علاوہ ایرانی اساتذہ اور دانشوروں سے استفادہ بھی کیا۔ غلام مجتبیٰ صاحب کا منظوم سفرنامہ ''مشاہدات مجتبیٰ از سفر ایران'' اسی سفر کی یادگار ہے۔ آپ کو فارسی کے علاوہ اردو، عربی اور انگریزی زبانوں پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ چنانچہ فارسی زبان وادب سے متعلق سمیناروں اور کانفرنسوں میں آپ کو بطور خاص مدعو کیا جاتا تھا اور نہ صرف آپ کے مقالے کو دلچسپی سے سنا جاتا تھا بلکہ آپ کی علمی کارناموں کا اعتراف بھی کیا جاتا تھا۔ پروفیسر غلام مجتبیٰ صاحب کی مجموعی علمی خدمات کے اعتراف میں ۱۵ر اگست ۲۰۰۱ء میں صدر جمہوریہ ہند نے آپ کو سند اعزاز سے نوازا۔

یہ بھی عجیب بات ہے کہ حصول تعلیم کے بعد مجتبیٰ صاحب کی ملازمت کا آغاز ایک ایسے ادارے سے ہوا جس کا علم وادب سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ بہار کوآپریٹو سوسائٹی میں انسپکٹر کی حیثیت سے آپ مامور تو ہوئے لیکن ظاہر ہے قدرت کو ان سے جو علمی کام لینا تھا اس کے لئے وہ جگہ مناسب نہیں تھی۔ چنانچہ بہت جلد آپ اُس کام سے الگ ہو کر درس وتدریس کی طرف متوجہ ہوئے جو ان کا صل میدان تھا۔ ۱۹۶۰ء میں بحیثیت لکچرر آپ کی تقرری سہرسہ کالج، سہرسہ میں ہوئی۔ وہاں سے آپ ٹی۔ این۔ بی کالج، بھاگلپور منتقل ہوئے جہاں ۱۹۸۲ء تک آپ تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ جولائی ۱۹۸۲ء میں بہار یونیورسٹی، مظفر پور کے شعبۂ فارسی میں بحیثیت ریڈر آپ کا انتخاب عمل میں آیا۔ جہاں ترقی کرتے ہوئے آپ پروفیسر اور صدر شعبہ کے عہدے پر فائز ہوئے۔ بالآخر ایک طویل، کامیاب اور علمی اعتبار سے نہایت زرخیز ملازمت

سے آپ دسمبر ۱۹۹۷ء میں سبکدوش ہوئے۔ دوران ملازمت تقریباً دو درجن سے زیادہ طلبا آپ کے زیرنگرانی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی سند سے سرفراز ہوئے۔ سبکدوشی کے بعد آپ نے مظفر پور کو خیر باد کہا اور پٹنہ کو اپنا مسکن بنایا۔ جہاں ۲۰ ستمبر ۲۰۱۸ء کو آپ ایک ایسے سفر پر روانہ ہوئے جہاں جاتے تو سب ہیں مگر واپس کوئی نہیں آتا ؎

پہنچے گور کنارے ہم بس غم دوراں ہارے ہم

پروفیسر غلام مجتبیٰ صاحب کے علمی آثار میں ان کی مستقل کتابیں بھی ہیں اور تحقیقی وتنقیدی مقالات بھی جو مختلف رسائل میں اور مختلف اوقات میں شائع ہوئے۔ اردو اور فارسی زبانوں میں لکھی ہوئی ان کی انہی کتابوں اور مقالات کا تعارف اس تحریر کا مقصد و مدعا ہے۔

کتابیں

۱۔ حکیم شیخ حسین شہرت شیرازی: احوال و آثار

حکیم شیخ حسین شہرت شیرازی کے احوال و آثار پر یہ کتاب دراصل غلام مجتبیٰ صاحب کا وہ تحقیقی مقالہ ہے جس پر پٹنہ یونیورسٹی نے انہیں ڈاکٹر آف لٹریچر (ڈی لٹ) کی سند سے سرفراز کیا تھا۔ خدا بخش لائبریری نے اسے کتابی شکل میں شائع کیا ہے اور ''حرفہائے گفتنی'' کے عنوان سے خدا بخش لائبریری کے سابق ڈائرکٹر جناب حبیب الرحمٰن چغانی نے اس کتاب کا دیباچہ لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا بخش لائبریری میں محفوظ شہرت شیرازی کے قلمی دیوان کو اساسی نسخہ قرار دے کر مجتبیٰ صاحب نے اس کی تدوین کی ہے اور اسی وجہ سے اس کتاب کو لائبریری کے اشاعتی منصوبے میں شامل کیا گیا۔ چغانی صاحب کے ''حرفہائے گفتنی'' کے بعد خود مجتبیٰ صاحب نے اپنے پیشگفتار میں خدا بخش لائبریری کے اُس مخطوطہ کا مکمل صوری تعارف کرایا ہے جس کو بنیاد بنانے اور دیگر قلمی نسخوں سے موازنہ کرنے کے بعد انہوں نے اس دیوان کی تدوین کی۔ نسخۂ خدا بخش کو ''قدیم ترین و مکمل ترین'' قرار دیتے ہوئے انہوں نے خاص طور پر اس بات کی وضاحت کی ہے کہ موازنہ کے دوران انہوں نے صرف دو اوین پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مختلف تذکروں مثلاً 'مجمع النفائس' اور 'سفینۂ خوشگو' وغیرہ میں درج شہرت کے اشعار کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ اس سے مجتبیٰ صاحب کی ایماندارانہ تحقیق کے ساتھ ان کی محنت اور عرق ریزی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں شہرت شیرازی کے دور کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی حالات کو بیان کیا گیا ہے۔ شہرت شیرازی، چونکہ اورنگزیب عالمگیر کے عہد میں ہندوستان میں وارد ہوا تھا جو سیاسی اعتبار سے نہایت پُر آشوب دور تھا۔ اس عہد کے پس منظر اور اُس دور کے حالات کی عکاسی کرتے ہوئے مجتبیٰ صاحب نے مغلیہ خاندان کی آویزش اور جنگ و جدال کی پوری تاریخ اجمالی طور پر بیان کر دی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ادبی تاریخ کے ساتھ

سیاسی تاریخ پر بھی وہ نہ صرف گہری نگاہ رکھتے تھے بلکہ ادب وشعر کی تفہیم وتعبیر کے لئے سیاسی اثرات کے تجزیہ کو بھی وہ لازمی سمجھتے تھے۔

دوسرے باب میں غلام مجتبیٰ صاحب نے اُس عہد کے تہذیب وتمدن، فنون لطیفہ اور تعلیم وتدریس کے ساتھ خاص طور پر ادب وشاعری کی صورتحال سے بحث کی ہے۔ ''نحوۂ فرھنگی وادبی'' کے زیرعنوان لکھے گئے اس باب میں انہوں نے مغلوں کی تعمیرات کا ذکر کرنے کے ساتھ تعلیم وتدریس اور آموزش وپرورش سے ان کے شغف اور ادب وشعر سے ان کی دلچسپی کو بھی بیان کیا ہے۔خاص طور پر عہد اورنگزیب کے شعرا وشاعرات کا ذکر تے ہوئے انہوں نے اس مفروضہ کی نفی کی ہے کہ اورنگزیب کے دربار سے ملک الشعرا کا منصب ختم ہونے کے بعد شعروشاعری کا رواج بھی ختم ہوگیا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ ملکی امور میں مصروف ہونے کے سبب اورنگزیب کو شعروشاعری کی طرف توجہ دینے کی فرصت کم ملی لیکن اسے شاعری سے دلچسپی تھی جس کا ثبوت ''رقعات عالمگیری'' میں برجستہ اور برمحل اشعار کے استعمال سے ملتا ہے۔اس باب میں مجتبیٰ صاحب نے اورنگزیب سے لے کر محمد شاہ کے عہد تک کی فارسی شاعری کے ارتقا کا عہد بہ عہد جائزہ لیا ہے اور ایک ادبی مؤرخ کا فریضہ انجام دیتے ہوئے ان ادوار کے شعرا کے تذکرے کے ساتھ ان کی شاعری کا پس منظر بھی بیان کیا ہے۔

تیسرا باب ''احوال زندگانی حکیم شیخ حسین شہرت شیرازی'' کے عنوان سے قلمبند کیا گیا ہے اور جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے، اس باب میں مصنف نے شہرت شیرازی کی مفصل سوانح حیات بیان کی ہے جس میں شیرازی کی ہندوستان آمد سے لے کر یہاں اس کی وفات تک کے واقعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔اس سوانح کی ترتیب میں مجتبیٰ صاحب کی محنت وکاوش قابل داد ہے کہ شہرت کے حالات بہت کم لکھے گئے تھے اور وہ بھی آسانی سے دستیاب نہیں تھے۔مجتبیٰ صاحب نے اُس دور کے معروف اور غیر معروف تذکروں کے ساتھ دیگر منابع سے بھی استفادہ کیا اور نہ صرف شہرت کی سوانح ترتیب دی بلکہ اس کے اخلاق وعادات اور مشاہدات ومعتقدات کے بیان کے ساتھ ہندوستان کے تئیں اس کے نظریات کی بھی وضاحت کی ہے۔سوانح کے اس حصّہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ شہرت شیرازی نہایت خلیق اور مہمان نواز تھا۔یہی وجہ ہے کہ اس کے ہمعصر شعرا اور تذکرہ نگار اکثر شیرازی سے ملاقات کرتے تھے۔وہ انسان دوست تھا اور عام لوگوں کی فلاح وبہبود کے لئے ہمیشہ کمربستہ رہتا تھا۔چنانچہ یہی وجہ ہے کہ وہ اورنگزیب کے اخلاف کے درمیان جنگ وجدال اور مغلیہ سلطنت کے زوال وانتشار سے بیحد افسردہ تھا، جس کے اشارے اس کے اشعار میں ملتے ہیں۔ایسے ہی اشعار کے بارے میں مجتبیٰ صاحب کی رائے ہے کہ اُس عہد کے تاریخی حالات وواقعات کو جاننے کیلئے ان اشعار کا مطالعہ بہت ضروری ہے :

''مطالعۂ اشعارش بہ ایں عنوان برای دانستن احوال تاریخی آنزمان خیلی ضروری است۔'' (ص ۴۱)

چوتھے باب میں شہرت شیرازی کے ہمعصر شعرا کا ذکر ہے جس میں حاجی اسلم سالم، میر زمان راسخ، مرزا عبد الغنی بیگ، مرزا عبدالقادر بیدل، لالہ حکیم چندندرت، محمد افضل سرخوش اور صلابت خان سید شامل ہیں۔ ان تمام شعرا کے مفصل حالات زندگی بیان کرنے کے بعد مصنف نے ان کی شاعرانہ خصوصیات اور فنی امتیازات سے بحث کی ہے، جس سے اُس عہد کا مکمل شعری منظر نامہ ابھر کر سامنے آ گیا ہے۔

پانچواں اور آخری باب شاید اس کتاب کا سب سے اہم باب ہے جس میں مصنف نے فکری و فنی اعتبار سے شہرت کی شاعری کا مفصل اور ناقدانہ جائزہ لیا ہے اور معاصر فارسی شاعری میں اس کا مقام متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔'' زبان و شعر'' کے زیر عنوان لکھے گئے اس باب میں مصنف نے شہرت کی غزلگوئی کی تحسین کی ہے اور اس کے تجربیات عشق، شدت احساس، تسلسل مضامین اور روانی بیان کی طرف خاص طور پر اشارہ کیا ہے۔ شہرت کو اپنے شاعرانہ مرتبے اور اپنی امتیازی حیثیت کا احساس تھا اور یہی احساس اس کی شاعری میں انانیت اور تعلّی کے اظہار کا موجب بھی بنا۔ مجتبیٰ صاحب نے آخر میں اس کا ذکر کرتے ہوئے اس کے جواز کو بھی ثابت کیا ہے کہ اُس زمانے کے معروف شعرا میں یہ رجحان عام تھا۔ پانچویں باب کے اختتام کے بعد ''برگزیدہ اشعار شہرت'' کے عنوان سے شہرت کی غزلوں کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ غلام مجتبیٰ صاحب نے مکمل دیوان کی تدوین کی تھی۔ شاید ضخامت کے سبب مکمل دیوان شائع نہ کر کے خدا بخش لائبریری نے صرف انتخاب کلام کی اشاعت پر اکتفا کیا۔ لیکن خانہ فرہنگ ایران، نئی دہلی نے مجتبیٰ صاحب کی اس مکمل تھیسس کو شائع کر کے اس کمی کی تلافی کر دی ہے۔ اتنا ہی نہیں، اس پر ڈاکٹر علی رضا قزوہ نے مفصل دیباچہ لکھ کر اس کتاب کی اہمیت اور افادیت میں بیحد اضافہ کر دیا ہے۔ اپنے طویل دیباچے میں، جس کا شاعرانہ عنوان قزوہ نے 'شاعری در آرزوی اصفہان' دیا ہے، انہوں نے شہرت شیرازی کو 'مظلومان ادب فارسی' کے زمرے میں رکھتے ہوئے اس بات پر اظہار افسوس کیا ہے کہ اس عظیم شاعر کا اعتراف جیسا ہونا چاہئے تھا، نہ ہو سکا۔ اور اس کے دو اسباب انہوں نے بیان کئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان کے معاصر شاعر مرزا عبدالقادر بیدل کے سامنے ان کی شہرت ماند پڑ گئی اور دوسرے یہ کہ درباری حکیم ہونے کے سبب، ان کی شاعری کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول نہ ہو سکی۔ ان دو اسباب کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی رہی کہ وہ، ہندوستان آنے میں کلیم، صائب اور سلیم وغیرہ سے پیچھے رہ گئے۔ وہ اورنگزیب کے زمانے میں ہندوستان وارد ہوئے جب فارسی شاعری، دربار کی سرپرستی سے محروم ہو چکی تھی۔ حالانکہ ان کی شاعری اپنے کیف و کم کے اعتبار سے صائب اور کلیم سے کمتر نہیں ہے۔ قزوہ نے لکھا ہے :

''برخی از بیت ھائی این شاعر (شہرت شیرازی) از شعر بزرگاں چوں صائب و کلیم ھیچ کم ندارد۔'' (ص ۲۵)

اپنے طویل مقالے میں قزوہ نے فکری وفنی اعتبار سے گویا اس شاعر کو از سرنو دریافت کیا ہے اور اس کے ایسے امتیازات کو سامنے لائے ہیں جن کا انکشاف اس سے پہلے نہ ہوسکا تھا اور خود غلام مجتبیٰ صاحب نے بھی اس کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے پیشگفتار میں لکھا ہے کہ علی رضا قزوہ نے تمام اشعار کو بدقت تمام کئی بار مطالعہ کیا، ان کی تحریر کی اصلاح کی اور اس تحقیقی کام کو، جس پر تیس برس سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا، ایک نئی شکل میں اہل ادب کے سامنے پیش کیا۔ مجتبیٰ صاحب کے الفاظ یہ ہیں :

''بہ طور خاص از مدیر محترم مرکز تحقیقات فارسی، دہلی نو آقائی دکتر علی رضا قزوہ سپاسگزارم کہ با حوصلہ و دقت تمام اشعار را چندیں بار خواندند و بسیاری از کاستی ہا را اصلاح کردند و پژوھشی را کہ بیش از سہ دھہ از انجام آن می گذشت، بہ شکل بایستہ و پیراستہ در دسترس اہل فرھنگ و ادب قرار دادند۔ اینک این کتاب با ویرایش نوین پیش روی شماست۔'' (ص ۳۵)

لیکن ان تمام اعترافات کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ قزوہ نے اپنے تجزیاتی مطالعے کی بنیاد، غلام مجتبیٰ صاحب کے تنقیدی مباحث پر ہی رکھی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ قزوہ کی تنقیدی نظر اور ان کے حسن بیان نے اس میں ایک قسم کی جدت اور ندرت پیدا کردی ہے۔

۲۔ مشاہدات مجتبیٰ از سفر ایران با ہمراہ ہشت مقالہ

ڈاکٹر غلام مجتبیٰ صاحب کی یہ کتاب، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، ایران کے سیر وسفر اور وہاں کے مشاہدات پر مبنی ایک منظوم سفرنامہ ہے۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں فارسی زبان میں لکھے ہوئے ڈاکٹر صاحب کے آٹھ تحقیقی وتنقیدی مقالات بھی شامل ہیں۔ مصنف نے 'حرف آغاز' میں اس سفر کے آغاز کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ ۱۹۹۴ء میں خانہ فرھنگ ایران، نئی دہلی کے ایک پروگرام میں شرکت کے لئے وہاں تشریف لے گئے تھے، جس کے اختتام پر خانہ فرہنگ کے ذمہ داروں نے چند اساتذہ کو، انٹرویو کرنے کے بعد، ایران کے سفر کے لئے منتخب کیا جس میں مصنف بھی شامل تھے۔ مرحوم ڈاکٹر عبدالودود اظہر دہلوی کی قیادت میں یہ قافلہ ۲۰ رمئی ۱۹۹۴ء کو تہران کے لئے روانہ ہوا جہاں ان لوگوں کا پُر جوش استقبال کیا گیا۔ اپنے دوران قیام انہوں نے ایران کے مختلف شہروں کی سیاحت کی اور ایرانی اساتذہ سے استفادہ بھی کیا۔ یہ کتاب اسی سیاحت کی منظوم روداد پر مشتمل ہے، جس کا آغاز حمد ومناجات، نعت پاک اور امام خمینی کی مدح سے ہوتا ہے۔ بعد ازاں تہران، مشہد، قم اور سعد آباد وغیرہ کی دلکشی اور ان شہروں کی خصوصیات بیان کرنے کے بعد وہ اُن ایرانی اساتذہ کی خدمت میں ہدیہ تبریک وعقیدت پیش کرتے ہیں جن سے انہوں نے استفادہ کیا تھا۔ ان اساتذہ میں

آقای سید جعفر شہیدی، آقای سید مجتبیٰ موسوی اور آقای گیلانی نژاد شامل ہیں۔

اس منظوم سفرنامہ سے مصنف کی فارسی زبان پر قدرت اور ان کی شاعرانہ مہارت کا ثبوت ضرور ملتا ہے، لیکن دوسری طرف تشنگی کا احساس بھی ہوتا ہے کہ شعری پابندیوں کے سبب وہ بہت زیادہ اطلاعات فراہم نہیں کر سکے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصنف کا منشا، سفرنامہ لکھنا تھا بھی نہیں۔ وہ صرف نظم میں اپنے تاثرات بیان کرنا چاہتے تھے اور اسی لئے اس کتاب کو سفرنامہ کہنے میں بھی تامل ہوتا ہے۔ اس لئے کہ سفرنامہ کی صنفی خصوصیات اس کتاب میں مفقود ہیں۔ مثلاً ایران کے شہروں تہران، مشہد، نیشاپور اور قم وغیرہ کے بیان میں اپنے منظوم تاثرات کو انہوں نے وہاں کے دلکش مناظر ،خوبصورت باغات اور تاریخی آثار کے ذکر تک محدود رکھا ہے۔ یہ اشعار فارسی کی کلاسیکی شاعری کا بہترین نمونہ تو ہو سکتے ہیں لیکن انفرادی طور پر کوئی ایسی معلومات فراہم نہیں کرتے جس کے سبب اس کتاب کو، ایران کے دیگر سفرناموں کے درمیان، کوئی امتیاز حاصل ہو سکے۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ مصنف کے ان منظوم تاثرات میں احساس کی لطافت اور جذبے کی نزاکت کھل کر سامنے آئی ہے۔ جس کا ثبوت ان کی نظم 'خانم ہائی ایران' ہے ؎

روی شان از چادر مشکی ہویدا ہر کجا ماہ کامل بود گوی در میان ابرہا

مصنف اپنے تاثرات میں کہیں پر بھی تنقیدی نہیں ہوتے۔ بلکہ اپنے نیازمندانہ جذبات کو گلہائے عقیدت کے طور پر ایرانی اساتذہ پر نثار کرتے ہیں۔ چنانچہ اس منظوم سفرنامے کی آخری نظم کا عنوان ہی ہے 'گلہائی عقیدت' جس میں وہ اپنی احسانمندی کا اعتراف یوں کرتے ہیں ؎

ما ہمہ استاد ہندی بہرہ ہا برداشتیم علم و عرفان و تصوف از شما آموختیم
زیر بار منت و احسان ما ئیم از شما دولت علم و ادب حاصل کنا نیم از شما

اس کتاب کے مطالعہ کے بعد یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ اگر یہ نثر میں لکھی جاتی تو زیادہ معلوماتی ہوتی اور فارسی زبان و ادب کے ساتھ ایران سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے زیادہ مفید بھی۔ تاہم اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ یہ کتاب افادیت سے خالی ہے۔ سفرنامہ ختم ہونے کے بعد اس کتاب کے دوسرے حصّے میں مصنف کے لکھے ہوئے فارسی زبان میں آٹھ مقالات کی شمولیت نے اس کتاب کی قدر و قیمت اور وقعت میں اضافہ کرنے کے ساتھ اس کو تنوع بھی بخشا ہے، کہ ان مقالات میں مصنف نے ایران و ہند کے فارسی نظم و نثر دونوں کا احاطہ کر لیا ہے۔ ایرانی شعرا میں درویش حسین والہ ہروی کے ساتھ سعدی اور خمینی بھی شامل ہیں۔ امام خمینی کی رباعیات پر مصنف نے ایک مقالہ لکھ کر امام کو بحیثیت شاعر متعارف کرایا ہے۔ ہندوستانی شعرا میں بیدل اور فیضی وغیرہ کو انہوں نے اپنا موضوع بنایا ہے۔ جبکہ شیخ شرف الدّین یحیٰ منیری کے مکتوبات پر ان کا ایک مقالہ، فارسی نثر پر بھی ان کی نگاہ کا پتہ دیتا ہے۔

اس سلسلہ کا پہلا مضمون انہوں نے بانی کتبخانہ خدا بخش، خان بہادر خدا بخش خاں مرحوم کی اہلیہ جمیلہ خاتون کی شخصیت اوران کے شعری کارناموں پر قلم بند فرمایا ہے۔لیکن مضمون کے ابتدائی حصّے میں کتابخانہ خدا بخش کے تشکیلی دور کے پس منظر کے ساتھ خدا بخش خاں کے خانوادہ کی تفصیلات بھی بیان کی ہیں۔،جس کے سبب اس مضمون کا کینواس وسیع ہوگیا ہےاور یہ اس لئے ضروری بھی تھا کہ ان تمام عوامل سے مل کر ہی جمیلہ خاتون کی شعری شخصیت کی تشکیل وتعمیر ہوئی ہے ۔ بنیادی طور پر یہ مضمون تنقیدی نوعیت کا ہے لیکن اس کی تحقیقی حیثیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس میں انہوں نے جمیلہ خاتون کی ولدیت کا مسئلہ بھی اٹھایا ہے جس میں محققین کے درمیان اختلاف رائے ہے۔بعض محققین جمیلہ خاتون کے والد کا نام مولوی یحییٰ علی بتاتے ہیں جبکہ بعض مولوی کبیر الدّین قرار دیتے ہیں۔غلام مجتبیٰ صاحب ان اختلاف آرا کو نقل تو کرتے ہیں تاہم وہ اپنا فیصلہ سنانے سے گریز کرتے ہیں۔مقالہ کے آخر میں مجتبیٰ صاحب نے جمیلہ خاتون کی غزلوں اور نظموں پر اظہار خیال کرتے ہوئے انہیں ایک 'سادہ زبان' اور 'ابتذال سے پاک' شاعرہ قرار دیا ہے۔اور نمونے کے طور پر ان کے جو اشعار نقل کئے ہیں، اُن سے ان کے دعوا کی تصدیق بھی ہوتی ہے۔اس مضمون کی وقعت میں جس چیز نے خاصا اضافہ کیا ہے وہ شاد عظیم آبادی کے نام، جمیلہ خاتون کا وہ خط ہے جس میں انہوں نے ان سے استفادہ کے لئے اپنی احسانمندی کا اعتراف کیا ہے۔غلام مجتبیٰ صاحب کا یہ مضمون، جمیلہ خاتون کی شخصیت اوران کی شاعری کے ساتھ، خدا بخش لائبریری کے تاریخی پس منظر کا بھی ایک اہم حوالہ ہے۔

بہار ہی کے حوالے سے ان کا دوسرا اہم مضمون اس کتاب میں شامل ہے جس کا عنوان ہے ''فارسی زبان وادب در منطقۂ بیہار''۔اس مضمون میں بھی انہوں نے اپنے تحقیقی مزاج ورویہ کے مطابق اصل موضوع پر آنے سے قبل، تمہید کے طور پر، ہندوستان میں فارسی زبان وادب کی ابتدا اور ترویج واشاعت پر مختصراً روشنی ڈالتے ہوئے اُن خانقاہوں اور صوفیہ کرام کی خدمات کا ذکر کیا ہے جنہوں نے فارسی زبان وادب کے ارتقا میں خاصا اہم کردار ادا کیا ہے۔بہار کے تناظر میں گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے شیخ شرف الدّین احمد یحییٰ منیری، حضرت احمد چرم پوش، حضرت مظفر شمس بلخی، شیخ احمد لنگر دریا ،مخدوم شاہ شعیب (مصنف مناقب الاصفیا) اور حضرت نوشہ توحید کی شخصیات اوران کے علمی کارناموں پر روشنی ڈالی ہے۔ لیکن یہ مضمون کا ایک رخ ہے۔اس کا دوسرا اہم رخ یہ ہے کہ اس میں انہوں نے شمالی بہار میں فارسی زبان وادب کے فروغ کا ذکر کرتے ہوئے بعض ایسے غیر معروف صوفیہ اوران کی خانقاہوں کے حوالے سے گفتگو کی ہے جن کے بارے میں لوگوں کو بہت کم واقفیت ہے۔ان شہروں میں حاجی پور (ویشالی) بھاگلپور، سارن اور سیوان وغیرہ کے شعرا اور صوفیہ شامل ہیں۔خاص بات یہ ہے کہ ان شہروں پر گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے ان کے تاریخی پس منظر کا بھی جائزہ لیا ہے اور خالص فارسی منابع کے حوالے سے انہوں نے تحقیقی انکشافات بھی کئے ہیں۔شمالی بہار میں فارسی ادب کے فروغ میں میر

ملک فتح اللہ کی خدمات کا بھی انہوں نے ذکر کیا ہے جن کے مدرسہ میں دہلی کے طلبا بھی استفادہ کرتے تھے۔میر ملک فتح اللہ کی وفات کے بعد سید حسن دانشمند نے درس وتدریس کی ذمہ داری سنبھالی۔واضح رہے کہ یہ وہی سید حسن دانشمند ہیں جن کے جدامجد سید قاسم حاجی پوری فارسی کے صاحب دیوان شاعر تھے۔ ڈاکٹر مجتبیٰ صاحب نے بھاگلپور کو ایک بڑا ادبی مرکز قرار دیتے ہوئے مخدوم شاہ شہباز قدس سرہ کے کارناموں کا بھی ذکر کیا ہے۔اس مضمون میں تصنیف وتالیف کے حوالے سے گفتگو نہیں کی گئی ہے بلکہ درس وتدریس کے ذریعہ فارسی زبان وادب کے فروغ کا جائزہ لیا گیا ہے اور بہار کے مختلف علاقوں میں مدارس کے قیام اوران کی علمی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اس سلسلہ میں ڈاکٹر مجتبیٰ صاحب نے ان مدارس کے مروجہ نصاب کو بھی مورد مطالعہ قرار دیا ہے۔

معروف ایرانی شاعر درویش حسین والہ ہروی پر مجتبیٰ صاحب اختصاصی حیثیت رکھتے ہیں۔اس کے احوال وافکار پر مشتمل ایک اہم مضمون اس کتاب میں شامل ہے۔ عہد جہانگیری میں ہرات سے ہجرت کر کے ہندوستان آنے والے ممتاز شاعر درویش حسین والہ ہروی کے تعارف وتجزیہ پر مشتمل،غلام مجتبیٰ صاحب کا یہ مضمون بہت محنت اور تلاش وجستجو کے بعد سپرد قلم کیا گیا ہے۔اس لئے کہ اب تک کی اطلاع کے مطابق ،اس کے دیوان کی اشاعت بھی نہیں ہوئی ہے اور تذکروں میں بھی درویش کے حالات بہت کم دستیاب ہیں۔اس کے معاصرین کے بیانات اوراس کے دیوان اشعار کے کچھ داخلی شواہد کی بنیاد پر مضمون نگار نے درویش حسین کے حالات زندگی کو ترتیب دیا ہے، جس میں اس کے نام و تخلّص ،تاریخ وجائے پیدائش اوراس کے آباواجداد کے تذکرے کے ساتھ اس کی تعلیم وتربیت کا بھی مفصّل بیان ہے۔ آخر میں مصنف نے اس کے شاعرانہ مقام ومرتبے کا جائزہ لیا ہے۔خاص بات یہ ہے کہ مجتبیٰ صاحب نے نہایت اہم مراجع ومصادر کے حوالے سے یہ تمام تفصیلات بیان کی ہیں۔ان میں پہلا مرجع تو خود اس کے دیوان کے اشعار ہیں اور دیگر مراجع میں بیدل کی کتاب 'چہار عنصر' اور اشرف ماژندرانی کے مکاتیب ہیں۔درویش حسین کی سوانح حیات کے بیان میں مجتبیٰ صاحب نے ان تمام مصادر سے شواہد پیش کئے ہیں اوراس طرح تذکروں میں اس کے حالات کے فقدان کی گویا تلافی کر دی ہے۔

فارسی شعروادب میں درویش حسین والہ ہروی کے امتیاز ومقام کا تجزیہ کرتے ہوئے مضمون نگار نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ اگر چہ اس شاعر کا زمانہ تکلف وتصنّع کا زمانہ تھا لیکن اپنے زمانے کی روش سے انحراف کرتے ہوئے اس نے سادگی کو ترجیح دی ہے اور سبک ہندی کی پیچیدگی سے پرہیز کیا ہے۔اس سلسلہ میں انہوں نے بیدل سے اس کی ملاقات کا حال بھی لکھا ہے جب بیدل والہ کے اشعار سن کر بیحد متاثر ہوئے تھے اوراس کی تحسین بھی کی تھی۔مجتبیٰ صاحب نے والہ کے اشعار کے فنی پہلوؤں سے بحث کرتے ہوئے اس کے یہاں نادر تشبیہات واستعارات کے استعمال اور با

محاورہ ضرب الامثال کی نشاندہی بھی ہے۔ان کی یہ نتیجہ خیزی صحیح ہے کہ ان سب عوامل کے سبب والہ کی شاعری انفرادی جہت کی حامل بن گئی ہے۔درویش حسین والہ ہروی کی شخصیت اور شاعری کا غالباً یہ پہلا مفصّل تعارف وتجزیہ ہے اور اسی لئے اسے غلام مجتبیٰ صاحب کی اولیات میں شمار کرنا چاہئے۔واضح رہے کہ یہ مضمون خدا بخش لائبریری جرنل کے شمارہ نمبر ۱۲۵ (جولائی۔ستمبر ۲۰۰۱ء) میں بھی شائع ہو چکا ہے اور مجتبیٰ صاحب کے مجموعۂ مقالات ''گنجینۂ ادب'' میں بھی شامل ہے۔اسی شاعر کی شخصیت اور اس کے آثار پر انہوں نے ڈاکٹر محمد صدیق صاحب کے زیرنگرانی تحقیقی مقالہ لکھ کر پٹنہ یونیورسیٹی سے ڈاکٹر آف فلاسفی کی سند حاصل کی تھی۔

کتاب میں شامل ایک مضمون میں غلام مجتبیٰ صاحب نے شیخ سعدی کے فارسی قصائد کو موضوع بنایا ہے، جس کا عنوان ہے ''قصیدہ فارسی سعدی'' اس حقیقت کے باوجود کہ شیخ سعدی کو بحیثیت قصیدہ نگار شہرت حاصل نہیں ہے، ان کے قصائد کی اہمیت وانفرادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔دراصل سعدی، مبالغہ آمیز مدح سرائی کو پسند نہیں کرتے تھے اور ان کی غیور طبیعت شاہان زمانہ کی بیجا مدح وتوصیف سے نفور تھی۔لہذا وہ مزاجاً قصیدہ نگاری کی طرف مائل نہیں ہوئے۔اور اگر کبھی انہوں نے تقاضائے زمانہ کے تحت کچھ کہا بھی تو اس میں بھی انہوں نے مدح سرائی کم اور نصیحت آمیز باتیں زیادہ کیں۔یہی قصائد سعدی کی وہ انفرادیت ہے جس کی طرف مجتبیٰ صاحب نے خاص طور پر اشارہ کیا ہے۔اس مضمون کو لکھنے میں مجتبیٰ صاحب نے ایران کے جن فارسی منابع سے استفادہ کیا ہے، انہیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ شیخ سعدی کے قصائد کو بھی ایرانی ناقدین نے اتنی ہی توجہ کے ساتھ موضوع بحث بنایا ہے، جتنی توجہ سے انہوں نے اس کی غزل پر گفتگو کی ہے۔شیخ سعدی کے حوالے سے یہ مضمون منفرد اور لیک سے ہٹ کر ہے کہ اس میں پہلی بار سعدی ایک ناصح کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں اور نصیحت بھی ایسے جابر بادشاہوں کو کہ جن کے سامنے لب کشائی کی جرأت بھی لوگ مشکل سے کرتے تھے۔غلام مجتبیٰ صاحب نے آخر میں بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ایک ایسے زمانے میں جب قصیدہ نگاری مبالغہ آرائی اور کذب بیانی کی علامت بن کر رہ گئی تھی، شیخ سعدی نے اس صنف میں انقلاب لاتے ہوئے اس کو ایک مہذب اور پاکیزہ پند وموعظت کا حوالہ بنا دیا۔

فیضی کے حوالے سے غلام مجتبیٰ صاحب کا ایک اہم مضمون بھی اس کتاب کی زینت ہے۔''محیط ہندی در شعر فیضی'' کے زیرعنوان لکھے گئے اس مضمون میں فیضی کی ایک نئی جہت سامنے آئی ہے اور وہ ہے اس کے کلام میں ہندوستان اور ہندوستانی ماحول کی جھلک۔ظاہر ہے اس حوالے سے، فیضی سے قبل، امیر خسرو کی شاعری پر بھی گفتگو ہوتی رہی ہے، جن کے یہاں ہندوستانیت کا عکس نمایاں ہے۔چنانچہ مجتبیٰ صاحب نے فیضی پر آنے سے قبل، اس حوالے سے امیر خسرو کی شاعری پر بھی گفتگو کی ہے اور خسرو سے فیضی کی اثر پذیری کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔بعید نہیں اگر فیضی کا یہ رجحان امیر

خسرو سے تاثر ہی کا نتیجہ ہو۔اس مضمون سے فیضی کی مکمل زندگی بھی سامنے آ گئی ہے۔اکبر کی درباداری، سیر وسیاحت اور بادشاہ کی طرف سے تفویض کی گئی سفارتی ذمہ داریوں کی ادائیگی وغیرہ۔ان سب کی روداد جب وہ اپنی شاعری میں بیان کرتا ہے تو ہندوستان کا رزم و بزم دونوں کا عکس نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے۔فیضی کے حوالے سے ہندوستانیت کا ذکر ہو اور اس کی مثنوی 'نل دمن' کا ذکر نہ آئے، یہ ممکن ہی نہیں اور سچ یہ ہے کہ اس قصّہ نے اور اس کے ساتھ ہندوستانی اساطیر کے فارسی تراجم نے، ہندوستانیت کے حوالے سے، فیضی کو گویا اختصاص کا درجہ دے دیا ہے۔مجتبیٰ صاحب نے تفصیل سے ان ترجموں کا ذکر کیا ہے اور اس کے پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے ان سے اکبر کی والہانہ دلچسپی کو بھی اجاگر کیا ہے۔اس سلسلے میں وہ فیضی کی کچھ ایسی تخلیقات تک بھی پہنچے ہیں جو،اب نایاب ہیں۔مثلاً فتح گجرات کے حوالے سے فیضی کی مثنوی۔ بقول مجتبیٰ صاحب : ''فیضی مربوط بہ فتح گجرات کہ اکبر حاصل نمود یک مثنوی گفت کہ حالا ناپیداست۔'' (ص ۸۵) مجتبیٰ صاحب نے اس کے کچھ اشعار بھی نقل کئے ہیں۔واقعہ یہ ہے کہ فیضی کے حوالے سے اس مضمون کو، ہندوستان کی تاریخ کے ایک مخصوص دور کا بیانیہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔اور خاص بات یہ ہے کہ یہ بیانیہ مانگے کا اجالا نہیں ہے بلکہ فیضی نے آنکھوں دیکھا حال بیان کیا ہے، جس سے فیضی کو تاریخی استناد کا درجہ بھی حاصل ہو گیا ہے۔

غلام مجتبیٰ صاحب مضمون کے انتخاب میں خاصے جدت پسند ہیں۔یا وہ نئے موضوعات کی تلاش میں رہتے ہیں یا پھر پرانے موضوع میں کوئی نیا پہلو نکالنے کی سعی کرتے ہیں۔اسی کوشش کا نتیجہ ان کا ایک نادر مضمون امام خمینی کی رباعیات کے حوالے سے ہے جس کا عنوان ہے'' مشخصات رباعیات حضرت امام خمینیؒ'' اس سلسلے میں مجتبیٰ صاحب نے امام کی ان رباعیوں کی خاص طور پر نشاندہی کی ہے جو راجع بہ معبود حقیقی ہیں اور عشق حقیقی کے جذبات سے معمور ہیں۔اس ذیل میں کچھ ایسی رباعیوں کا بھی ذکر آیا ہے جو نفی ذات کا پیغام دیتی ہیں کہ اس کے بغیر ذات خداوندی سے ارتباط ممکن ہی نہیں۔ تاہم ایسی بات بھی نہیں کہ حضرت امام کی رباعیاں یکرخی اور عصری حسّیت سے بالکل خالی ہیں۔حضرت امام نے رضا شاہ کے ظلم و ستم کا بھی ذکر کیا ہے اور ایک ایسی صبح روشن کی آرزو کی ہے جب جمہوری اسلامی ایران کو اس ظلم سے نجات ملے گی اور وہ دن گویا عید کا دن ہوگا ؎

جمہوری اسلامی ما جاویداست دشمن زحیات خود ناامیداست
آنروز کہ عالم زستمگر خالیست ماراو ہمہ ستم کشاں راعیداست

رضا شاہ کے ساتھ عراق کے سابق صدر صدام حسین کی مذمت اور نکوہش میں بھی ان کی رباعیاں حالات حاضرہ پر ان کے فکر و نظر کا اشاریہ ہیں۔غلام مجتبیٰ صاحب کا یہ مضمون حضرت امام کی ادبی حیثیت بھی متعین کرتا ہے اور ان کی رباعیوں کے صد رنگ پہلوؤں کو بھی ہمارے سامنے لاتا ہے۔

کتاب میں شامل غلام مجتبیٰ صاحب کا آخری مضمون مرزا عبدالقادر بیدل کی حیات اوراس کے کارناموں کے حوالے سے ہے۔لیکن صرف تین صفحات پر مشتمل اس مختصر سے مضمون میں بیدل کی حیات اور کارناموں کی صرف جھلک ہی پیش کی جاسکتی تھی جو، مجتبیٰ صاحب نے کی بھی ہے۔لیکن تشنگی کا احساس ضرور ہوتا ہے کہ بیدل جیسی عبقری شخصیت کا احاطہ ایک مکمل کتاب یا کم ازکم ایک مفصل مضمون کے بغیر تو ممکن ہی نہیں۔

۳۔ سید قاسم حاجی پوری :ایک تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ مع غزلیات قاسم

سید قاسم حاجی پوری، جیسا کہ ان کے حالات زندگی سے معلوم ہوتا ہے، اپنے وقت کے جید عالم دین، فارسی کے باکمال شاعر اور عرفان وتصوف کی بلند منزلوں پر فائز ایک برگزیدہ صوفی تھے۔ان کا نسبی تعلق ایک معروف صوفی خانوادے سے تھا۔عرفان وتصوف کی روحانی وراثت کے ساتھ شعروشاعری کی ادبی وراثت بھی انہیں اپنے خانوادے ہی سے حاصل ہوئی تھی۔ان کے جدّ گرامی سید حسن دانشمند اسی خانوادے کے ایک معروف صوفی بزرگ تھے۔سید قاسم حاجی پوری کے فارسی دیوان کا منحصر بہ فرد قلمی نسخہ، کتب خانہ پیر دمڑیا بھاگلپور میں موجود تھا۔ڈاکٹر غلام مجتبیٰ صاحب نے اس نسخہ کی دستیابی کا ذکر کرتے ہوئے کتاب کے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ سید قاسم حاجی پوری کی علمی جلالت، شاعرانہ ذوق اور اپنے وطن کی نسبت کو دیکھتے ہوئے انہوں نے، واحد نسخہ ہونے کے باوجود، اس دیوان کی تدوین واشاعت کا فیصلہ کیا۔اور خوش قسمتی سے ان کے حالات زندگی بھی ڈاکٹر غلام مجتبیٰ صاحب کو، اسی کتبخانے میں موجود فارسی کے دو قلمی کتابوں میں دستیاب بھی ہوگئے جن کے نام بالترتیب یہ ہیں :

۱۔تذکرہ تاج العلماء مع رحلت نامہ (مصنف: خادم حسین) ۲۔حالات خاندان پیر دمڑیا (مصنف: شاہ عنایت حسین)

سید قاسم حاجی پوری کے حالات زندگی اوران کا فارسی دیوان، بہار کے فارسی زبان وادب کی تاریخ کا ایک گمشدہ باب تھا، جس کی بازیافت اس کتاب کی تدوین واشاعت سے ہوئی ہے۔ڈاکٹر غلام مجتبیٰ انصاری، صرف ان کے انتخاب کلام کی اشاعت پر اکتفا کرتے تو بھی اس کتاب کی تاریخی اورادبی حیثیت میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔لیکن انہوں نے اپنے وسیع مطالعہ کی بنیاد پر اتنے ہی پر اکتفا کرنا گوارا نہیں کیا اوراس کتاب کو مزید بامعنی اور جامع بنانے کے لئے اسے مجموعی طور پر پانچ ابواب میں تقسیم کیا۔اس میں پہلا باب بہار میں فارسی زبان وادب کے ارتقا کی اجمالی تاریخ پر مشتمل ہے۔دوسرے باب میں حاجی پور کی تاریخی اور سیاسی اہمیت بیان کی گئی ہے۔تیسرے اور چوتھے باب میں بالترتیب سید قاسم حاجی پوری کے حالات زندگی اوران کے کلام کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔پانچویں اور آخری باب میں مخطوطہ کی نوعیت اور خصوصیت سے بحث کی گئی ہے۔

کتاب کا پہلا باب بعنوان ''بہار میں فارسی زبان وادب'' اپنے مواد واطلاعات کی بنیاد پر ایک کتاب کی حیثیت

رکھتا ہے، جس میں مختلف سلاطین کے ادوار میں بہار میں فارسی زبان وادب کے عہد بہ عہد ارتقا کا جائزہ لیا گیا ہے اور خاص طور پر بہار کے تین اہم ادبی مراکز بہار شریف، حاجی پور اور بھاگلپور کی ادبی خدمات کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے۔ان میں بہار شریف کے حوالے سے، ڈاکٹر غلام مجتبیٰ صاحب کے تجزیہ سے کوئی نئی اطلاع فراہم نہیں ہوتی۔انہوں نے اس حوالے سے شیخ شرف الدّین یحییٰ منیری، شیخ احمد چرم پوش، مولانا مظفر شمس بلخی اور شیخ حسین نوشہ توحید وغیرہ کی علمی وادبی خدمات کا ذکر کیا ہے۔یہی اطلاعات دیگر مصنفین کے یہاں بھی ملتی ہیں۔البتہ حاجی پور اور بھاگلپور کے حوالے سے ڈاکٹر غلام مجتبیٰ صاحب کے بیانات ان کی اولیات میں محسوب ہونے کے لائق ہیں کہ ان ادبی مراکز کے بارے میں ان کی اطلاعات بعد کے ادبی مؤرخین کے لئے منبع ومرجع کی حیثیت رکھتی ہیں۔خاص بات یہ ہے کہ ان مراکز کے تذکرے کے ذیل میں شعر و ادب کے ساتھ، مخدوم پیر دمڑیا اور مخدوم شاہ شہباز قدس سرہ کے خانوادوں کا تاریخی پس منظر بھی سمٹ آیا ہے۔

دوسرا باب، حاجی پور کی تاریخی اور سیاسی اہمیت بھی، معاصر تاریخ اور اس کے فارسی مأخذ پر مصنف کی گہری نظر کا پتہ دیتا ہے۔اس میں لودی، افغان اور سلاطین مغلیہ کے ادوار میں اس شہر کی اقدار و روایات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور مغل بادشاہوں، خاص طور پر جہانگیر کے فرامین کے حوالے سے حاجی پور کے حکمرانوں کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔حاجی پور کے حوالے سے ان مستند تاریخی اطلاعات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ یہ شہر ہر عہد میں تہذیب وتمدن، زبان وادب اور شعر وشاعری کا گہوارہ رہا ہے۔کتاب کا تیسرا باب سید قاسم حاجی پوری کی سوانح حیات پر مشتمل ہے۔اس ذیل میں مصنف نے حضرت پیر دمڑیا کے مقدس خانوادے کے مفصل حالات بھی بیان کئے ہیں۔مصنف کی یہ تحقیقی دریافت اور جزئیات نگاری، نہ صرف سید قاسم حاجی پوری کی سوانح حیات کی تکمیل کرتی ہیں بلکہ اس سے بہار میں عرفان وتصوف کی تاریخ بھی مکمل ہوتی ہے۔

تحقیق کے ساتھ تنقید میں بھی ڈاکٹر غلام مجتبیٰ صاحب کو ید طولیٰ حاصل تھا۔اس کا ثبوت کتاب کے چوتھے باب سے ملتا ہے جو سید قاسم حاجی پوری کی غزلوں کے تنقیدی جائزے پر مشتمل ہے۔وہ بنیادی طور پر ایک صوفی شاعر تھے۔لہٰذا مصنف نے سب سے پہلے ان کی غزلوں میں عرفانی جہات مثلاً فلسفۂ عشق اور وحدۃ الوجود وغیرہ جیسے صوفیانہ عناصر کی نشاندہی کی ہے اور ان حوالوں سے ان کے سینکڑوں اشعار نقل کئے ہیں۔مثلاً ؎

سوی دیدار حق درین عالم قاسما عشق راہبر باشد

اور دلم بر عرش وحدت یافت معراج انالحق گفت چون منصور حلاج

موضوعات سے الگ فنی اعتبار سے بھی ڈاکٹر غلام مجتبیٰ انصاری نے سید قاسم حاجی پوری کی شاعری کا ناقدانہ جائزہ لیا ہے اور تسلسل بیان، تشبیہات واستعارات اور مقامی رنگ وآہنگ کی نشاندہی کے ساتھ ان کے کلام میں غنائی کیفیت پر بھی روشنی

ڈالی ہے۔اور یہ اہم نکتہ دریافت کیا ہے کہ سید قاسم حاجی پوری مسلسل غزل کہنے پر بھی قدرت رکھتے تھے اوران کی بیشتر غزلوں میں ایک ہی خیال یا مضمون کو شروع سے آخر تک بیان کیا گیا ہے۔ یہ سید قاسم حاجی پوری کی انفرادی خصوصیت اور ان کا شاعرانہ امتیاز ہے جس میں بہت کم شعراان کے شریک وسہیم ہونگے۔ مصنف نے صحیح لکھا ہے کہ قصیدہ اور مثنوی میں تو یہ خصوصیت مل جاتی ہے لیکن غزلیہ شاعری میں یہ صفت کمیاب ہے۔اس باب میں انہوں نے سید قاسم کے کلام میں قدما کے اثرات کی بھی نشاندہی کی ہے اور حافظ شیرازی، امیر خسرو اور شیخ سعدی کے کلام سے ان کے کلام کا موازنہ بھی کیا ہے۔آخر میں قاسم حاجی پوری کی ۱۱۲ رغزلوں کا انتخاب اس کتاب میں شامل ہے۔

۴۔ مولانا محمد نصیرالدّین: احوال وآثار

مولانا محمد نصیرالدّین کی علمی وادبی شخصیت کئی جہتوں پر محیط تھی اوراس کا مکمل انکشاف تب ہوا جب ان کی چار قلمی بیاضیں، ان کے فرزند ارجمند ڈاکٹر غلام مجتبٰی انصاری کی دسترس میں آئیں۔اس سے پہلے یہ بیاضیں ان کی بڑی بہن نجمہ خاتون کے تصرّف میں تھیں۔ان بیاضوں میں، مولانا محمد نصیرالدّین مرحوم کی شاعری کے علاوہ طب وحکمت کے مجرب نسخے اور خطاطی کے بہترین نمونے بھی شامل ہیں۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے دور کے شاعر وحکیم ہونے کے ساتھ خطاطی پر بھی خاصا دسترس رکھتے تھے۔لیکن ان خصوصیات کوانہوں نے اپنی ناموری اور شہرت کا ذریعہ کبھی نہیں بنایا۔ بلکہ ان سب چیزوں کی اشاعت میں بھی انہوں نے کوئی دلچسپی نہیں لی۔ یہ بیاضیں ہمیشہ کے لئے گم ہو جاتیں، اگر غلام مجتبٰی صاحب نے ان کی تدوین واشاعت کی طرف توجہ نہیں دی ہوتی۔اس کتاب کو مصنف رمرتب نے چار حصّوں (بخش اول، دوم، سوم و چہارم) میں تقسیم کیا ہے۔بخش اول میں مصنف نے ان چاروں بیاضوں کی دستیابی کی روداد بیان کرنے کے ساتھ ان کے محتویات کا خلاصہ بھی پیش کیا ہے۔ان چاروں بیاضوں کو فارسی زبان وادب کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ان میں چوتھی یعنی آخری بیاض بہت اہم ہے جس میں مولانا محمد نصیرالدّین مرحوم نے شیخ سعدی اور مولانا روم وغیرہ کے فارسی اشعار کو بہترین اور جاذب نظر خط میں تحریر کیا ہے۔مثلاً ؎

☆ ای دوست اگر جاں طلبی جاں بہ تو بخشم — از جاں چہ عزیز است بگو آن بہ تو بخشم

☆ چاک کن جامۂ ہستی کہ شود او پیدا — تا گریباں ندرد گل نکند بو پید

☆ بجرم عشق تو ام می کشند غوغائیست — تو نیز برسر بام آ کہ خوش تماشائیست

بخش دوم میں مصنف نے حاجی پور کی تاریخ اوراس شہر کی عہد بہ عہد بدلتی ہوئی صورتحال پر روشنی ڈالی ہے۔اس بخش کا عنوان ہے''حاجی پور، موجودہ صدر مقام ضلع ویشالی کی تاریخی اور سیاسی اہمیت''۔غلام مجتبٰی صاحب نے لودی اور افغانی سلاطین سے لے کر سلاطین مغلیہ تک کے ادوار میں اس شہر کے سیاسی وسماجی حالات کو بیان کیا ہے۔اس سلسلے میں

انہوں نے جہانگیر کے اُس فرمان کو بھی نقل کیا ہے جس کے تحت حاجی پور کے پیر دمڑیا کے جانشینوں کو جاگیریں اور پرگنات عطا کئے گئے تھے۔ بخش سوم میں غلام مجتبیٰ صاحب نے اپنے والد گرامی مولانا محمد نصیرالدّین کی سوانح حیات بیان کی ہے۔ جس میں ان کی ولادت، تعلیم وتربیت، درس وتدریس اور افراد خانوادہ کی دیگر تفصیلات کے ساتھ اصلاح معاشرہ کے ذیل میں ان کی خدمات کا مفصّل جائزہ لیا گیا ہے۔ چونکہ ان کا تعلق جمیعۃ العلماء ہند سے تھا، لہذا وہ تقسیم ملک کے مخالف تھے ۔اور اس کے لئے مسلم لیگ کے حامی انہیں ہدف تنقید بھی بناتے تھے۔ اُس پُر آشوب دور میں، تنازعہ سے گریز کرتے ہوئے، مولانا محمد نصیرالدّین نے جس بے مثال صبر وتحمل کا مظاہرہ کیا، وہ ان کی سیرت وشخصیت کا روشن باب ہے۔ کتاب کا چوتھا اور آخری حصّہ بخش چہارم، مولانا نصیرالدّین کی اُن نظموں پر مشتمل ہے جو انہوں نے مختلف سماجی وسیاسی تقریبات کے حوالے سے لکھی ہیں۔ یہ نظمیں ہندوستان کی آزادی، سیاسی رہنماؤں کے استقبال، جمہوریت اور انتخابات اور ہندوستانی مسلمانوں کی حالت زار جیسے موضوعات پر مشتمل ہیں۔ اگرچہ یہ نظمیں ایک مخصوص دور کے حالات سے متاثر ہوکر کہی گئی ہیں۔ لیکن انہیں وقتی موضوعات کہہ کر ٹالا نہیں جاسکتا۔ یہ نظمیں ہندوستان کے ایک تاریخی دور کا حوالہ ہیں اور اسی لئے ان کی تاریخی، سیاسی اور سماجی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

۵۔ (الف) عبدالقیوم انصاری (ب) فخر ملک عبدالقیوم انصاری۔ احوال وافکار

بہار ہی نہیں، ہندوستان کی سیاست کے حوالے سے، عبدالقیوم انصاری کا نام محتاج تعارف نہیں۔ انہوں نے ملک کی سلامتی اور قوم کی فلاح وبہبود کے لئے اپنی زندگی وقف کردی اور مستقبل کے رہنماؤں کے لئے ایک بے مثال نمونہ چھوڑ گئے۔ ان کی خدمات کے اعتراف میں کئی لوگوں نے کتابیں اور مقالات لکھے ہیں۔ لیکن غلام مجتبیٰ صاحب کی ان دونوں کتابوں کا امتیاز یہ ہے کہ ان میں انصاری صاحب کی شخصیت کے سیاسی پہلو کے ساتھ ان کی علمی وادبی اور تصنیفی و تالیفی جہات کو خاص طور پر اجالا گیا ہے۔ ان میں سے پہلی کتاب میں انہوں نے انصاری صاحب کے حالات زندگی بیان کرنے کے ساتھ ان کے ایسے مقالات کا تجزیہ بھی کیا ہے جن میں انصاری صاحب کی علمیت اور انشاء پردازی عروج پر نظر آتی ہے۔ آخر میں انصاری صاحب کے بارے میں غلام مجتبیٰ صاحب نے اکابرین کی آراء کو بھی درج کردیا ہے۔ اس کتاب کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں غالباً پہلی بار انصاری صاحب، ایک سیاسی شخصیت سے زیادہ ایک صحافی، مدیر، ادیب و شاعر اور مقالہ نگار کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ ان کی انشاء پردازی کے نمونے دیکھ کر ابوالکلام کی نثر کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ موضوعات زیادہ تر سیاسی اور سماجی ہیں لیکن مجموعی طور پر ادبیت اور شعریت ان کے مضامین ومقالات کا طرۂ امتیاز ہیں۔ بہار میں اردو تحریک کے فروغ وارتقاء میں بھی ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں جس کی طرف تاریخی شواہد کے حوالے سے مصنف نے اشارہ کیا ہے۔ ۹۷ صفحات کی اس کتاب میں انصاری صاحب کی شخصیت اور ان کی ہمہ جہت

کارناموں کے ساتھ اُس عہد کا اجمالی منظر نامہ بھی سامنے آ گیا ہے۔

انصاری صاحب کے احوال وافکار پر غلام مجتبیٰ صاحب کی دوسری کتاب دراصل اسی اجمال کی تفصیل ہے ۔اسی لئے اس کتاب کو اول الذکر کتاب کا تکملہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ مجموعی طور پر پانچ ابواب اور تقریباً ساڑھے تین سو صفحات پر مشتمل اس کتاب کا کینواس خاصا وسیع ہے جو اُس پُر آشوب دور کے سیاسی منظر نامے کا بھی مکمل احاطہ کرتا ہے۔ یہ سیاسی منظر نامہ انصاری صاحب کی سوانح حیات سے یوں مربوط ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھا ہی نہیں جا سکتا۔ دوسرے باب میں انصاری صاحب کی صحافت کا ذکر کرتے ہوئے ان کی انشاء پردازی کے نمونے درج کئے گئے ہیں اور اسی ذیل میں ان کی شاعری میں قومی یکجہتی اور جذبۂ حب الوطنی کے عناصر کی خاص طور پر نشاندہی کی گئی ہے۔ کتاب کا تیسرا باب میرے خیال میں اس کتاب کا اہم ترین باب ہے جس میں انصاری صاحب کے خطبات ومقالات کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ ان کی یکجائی سے ایک طرف غلام مجتبیٰ صاحب کی عرق ریزی اور ژرف نگاہی کا احساس ہوتا ہے تو دوسری طرف مختلف سیاسی وسماجی مسائل کے بارے میں انصاری صاحب کا فکری رویہ بھی کھل کر سامنے آتا ہے۔ کتاب کا چوتھا باب دراصل تیسرے باب ہی کی توسیع ہے جس میں انصاری صاحب کے اقوال کو 'ارشادات عالیہ' کے عنوان کے تحت جمع کر دیا گیا ہے۔ آخر میں اکابرین کی آراء سے انصاری صاحب کی شخصیت اور ان کے کردار کی تفہیم میں مدد ملتی ہے۔ غلام مجتبیٰ صاحب کی یہ دونوں کتابیں انصاری صاحب کی شخصیت کے کئی مخفی گوشوں (خاص طور پر علمی وادبی گوشے) کو سامنے لاتی ہیں۔ بلاشبہ یہ دونوں کتابیں اپنے کیف وکم کے اعتبار سے آئندہ نسل کے لئے باعث تحریک ہونگی۔

۶۔ فرہنگ فارسی جدید با معانی اردو

فرہنگ فارسی جدید، مختصر ہونے کے باوجود، اردو طلبہ کی ضرورتوں کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی غالباً پہلی ایسی فرہنگ ہے جس میں نہ صرف فارسی کی جدید مصطلحات اور محاورات وضرب الامثال سے انہیں آشنا کیا گیا ہے بلکہ جدید تکلمی فارسی سے بھی انہیں متعارف کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔ مصنف چونکہ ایران میں رہ چکے تھے اور ایرانیوں سے ارتباط کے نتیجے میں وہ جدید فارسی میں تقریر وتحریر دونوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس موضوع کا نہ صرف حق ادا کیا ہے بلکہ ایسے تمام الفاظ ومحاورات کو یکجا کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں جو ایران میں روزمرّہ کی گفتگو میں کثرت سے استعمال ہوتے ہیں۔ ایران سے ہندوستان واپسی کے بعد انہیں شدت سے یہ احساس ہوا کہ اگر اردو داں طلبہ کو جدید فارسی سے آشنائی ہو جائے تو انہیں فارسی بولنے والے ملکوں، مثلاً ایران، افغانستان اور تاجکستان وغیرہ کے سفارتخانوں میں ملازمت مل سکتی ہے۔ اسی احساس کے تحت انہوں نے یہ فرہنگ ترتیب دی۔ دو صفحات پر مشتمل کتاب کے مقدمہ میں انہوں نے اس کتاب کا سبب تالیف یہی بیان کیا ہے اور بجا طور پر اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ اب فارسی کی روایتی تعلیم

وتدریس سے ہم اپنے مقاصد حاصل نہیں کر سکتے ۔ یہ کتاب اگر چہ انہوں نے کالج اور یونیورسٹی کے طلبہ کو پیش نظر رکھ کر لکھی ہے، تاہم مدارس کے طلبہ بھی اس سے یکساں استفادہ کر سکتے ہیں۔ بلکہ یہ کتاب ان کے لئے زیادہ مفید اس لحاظ سے ہے کہ دانشگاہوں کے طلبہ کی نسبت ان کی اردو بہتر ہوتی ہے اور اردو میڈیم سے فارسی سیکھنے والے طلبہ اسے آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ مصنف نے اپنے مقصد کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے :

''اس مجموعہ کے پیش کرنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ جدید فارسی زبان وادب کے شائقین عمومی طور پر، اور اسکول، کالج اور مدرسہ کے طلبہ خصوصی طور پر، اسکے ذریعہ جدید فارسی اصطلاحات، محاورات وضرب الامثال نیز انداز تکلم سے روشناس ہو جائیں۔'' (ص ۴)

بادی النظر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ فرہنگ صرف مبتدی طلبہ کے لئے کار آمد ہے اور شاید انہی کی ضرورتوں کی تکمیل کرتی ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ یہ فرہنگ منتہی طلبہ کے لئے بھی اتنی ہی مفید ہے کہ اس سے مدد اور استفادہ کے بغیر ان کی بھی تقریر وتحریر جامع، بامعنی اور درست نہیں ہو سکتی۔

۷۔ گنجینۂ ادب المعروف مقالات مجتبیٰ

ڈاکٹر غلام مجتبیٰ صاحب کے مقالات کا مجموعہ ''گنجینۂ ادب'' مجموعی طور پر دس مقالات پر مشتمل ہے، جس کو ان کے فرزند ڈاکٹر محمد اعجاز احمد صاحب نے ترتیب دے کر ۲۰۱۰ء میں ادارہ تحقیقات عربی وفارسی، پٹنہ کے زیر اہتمام شائع کیا۔ اس کا مختصر پیش لفظ ادارہ تحقیقات کے سابق ڈائرکٹر ڈاکٹر حسن رضا خاں صاحب نے لکھا ہے اور بجا طور پر اعتراف کیا ہے کہ یہ مجموعہ ڈاکٹر غلام مجتبیٰ صاحب کے گہرے تحقیقی مطالعے کا نتیجہ ہے۔ کتاب کا مقدمہ اس کے مرتب ڈاکٹر محمد اعجاز صاحب کے قلم سے ہے جس میں انہوں نے کتاب میں شامل تمام مضامین کا تعارف پیش کیا ہے۔ ان میں دو مضامین (۱) مخدوم شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے مکتوبات کی علمی وادبی اہمیت اور (۲) درویش حسین والہ ہروی ''مشاہدات مجتبیٰ'' میں بھی شامل ہیں۔ ان کا تعارف اس کتاب کے ذکر میں پیش کیا جا چکا ہے۔ جبکہ حکیم شیخ حسین شہرت شیرازی پر غلام مجتبیٰ صاحب کا مضمون خود ان کے فارسی مضمون کی تلخیص ہے جو شیرازی پر ان کی کتاب میں شامل ہے۔ خدا بخش لائبریری سے مطبوعہ اس کتاب کے ذکر کے ذیل میں اس کا تعارف بھی پیش کیا جا چکا ہے۔ مخدوم سید قاسم حاجی پوری کی سیرت وشخصیت پر بھی ایک مضمون اس کتاب میں شامل ہے۔ ان کی سوانح اور شاعری پر مجتبیٰ صاحب کی مکمل کتاب شائع ہو چکی ہے اور اس کے تمام مشمولات اُس کتاب میں بھی شامل ہیں۔ تاہم کچھ نئے موضوعات پر کچھ نئے مضامین اس کتاب میں ضرور شامل ہیں جن کے ذکر بغیر مجتبیٰ صاحب کے تحقیقی وتنقیدی میلانات ورجحانات کی تفہیم مکمل نہیں ہوگی۔

کتاب کے پہلے مضمون میں غلام مجتبیٰ صاحب نے 'ہندوستان کی فارسی شاعری میں مقامی عناصر' کی دریافت کی قابل قدر کوشش کی ہے اور علامہ شبلی کے اس خیال کی نفی کی ہے کہ فارسی شاعری میں مقامی عناصر ناپید ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے امیر خسرو، فیضی، طالب آملی، ابوطالب کلیم ہمدانی اور درویش حسین والہ ہروی وغیرہ کے ایسے اشعار کو بطور استدلال پیش کیا ہے جس میں ہندوستان کا مقامی رنگ و آہنگ نمایاں ہے۔ صفوی دور کے ایک اہم شاعر ملا ناظم ہروی کی سیرت و شخصیت اور اس کی شاعرانہ انفرادیت پر مجتبیٰ صاحب کا ایک اہم تحقیقی مضمون اس کتاب میں شامل ہے جس میں مختلف تذکروں کی مدد سے اس کے حالات کو ترتیب دینے اور اس کے قلمی دیوان کی مدد سے اس کی شاعرانہ قدر و قیمت متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بنیادی طور پر تحقیقی نوعیت کے اس مضمون میں ملا ناظم کی پیدائش اور اس کی ہندوستان آمد سے لے کر اس کی وفات تک کے واقعات کا احاطہ کیا گیا ہے جس سے اُس دور کے ہندوستان کی ایک چھوٹی سی جھلک بھی نمایاں ہوتی ہے۔ کتاب میں شامل ایک اہم مضمون میں شعر و ادب سے ہٹ کر مصنف نے عہد مغلیہ کے تعلیمی نظام پر نظر ڈالی ہے جس کا عنوان ہی ہے 'عہد مغلیہ کا تعلیمی نظام'۔ اس میں اکبر اور شاہجہاں سے لے کر عہد اورنگزیب تک کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ان ادوار میں مدارس کے نظام پر گفتگو کرتے ہوئے مصنف نے اُس وقت کے نصاب تعلیم پر بھی روشنی ڈالی ہے جو مختلف مذاہب کے حامل افراد کے درمیان ایک مشترک تہذیب کو فروغ دینے کے مقصد سے ترتیب دیا گیا تھا۔ اس سے مغل بادشاہوں کی رواداری بھی کھل کر سامنے آتی ہے۔

'عہد اورنگزیب اور اس کے بعد ہندوستان کا فارسی شعر و ادب' کے عنوان سے ایک مقالہ اس کتاب میں شامل ہے جو رسالہ 'زبان و ادب' پٹنہ کے جنوری ۱۹۷۸ء کے شمارے میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ غلام مجتبیٰ صاحب نے اس مضمون میں اس مفروضہ کی نفی کی ہے کہ فارسی شعر و ادب سے اورنگزیب کی عدم دلچسپی کے سبب اس دور میں فارسی شاعری کو زوال آ گیا تھا اور اسی وجہ سے اُس دور میں فارسی ادب کا کوئی شاہکار وجود میں نہ آ سکا اور نہ ہی فارسی زبان و ادب کا کوئی اہم اور قابل ذکر ادیب و شاعر عالم وجود میں آیا۔ مجتبیٰ صاحب نے اُس عہد کی پوری ادبی تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے درجنوں ایسے شعرا، ادبا، علما اور فضلا کا ذکر کیا ہے جنہوں نے عہد اورنگزیب میں مختلف اصناف ادب میں اپنے تخلیقی جوہر دکھائے ہیں۔ یہ اعتراف کرنے کے باوجود، کہ شعر و ادب سے اورنگزیب کو دلچسپی کم تھی، غلام مجتبیٰ صاحب اس کی توجیہ کرتے ہیں کہ اس کا سبب فارسی شعر و ادب سے اس کی نفرت نہیں تھی، بلکہ سلطنت مغلیہ کی توسیع و استحکام میں اس کی بے پناہ مصروفیات تھیں۔ جس کی وجہ سے وہ فارسی شعر و ادب کی طرف خاطر خواہ توجہ نہ دے سکا۔ اس سلسلے میں انہوں نے 'رقعات عالمگیری' میں درج فارسی اشعار کا حوالہ بھی دیا ہے جو اورنگزیب کے معاصر شعرا کی فکر کا نتیجہ ہیں اور جنہیں موقع و محل کی مناسبت سے 'رقعات عالمگیری' میں لکھا گیا ہے۔ غلام مجتبیٰ صاحب کے مطابق 'رقعات عالمگیری' اورنگزیب کی بہترین نثر نگاری اور ادبی

ذوق کی آئینہ دار ہے ۔ اس کے علاوہ خود اس کی بیٹی زیب النسا مخفی شعر کہتی تھی اور شعرا کی سرپرستی بھی کرتی تھی لیکن اورنگزیب نے کبھی اس کو منع نہیں کیا۔ بلکہ مجتبیٰ صاحب نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ اورنگزیب کے تغافل سے جو خلا پیدا ہو گیا تھا، اس کو زیب النساء نے پورا کیا۔ اورنگزیب کو فارسی شعروادب سے نفرت نہیں تھی، اس حقیقت کی دوسری مستحکم دلیل کے طور پر غلام مجتبیٰ صاحب نے اس کے دوسرے بیٹے محمد اعظم شاہ کی مثال پیش کی ہے جو شعروادب کے ساتھ دیگر فنون لطیفہ میں بھی یکتائے روزگار تھا۔ خاص بات یہ ہے کہ یہ انکشاف غلام مجتبیٰ صاحب نے 'مخزن الغرائب' اور 'سفینۂ خوشگو' جیسے نادر تذکروں کے حوالے سے کیا ہے جس میں اعظم شاہ کی شعر گوئی اور اسکی ناقدانہ بصیرت کی ستائش کی گئی ہے۔ محمد اعظم شاہ کی اسی علم دوستی اور ادب نوازی کے سبب، اُس عہد کے بیشتر شعرا، اس کے دربار سے وابستہ تھے۔ مثلاً مرزا بیدل، میر محمد زماں راسخ، حاجی اسلم سالم اور شیخ حسین شہرت شیرازی وغیرہ۔ اعظم شاہ کا بھائی شاہ عالم، جس کا لقب بہادر شاہ تھا، بھی شاعری سے شغف رکھتا تھا اور کئی اہم شعرا اس کے دربار سے فیض حاصل کر رہے تھے۔ ان میں جویا کشمیری بھی شامل تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ غلام مجتبیٰ صاحب کا یہ مضمون اپنی جامعیت اور تحقیقی مواد و مأخذ کے لحاظ سے مکمل ایک کتاب کے مساوی ہے جس میں انہوں نے تاریخی شواہد سے یہ ثابت کیا ہے کہ اس زمانے میں بھی بیرونی شعرا مسلسل دہلی آ رہے تھے اور یہاں ان کی پذیرائی بھی ہو رہی تھی۔

اُس زمانے میں شاعری کی مختلف اصناف سے بحث کرتے ہوئے غلام مجتبیٰ صاحب نے یہ اعتراف کیا ہے کہ صنف قصیدہ کو اس عہد میں زوال آیا تھا کہ اورنگزیب اپنی مدح سرائی پسند نہیں کرتا تھا۔ تاہم اس کی تلافی صنف مثنوی سے ہوئی۔ جس میں تاریخ نگاری کے ساتھ تصوف اور فلسفہ کے موضوعات کو بھی شامل کیا گیا۔ البتہ انہوں نے اس بات پر حیرت کا اظہار ضرور کیا ہے کہ اس زمانے میں صنف رباعی کو کیوں فروغ نہیں ملا جبکہ وہ پُر آشوب دور اور اس کے عبرت انگیز حالات اس کے لئے بہت موزوں تھے۔ فارسی شعروادب کے چار مضبوط ستونوں میں سے ایک اہم ستون مرزا بیدل کا تعلق جس دور سے ہو، اس عہد کو فارسی شعروادب کے لئے نا موزوں کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟ غلام مجتبیٰ صاحب کا یہ سوال اور اُس پورے عہد کے فارسی منظر نامے کے تجزیئے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ اورنگزیب کے حوالے سے جہاں بہت سی غلط فہمیاں ہیں وہاں یہ غلط فہمی بھی عام ہے کہ اس نے شعر وادب کی حوصلہ شکنی کی۔

'بیاض کی اہمیت وافادیت' کے زیرعنوان لکھے گئے اپنے مضمون میں غلام مجتبیٰ صاحب نے بیاض کی اہمیت اور افادیت سے کم بحث کی ہے۔ اُن کی گفتگو کا محور اس لفظ کا مادہ ومخرج، قرآن کریم میں اس لفظ کے مفاہیم، عربی و فارسی زبانوں میں اس لفظ کا مختلف معنوں میں استعمال اور پھر فارسی کی مختلف لغات میں اس کی تشریحات ہیں ۔ یہ مضمون خدا

بخش لائبریری جرنل کے شمارہ ۱۳۶ (اپریل تا جون ۲۰۰۴ء) میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ پروفیسر غلام مجتبیٰ صاحب نے فارسی کے فرہنگ ولغات پر خاصا کام کیا ہے۔ فارسی جدید کی فرہنگ پر تو ان کی کتاب ہی شائع ہو چکی ہے۔ لہذا فارسی کی مختلف فرہنگوں پر ان کی نظر خاصی وسیع ہے اور اسی کی روشنی میں انہوں نے لفظ 'بیاض' کے معنی ومفہوم کی جو تفصیلات بیان کی ہیں، وہی اس مضمون کا امتیاز ہے۔

مضمون کے آخر میں انہوں نے مختصراً بیاض کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے چند اہم نکات کی نشاندہی کی ہے۔ مثلاً : (۱)۔ بیاض، اطلاعات ومعلومات کا معتبر ذریعہ اور مستند وسیلہ ہے۔ اور (۲)۔ بیاض سے صاحب بیاض کے ذاتی کوائف کے علاوہ اُس عہد کی سیاسی، سماجی اور تاریخی معلومات بھی حاصل ہوتی ہیں۔ صرف چار صفحات پر مشتمل غلام مجتبیٰ صاحب کا یہ مضمون مختصر اور تشنہ ضرور ہے، لیکن افادیت سے خالی نہیں۔

فارسی کے ایک غیر معروف لیکن اہم شاعر حسن بیگ کرامی کی سوانح وشخصیت اور اس کی شاعری پر ایک مقالہ اس کتاب میں شامل ہے۔ یہی مقالہ فارسی زبان میں 'قند پارسی' (زمستان ۱۳۷۹) نئی دہلی میں شائع ہو چکا ہے۔ حسن بیگ کرامی، اُن ایرانی شعرا کی نسبت قدرے کم معروف ہے جو مغلوں کے عہد میں ایران سے ہندوستان میں وارد ہوئے تھے۔ غلام مجتبیٰ صاحب نے اس کی شاعری کا جو انتخاب پیش کیا ہے، اس سے شاہجہاں کے دور کے اہم واقعات مرتب کئے جاسکتے ہیں۔ اور اس میں اس کے ایام شاہزادگی کے واقعات بھی شامل ہیں۔ غلام مجتبیٰ صاحب کا یہ مقالہ، خدا بخش لائبریری میں محفوظ دیوان کرامی کے قلمی نسخہ پر مبنی ہے اور ان کی اس مستحسن کاوش سے شاید پہلی بار یہ اشعار منظر عام پر آئے ہیں۔ جس سے نہ صرف ادبی ناقدین بلکہ مؤرخین بھی استفادہ کر سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے کرامی کی شاعری کو اُس عہد کی منظوم تاریخ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ یہ مقالہ تحقیقی انکشافات کا منتہائے کمال نہیں تو اس کے آس پاس ضرور ہے کہ اس میں ایک ایسے شاعر کو discover کیا گیا ہے جو خود بھی تاریخ کے صفحات میں گم تھا اور جس کی شاعری بھی لائبریری کے ذخیرے میں کہیں دفن تھی۔

مقالات

کتابوں کے علاوہ، غلام مجتبیٰ انصاری صاحب کے درج ذیل مقالات کا ذکر بھی ضروری ہے جو اب تک اُن کی کسی کتاب یا مجموعہ میں شامل نہیں ہو سکے ہیں۔

۱۔ عمر خیام ورباعیات او

ادارہ تحقیقات عربی وفارسی، پٹنہ کے زیر اہتمام ۲۰۱۶ء میں عمر خیام اور اس کی رباعیات کے حوالے سے ایک سیمینار کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں غلام مجتبیٰ صاحب نے اپنا یہ مقالہ پیش کیا تھا۔ عمر خیام کی رباعیات کے حوالے سے

مختلف زبانوں میں بے شمار مضامین شائع ہو چکے ہیں ۔اس موضوع پر کتابوں کی بھی کوئی کمی نہیں ہے ۔سچ پوچھئے تو رباعیات خیام کے حوالے سے، غلام مجتبیٰ صاحب کا یہ مختصر مضمون ان پر کوئی اضافہ نہیں کرتا۔ بلکہ انہی کی بازگشت معلوم ہوتا ہے ۔صرف چار صفحات پر مشتمل اس مضمون میں سے اگر عمر خیام کی اُن رباعیوں کو حذف کر دیا جائے جو مجتبیٰ صاحب نے بطور نمونہ پیش کئے ہیں تو یہ مضمون صرف ڈیڑھ یا دو صفحہ کا رہ جاتا ہے۔لیکن مجتبیٰ صاحب کا یہ ایجاز بھی ہے اور اعجاز بھی کہ اس مختصر بلکہ مختصر ترین مضمون میں انہوں نے تقریباً اُن تمام خصوصیات کا احاطہ کر لیا ہے جو دیگر مصنفین سینکڑوں صفحات میں کرتے آئے ہیں ۔خیام کا فلسفہ نشاط ، دنیا کی بے ثباتی ، جبر و اختیار کا نظریہ، اخلاقیات ،صبر، توکل وقناعت، ریاکاروں پر طنز اور انسان کی بے بسی کا دلسوز اظہار یہ۔غرضیکہ رباعیات خیام کا وہ کون سا ایسا پہلو ہے جس کی طرف مجتبیٰ صاحب نے اشارہ نہ کیا ہو۔اور ظاہر ہے اس مختصر مضمون میں صرف اشارہ ہی کیا جا سکتا تھا۔لیکن اہم بات یہ ہے کہ یہ اشارے ہی تفصیل واطناب کے لئے کثیر مواد فراہم کرتے ہیں اور اس لحاظ سے یہ مضمون، بقامت کہتر، بقیمت بہتر، کا مصداق بن گیا ہے۔

۲۔ سہم سخنوران زن در زبان و ادبیات فارسی

ادارہ تحقیقات عربی و فارسی، پٹنہ کے زیر اہتمام ۲۰۱۳ء میں ''عربی و فارسی زبان میں خواتین کا حصّہ'' کے موضوع پر ایک سیمینار کا انعقاد ہوا تھا جس میں یہ مقالہ ڈاکٹر غلام مجتبیٰ صاحب نے پیش کیا تھا۔ فارسی شاعرات کے حوالے سے مجتبیٰ صاحب کا یہ مقالہ اس اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں فارسی شاعری کی پوری تاریخ سمٹ آئی ہے۔خود مصنف کے بقول، اس مقالہ میں انہوں نے سامانی دور سے لے کر دور حاضر تک کے مطالعہ کا نچوڑ پیش کر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''بندہ بعد از تلاش وجستجوی بسیار عدۂ ایشان از دورۂ سامانیان تا بدورۂ امروز بیش از پانزدہ را سراغ گرفتن توانستہ ام۔'' (ص۔۱)

ظاہر ہے اس کے لئے انہیں بے شمار تذکروں سے گزرنا پڑا ہوگا اور ہر عہد کے سیاسی وسماجی حالات کا بھی مطالعہ کرنا پڑا ہوگا۔اس طرح یہ مقالہ تحقیق وتنقید دونوں کا حسین امتزاج بن کر سامنے آیا ہے۔سب سے پہلے سامانی اور صفوی دور کی شاعرات میں رابعہ بن کعب اور آتونی ہروی کا ذکر کرنے کے بعد وہ مغلوں کے دور میں آتے ہیں اور اس عہد زرّیں کی شاعرات میں گلبدن بیگم، نور جہاں بیگم، سلیمہ سلطان، جہاں آرا بیگم اور زیب النساء بیگم کا بطور خاص ذکر کرتے ہیں اور مختصراً ان کے حالات بیان کرنے کے بعد ان کی شاعری کے اہم نکات کو بھی سامنے لاتے ہیں اور اس حقیقت کو بھی عیاں کرتے ہیں کہ اُس زمانے کا مرد اساس معاشرہ بھی ان کی شاعری کا معترف اور مداح تھا۔

آخر میں عہد جدید کی شاعرات میں وہ پروین اعتصامی، فروغ فرخزاد اور سیمیں بہبہانی کو موضوع بناتے ہیں اور

ان تینوں کے فکری رجحانات کو اس طرح نمایاں کرتے ہیں کہ ان تینوں کا موازنہ بھی ہو جاتا ہے اور الگ الگ ان کی نظریاتی فکر بھی ابھر کر سامنے آ جاتی ہے۔ مثلاً پروین کا داخلی سوز و کرب، فروغ کا بیباک انداز بیان اور سیمیں بہبہانی کے جنسی اشارے۔ ڈاکٹر انصاری نے ان تمام نکات پر تنقیدی گفتگو ضرور کی ہے، تاہم کوئی فیصلہ دینے سے گریز کیا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس مقالے کو تحقیقی اعتبار سے یادگار بنانا چاہتے تھے۔ تاہم یہ مقالہ تنقیدی عناصر سے بھی خالی نہیں ہے اور یہی تنقیدی عناصر، ان شاعرات کے شاعرانہ مقام کے تعین میں مدد بھی کرتے ہیں۔

۳۔ فردوسی و شاہنامۂ او

فردوسی اور اس کے شاہنامہ کے حوالے سے ادارہ تحقیقات عربی و فارسی، پٹنہ نے ۲۰۱۵ء میں ایک سیمینار کا انعقاد کیا تھا۔ مجتبیٰ صاحب کا یہ مقالہ اسی سیمینار کی یادگار ہے۔ غلام مجتبیٰ صاحب نے اس مقالے میں فکری و فنی دونوں اعتبار سے شاہنامہ کے مشتملات پر نظر ڈالی ہے اور اس کی خصوصیات کو بیان کرنے کے ساتھ اس کے پس منظر اور پیش منظر دونوں کا جائزہ لیا ہے۔ مقالہ کے دو حصّے ہیں۔ پہلے حصّے میں فردوسی کی مختصر سوانح حیات ہے، جس میں کوئی نئی اطلاع فراہم نہیں کی گئی ہے۔ سلطان محمود غزنوی کی ناقدری اور فردوسی کی المناک وفات کا معروف قصّہ بیان کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فردوسی کی سوانح حیات لکھنا اس مقالے کا مقصد بھی نہیں تھا۔ مصنف کا اصل مقصد شاہنامہ کی اولیات، اس کے مشتملات اور اس کے امتیازات کو اجالنا تھا۔ چنانچہ 'شاہنامۂ فردوسی' کے ذیلی عنوان سے اپنے مقالے کے اصل حصّہ کا آغاز کرتے ہوئے مجتبیٰ صاحب نے سب سے پہلے شاہنامہ کے مشتملات پر ہی نظر ڈالی ہے اور اس انداز سے نظر ڈالی ہے کہ شاہنامہ کا اصل حسن اور فردوسی کا فکری تنوع، دونوں سامنے آ گئے ہیں۔ اس کے مأخذ کا ذکر کرتے ہوئے مجتبیٰ صاحب نے شاہنامہ ابو منصور کے ساتھ چند دیگر داستانوں کا بھی ذکر کیا ہے جن سے فردوسی نے استفادہ کیا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مکمل شاہنامہ فردوسی کی طبعزاد داستان نہیں ہے۔ شاہنامہ کے محتویات کی بنیاد پر غلام مجتبیٰ صاحب نے اس کو تین حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ (۱) افسانوی دور (۲) پہلوانی دور (۳) تاریخی دور۔ ان میں پہلوانی دور کو اہم ترین قرار دیتے ہوئے مجتبیٰ صاحب نے لکھا ہے کہ ''این قسمت حماسۂ واقعی ملّی ایران است۔'' رستم و سہراب کی دلگداز داستان اسی دور کا حصّہ ہے۔ تاہم اس کا تیسرا تاریخی دور بھی کم اہم نہیں ہے۔ جس میں بہرام گور، نوشیرواں اور خسرو و شیریں وغیرہ کی داستانیں بیان ہوئی ہیں۔ اس تاریخی دور کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ شجاعت اور پہلوانی ایرانی معاشرہ کا عام رجحان تھا۔ مجتبیٰ صاحب کی تنقیدی نگاہ نے اس اہم نکتہ کو بھی منکشف کیا ہے کہ فردوسی صرف رزم پر قدرت نہیں رکھتا تھا بلکہ بزم کے بیان میں بھی وہ مکمل مہارت رکھتا تھا۔ جس کے اہم کردار بیژن و منیژہ اور سیاوش و رودابہ وغیرہ ہیں۔ مجتبیٰ صاحب کی یہ نتیجہ خیزی بھی صحیح ہے کہ فردوسی کی رومانی داستانیں ہر قسم کے ابتذال سے پاک ہیں اور بزم عیش کے

بیان میں بھی وہ حد سے تجاوز نہیں کرتا۔اس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ شاہنامہ رزمیہ داستان تو ہے لیکن اس میں یکرنگی نہیں۔اس میں سیاست ومعاشرت، فرہنگ وادب اور تہذیب وتمدن کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں اور پند وموعظت کے ساتھ اخلاقیات کی بلند قدروں کا عکس بھی دکھائی دیتا ہے۔یہ مقالہ، شاہنامہ کا نہایت جامع مطالعہ پیش کرتا ہے جس میں فردوسی کی شاعری کے ہر پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔اس کے فکری وموضوعاتی تنوع کو دیکھتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ اسے صرف رزمیہ لکھنا، شاید فردوسی کی فکر کو محدود کرنا ہے۔

۴۔ مشخصات اشعار پروین اعتصامی تبریزی

فارسی شاعرات میں پروین اعتصامی کا نام محتاج تعارف نہیں۔فارسی شاعری کے ہر ناقد نے اس کی شخصیت اور شاعری کو موضوع بنایا ہے۔لیکن ڈاکٹر غلام مجتبیٰ صاحب کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے پروین کی شاعری کے پس منظر پر بھی نگاہ رکھی ہے اور اس سلسلے میں انہوں نے پروین کے اُس ایرانی مطبوعہ دیوان سے براہ راست استفادہ کیا ہے جس کی وقعت اور جامعیت میں رحیم چاوش اکبری کے مبسوط دیباچہ نے بہت اضافہ کیا ہے۔اکبری کے دیباچہ کے علاوہ پروین کے فکر وفن کے بارے میں دکتر منیب الرحمٰن، زہرای خانلری اور بہار مشہدی وغیرہ کی تحریروں کا بھی محاکمہ کیا گیا ہے جس سے خود مصنف کی ناقدانہ صلاحیت کا اظہار ہوتا ہے۔یہ مصنف کی بصیرت آمیز نگاہ کا کمال ہے، جس نے پروین کی شاعری کے اُن پہلوؤں کو بھی گرفت میں لیا ہے جو شناسا ہیں اور اُن نکات کی بھی نشاندہی کی ہے جن پر اب تک سیر حاصل گفتگو نہیں ہوئی ہے۔مثلاً مادرانہ جذبے کا دلسوز بیان۔اس کے بارے میں مصنف کا خیال ہے کہ پروین کے ایسے اشعار کو مولانا روم کے اشعار کے برابر رکھا جا سکتا ہے۔

اس مقالہ میں نہ صرف پروین اعتصامی کے موضوعات کو سامنے لایا گیا ہے بلکہ ان کے فن کے اُس حزن آمیز حسن کی بھی دریافت کی گئی ہے جو شکستہ دلی، دلسوزی اور افسردگی سے عبارت ہے۔اور یہ حقیقت ہے کہ انہی خصوصیات نے پروین اعتصامی کی شاعری کو امتیازی مقام عطا کیا ہے۔مقالہ میں اُس پس منظر کی بازیافت بھی ایک اہم نکتہ ہے جس نے پروین کی شاعری کو یہ سوز بخشا تھا۔اس پس منظر میں پروین کے والد کی وفات اور خود ان کی ناکام شادی جیسے دلگداز واقعات شامل ہیں۔دراصل، پروین کی شاعری انہی المیہ حالات کی زائیدہ ہے اور مصنف نے اس کی نشاندہی کر کے پروین کی شاعری کی تفہیم کی راہ آسان کر دی ہے۔

۵۔ سخنوران ہمزمان میرزا عبدالقادر بیدل

یہ مقالہ 'قند پارسی' (شمارہ ۳۹۔۴۰) میں شائع ہو چکا ہے اور جیسا کہ اس کے عنوان سے ظاہر ہے، اس میں پروفیسر غلام مجتبیٰ صاحب نے بیدل کے معاصر شعرا کا تذکرہ کیا ہے۔ان میں خاص طور پر حکیم شیخ حسین شہرت شیرازی،

حاجی اسلم سالم کشمیری، میر محمد زماں راسخ لاہوری اور میرزا عبدالغنی بیگ کشمیری قابل ذکر ہیں۔شہرت شیرازی پر تو مصنف، مفصل تحقیقی مقالہ لکھ چکے ہیں،لہذا یہاں انہوں نے اپنی باتوں کا اعادہ کرنے کے بجائے ان کے تعارف اور ان کے شاعرانہ امتیازات کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ بیدل کے دوسرے معاصر شاعر حاجی اسلم سالم کی مختصر سوانح بیان کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ وہ نومسلم تھے اور محمد اعظم شاہ کے دربار سے وابستہ تھے۔اس کی عظمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ بیدل جیسا شاعر اس کے علاوہ کسی شاعر کے دیوان کو قابل اعتنا نہیں سمجھتا تھا۔مجتبیٰ صاحب لکھتے ہیں:

''میرزا (عبدالقادر بیدل) در ہمہ زندگانیش بجز دیوان حاجی، دیوان ھیچ شاعر را مطالعہ نمی کرد۔'' (ص۔۳۱۵)

میر محمد زماں راسخ بھی محمد اعظم شاہ کے دربار سے وابستہ تھے اور بیدل کے 'یاران شفیق' میں سے ایک تھے۔غزل کے علاوہ انہیں مثنوی نگاری میں بھی کمال حاصل تھا۔ان کی مثنوی 'دادوفریاد' کو خاصی شہرت حاصل ہوئی۔میرزا عبدالغنی بیگ کشمیری، فارسی شاعری میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ بیدل کے معاصرین میں ان کا نام سب سے نمایاں ہے۔اس لئے مجتبیٰ صاحب نے قدرے تفصیل سے ان کے کلام کا ناقدانہ جائزہ لیا ہے اور نہ صرف ان کی غزل بلکہ ان کے قصائد پر بھی گفتگو کی ہے۔اس حوالے سے غنی کی شاعری کا تجزیہ بہت کم لوگوں نے کیا ہے۔ بیدل بھی ان کی شاعری کے مداح تھے اور صائب تبریزی تو غنی کے ایک شعر کے عوض اپنا پورا دیوان دینے کو تیار تھے۔ بیدل کے معاصرین کا یہ تذکرہ اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ ان چاروں شعرا کے حوالے سے اُس عہد کا شاعرانہ اور ادبی ماحول بھی ابھر کر سامنے آ گیا ہے اور خود مجتبیٰ صاحب کی، افراط وتفریط سے پاک، تنقیدی وتجزیاتی صلاحیت بھی نمایاں ہوتی ہے۔اپنے تجزیئے میں انہوں نے نہ تو کہیں مبالغہ سے کام لیا ہے اور نہ کسی کو کسی سے کمتر یا برتر دکھانے کی کوشش کی ہے۔ان شعرا کے مطالعہ کے دوران انہوں نے اُس عہد کے تذکروں کو بھی سامنے رکھا ہے اور خاص طور پر اُن تذکرہ نگاروں کے حوالے دیئے ہیں جنہیں ان شعرا سے ملاقات کا شرف حاصل رہا تھا۔ان تذکرہ نگاروں کی آراء کی روشنی میں، خود مجتبیٰ صاحب کی تنقیدی بصیرت کی توثیق وتائید ہوتی ہے۔

غلام مجتبیٰ صاحب کی یہ کتابیں اور یہ مقالے، اُن کی کُل کائنات ہیں، یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا۔ان کی کچھ معلوم اور کچھ نامعلوم چیزیں ہنوز دسترس میں نہیں ہیں۔ تلاش وجستجو کے بعد انہیں منظر عام پر لانے کی ضرورت ہے۔مثال کے طور پر، تقریباً پانچ سو صفحات پر مشتمل، درویش حسین والہ ہروی پر ان کا تحقیقی مقالہ، اب تک اشاعت کا منتظر ہے۔ایک اطلاع کے مطابق، انگریزی میں اس کا مفصل مقدمہ، مجتبیٰ صاحب نے لکھا ہے جو تقریباً سو صفحات پر مشتمل ہے۔افسوس ہے کہ وہ

بھی عام طور پر دستیاب نہیں ہے۔ بہر حال، تلاش و تحقیق کا عمل جاری رہا تو مجتبیٰ صاحب کی مزید تخلیقات کی بازیافت ناممکن نہیں ہے۔

منابع:

۱۔ مشاہدات مجتبیٰ از سفر ایران با ہمراہ ہشت مقالہ۔ مصنف: پروفیسر غلام مجتبیٰ انصاری۔ مطبوعہ۔ ادارہ تحقیقات عربی و فارسی، پٹنہ۔ ۲۰۱۲ء

۲۔ حکیم شیخ حسین شہرت شیرازی، احوال و آثار۔ مصنف: دکتر غلام مجتبیٰ انصاری۔ مطبوعہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ۔ ۱۹۹۷ء

۳۔ دیوان اشعار حکیم شیخ حسین شہرت شیرازی۔ تصحیح و تحقیق: دکتر غلام مجتبیٰ انصاری۔ بازنگری و ویراستاری: علی رضا قزوہ۔ مطبوعہ۔ مرکز تحقیقات فارسی، رایزنی فرهنگی، سفارت جمہوری اسلامی ایران، دہلی نو۔ فوریہ ۲۰۱۰ء

۴۔ پاسداران زبان و ادبیات فارسی در ہند، جلد دوم۔ تہیہ شدہ: مرکز تحقیقات زبان فارسی در ہند، دہلی نو۔ محل انتشار۔ خانۂ فرهنگ، جمہوری اسلامی ایران، دہلی نو۔ ۱۴۰۶ھ

۵۔ گنجینۂ ادب المعروف مقالات مجتبیٰ۔ مرتب: ڈاکٹر محمد اعجاز احمد۔ مطبوعہ۔ ادارہ تحقیقات عربی و فارسی، پٹنہ۔ ۲۰۱۰ء

۶۔ سید قاسم حاجی پوری، ایک تحقیقی و تنقیدی مطالعہ مع غزلیات قاسم۔ مصنف: پروفیسر غلام مجتبیٰ انصاری۔ مطبوعہ۔ دی آرٹ پریس، سلطان گنج، پٹنہ۔ ۱۹۷۷ء

۷۔ مولانا محمد نصیر الدّین، احوال و آثار۔ مصنف: پروفیسر غلام مجتبیٰ انصاری۔ مطبوعہ۔ ادارہ تحقیقات عربی و فارسی، پٹنہ۔ ۲۰۱۳ء

۸۔ بہار میں عربی و فارسی زبان و ادب (مجموعہ مقالات) مرتب: ڈاکٹر حسن رضا خاں۔ ناشر: ادارہ تحقیقات عربی و فارسی، پٹنہ۔ ۲۰۱۱ء

۹۔ عبد القیوم انصاری۔ مرتب: غلام مجتبیٰ انصاری۔ ناشر: بہار اردو اکادمی، پٹنہ۔ ۲۰۰۶ء

۱۰۔ فخر ملک عبد القیوم انصاری، احوال و افکار۔ مؤلف: پروفیسر غلام مجتبیٰ انصاری۔ ناشر: عبد القیوم انصاری ایجوکیشنل فاؤنڈیشن۔ ۲۰۰۲ء

۱۱۔ فرهنگ فارسی جدید با معانی اردو۔ مصنف: ڈاکٹر غلام مجتبیٰ انصاری۔ پبلشر: اعجاز احمد، تاتارپور، بھاگلپور۔ جون، ۱۹۸۱ء

۱۲۔ فردوسی اور شاہنامہ۔ (مجموعہ مقالات) مرتب: ڈاکٹر محمد اعجاز احمد۔ ناشر: ادارہ تحقیقات عربی و فارسی، پٹنہ۔ ۲۰۱۵ء

رسائل

۱۔ خدا بخش لائبریری جرنل، پٹنہ۔ مدیر: ڈاکٹر محمد ضیاء الدّین انصاری۔ جولائی۔ ستمبر ۲۰۰۱ء

۲۔ خدا بخش لائبریری جرنل، پٹنہ۔ مدیر: ڈاکٹر امتیاز احمد۔ اپریل۔ جون ۲۰۰۴ء

۳۔ زبان و ادب، پٹنہ۔ مدیر: شاہ مشتاق احمد۔ جنوری ۱۹۷۸ء

۴۔زبان وادب، پٹنہ۔مدیر:شین مظفر پوری۔مئی ۱۹۸۰ء
۵۔قند پارسی۔خانۂ فرہنگ ج۔ا۔ایران۔دہلی نو۔زمستان۔۱۳۷۹۔شمارہ ۱۴
۶۔قند پارسی۔خانۂ فرہنگ ج۔ا۔ایران۔دہلی نو۔زمستان۱۳۸۶ و بھار۱۳۸۷۔شمارہ۳۹۔۴۰

☆☆☆

عدیل احمد
ریسرچ اسکالر، شعبۂ اسلامک اسٹڈیز
علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

نواب وقار الملک کی سیاسی خدمات

نواب وقار الملک کی ذات کسی تعریف کی محتاج نہیں سرسید کے رفقاء میں انکا شمار ہوتا ہے گذشتہ صدی میں انکی شاندار قومی خدمات درخشاں رہیں اور عمر کے آخر ایام میں بھی ان کی ذات تمام قومی وملی تحریروں پر اس قدر حاوی رہی جس کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

مشتاق حسین ۲۹ محرم ۱۲۵۷ھ ۲۴ مارچ ۱۸۴۱ء کو موضع سرادہ ضلع میرٹھ میں پیدا ہوے جہاں انکے والد ملازم تھے تاریخی نام ''چراغ علی'' انکے والد منشی فضل حسین مرادآباد کے رہنے والے تھے اور نسل کے حساب سے ''کنبوہ'' تھے شاہ جہاں کے مشہور وزیر سعداللہ خان ابتدا میں انہیں کے بچوں کی اتالیقی پر مقرر ہوے مولوی مشتاق کی والدہ بتول النساء بیگم جو نیک نفس پابند صوم صلوٰۃ پرہیز گار تھیں۔ ابھی مولوی مشتاق حسین کی عمر چھ ماہ بھی نہیں ہوئی تھی کی انکے والد ۲۷ اگست ۱۸۴۱ء کو انتقال کر گئے، ۴ سال کی عمر میں حافظ غلام نبی قریشی صاحب نے رسم بسم اللہ خوانی ادا کی اور مکتب میں بٹھائے گئے۔ اس زمانے میں باقاعدہ مدارس نہ تھے شرفاء کے محلّہ میں مکتب ہوا کرتے تھے ۶ سال کی عمر میں قرآن مجید ختم کرنے بعد اردو فارسی کی درسی کتابیں شروع کی مکتب کی معمولی تعلیم سے فراغت کے بعد امروہہ کے ایک عالم جس کا نام سید راقب علی تھا عربی پڑھی پھر مرادآباد میں تحصیلی مدارس میں دخلہ لیا ۱۸۹۵ء میں وہاں تعلیم پائی مکتب اور تحصیلی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ۱۸۵۹ء روڑکی انجینئرنگ کالج میں داخلہ لیا چونکہ اس تعلیم سے انکو کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی اس لئے کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ جس کے بعد انکا تعلیمی زمانہ ختم ہو گیا۔ مغلیہ حکومت میں اکثر شریف اور معزز خاندانوں کے کسبِ معاش کا ذریعہ شاہی ملازمت تھی مولوی مشتاق حسین امروہہ کے جس مدارس کے طالب علم تھے اسی میں ۱۸۵۹ء کو دس روپیہ ماہوار پر قائم مقام نائب صدر مدرس ہوئے لیکن ۱۵ روز بعد یہ سلسلہ ختم ہو گیا مولوی مشتاق حسین کی ملازمت کا باقاعدہ آغاز ستمبر ۱۸۶۰ء شروع ہوا جبکہ وہ تحصیل مرادآباد میں ۲۰ روپیہ ماہوار پر محرر انکم ٹیکس مقرر ہوئے ۱۸۶۰ء میں جب مرادآباد میں شدید قحط تھا اسٹریچی جو اس وقت مرادآباد کے کلیکٹر تھے ایک محتاج خانہ جاری کیا جس کا انتظام سید احمد خان کے متعلق تھا اسی زمانہ میں سرسید سے انکا تعارف ہوا چونکہ منشی مشتاق حسین بھی اسی محتاج خانہ میں کام کرتے تھے ضلع بدائیوں

میں سررشتہ دار کے منصب پر فائز ہونے کے بعد علیگڑھ میں ۵۶ روپیہ ماہوار پر سررشتہ دار نائب صدرالصدور کے منصب پر فائز ہوئے یہاں انکو سرسید جو اس وقت صدرالصدور تھے کام کرنے اور انکے خیالات سے مستفید ہونے کا موقع ملا جب سرسید علیگڑھ سے بنارس جانے لگے تو سرسید نے منشی مشتاق حسین کی سروس پر حسب ذیل ریمارک لکھا۔

اس افسر کی دیانت داری پر مجھکو ایسا ہی یقین ہے جیسا کہ اپنی موت پر (سرسید احمد صدر اصدور ۱۸ اگست ۱۸۶۹ء میں مدرسۃ العلوم علیگڑھ کے عہدے آنریری سکریٹری کا انتخاب۔)

۱۵ دسمبر ۱۹۰۷ کو ایک اجلاس منعقد ہوا قائم مقام سکریٹری بہادر خان مزمل اللہ خان صاحب نے بیان کیا انتخاب سیکریٹری کی بابت کل ۴۱ ووٹ بعد جاری کرنے ایجنڈا کے موصول ہوئے ہیں لیکن اکثر صاحبوں نے قبل ایجیڈا کے جو تحریک نواب صاحب (وقارالملک) کے سیکریٹری مقرر کئے جانے کے بارے میں بھیجی تھی اس کو کافی سمجھ کر دوبارہ ووٹ نہیں بھیجے اس لئے سمجھنا چاہئے کی اور بھی ووٹ موصول ہوئے ہیں بہرحال جو ووٹ موصول ہوئے ہیں وہ سب منظوری کے ہیں لہٰذا اب حاضرین کے ووٹ لئے جائیں۔اس پر نواب صاحب وقارالملک بہادر نے بیان کیا کہ یہ معاملہ میری ذاتِ خاص کا ہے کہ بعض حاضرین صرف لحاظ سے ووٹ منظوری کے دیدیں اس لئے حسب قاعدہ بیلٹ کے ذریعہ سے ووٹ لئے جائیں نواب صاحب حسب قاعدہ نمبر ۴۶۔۴۵ تین سال کے لئے آنریری سیکرٹری مدرسۃ العلوم میں مقرر ہوے۔اس عہد پر منتخب ہونے کے بعد نواب صاحب نے محسن الملک میموریل کمیٹی کا قیام کیا جس کے صدر خود نواب صاحب تھے اس کمیٹی کی طرف سے باقاعدہ اعلان شائع کیا گیا جس میں محسن الملک کی قومی خدمات کا اعتراف کرنے اور انکی یادگار میں کام کرنے کے لئے چندہ کی اپیل کی گئی جس میں ۳۲۰۰۰ روپیہ وصول ہوا جس سے صاحب باغ کی زمین خریدی گئی اور وہ بورڈنگ محسن الملک کے نام موسوم ہوئی۔

ایک آزاد محمڈن یونیوسٹی کا قیام سرسید کا نصب العین تھا ان کا یقین تھا کہ جب تک مسلمانوں کی تعلیم کو گورنمنٹ کی مداخلت سے کلیۃً آزاد اور خود مسلمانوں کے ہاتھ پر مبنی نہ ہوں گی مسلمانوں کو پورا فائدہ نہ ہوگا۔چنانچہ ۱۰ جنوری ۱۹۱۱ء کو علیگڑھ میں نواب وقارالملک کی کوٹھی پر ان کی زیر صدارت ''تکمیل محمڈن یونیورسٹی'' کی تجاویز پر غور کرنے کے لئے ایک جلسہ منعقد ہوا اس جلسہ میں یہ قرار پایا کہ ایک کمیٹی بنائی جائے جس کا نام کمیٹی ''تکمیل محمڈن یونیورسٹی'' رکھا جائے آغا خان اس کے صدر اور وقارالملک اس کے سکریٹری قرار پائے۔

اس سے پہلے نواب وقارالملک کی سیاسی خدمات لکھنے سے پہلے اس وقت کے ہندوستان کے سیاسی تحریک کے آغاز اور اس کے اثرات پر بھی روشنی ڈالنی ہوگی جو سیاسی مسائل انگریزی عہد حکومت میں مسلمانوں کے سامنے آئے مغلیہ عہد حکومت میں مسلمانوں کا اس سے کوئی واسطہ نہ تھا۔دولت مغلیہ کے آخری عہد حکومت میں ہندوؤں میں ایک خاص

جذبہ پیدا ہوگیا تھا۔ جابجا بغاوت اور غدر کی علامتیں نمایاں تھیں مراٹھوں کا عروج تھا مرکزی حکومت کمزور ہوچکی تھی یہی زمانہ تھا کہ جب یوروپ کے مختلف اقوام نے آہستہ آہستہ ہندوستان میں داخل ہوکر اپنی حسنِ تدبیر سے ہندوستان کے حکمراں بن گئے اور مغلیہ حکومت دہلی تک محدود ہوکر رہ گئی۔ انگریزی عہد حکومت میں اگرچہ مسلمانوں کو سیاسی قوت باقی نہ تھی لیکن جو اعلیٰ منصب کسی حکومت میں مسلمانوں کو مل سکتے تھے مسلمان اس سے پورے طور پر مستفیذ ہوسکتے تھے کیونکی سرکاری دفاتر میں فارسی اور اردو مروج تھی لیکن میکالے کی سعی تحریک سے گورنمنٹ نے مغربی علوم کو رواج دیا تو سب سے پہلے بنگالی ہندوؤں نے اس کا خیر مقدم کیا اور وہ تعلیم میں سب سے آگے بڑھ گئے جیسے جیسے ہندوستان میں انگریزی حکومت کو استحکام ہوتا گیا تعلیم کا دائرہ بھی وسعت اختیا کرتا گیا ہندو جدید علوم سے فائدہ اٹھاتے رہے لیکن مسلمان اپنی ناعاقبت اندیشی اور غفلت کی وجہ سے ان علوم کی طرف متوجہ نہ ہوسکے اور وہ تعلیم میں ہندوؤں سے پیچھے ہوگئے جس کی تلافی آج تک نہ ہوسکی۔ جدید تعلیم نے ہندوؤں میں حق طلبی کا ایک زبردست جذبہ پیدکر دیا اور اسلامی تاریخ کے متعلق جو کتابیں رائج تھی زیادہ تر یورپی مصنفین کی تھی جس کا مطلب یہ تھا کی جب لوگ گذشتہ پرآشوب زمانہ کو موجودہ دور کے امن وعافیت سے مقابلہ کریں تو انگریزی حکومت کو اپنے حق میں خدا کی رحمت سمجھیں گے۔ عام طور سے جہالت مذہبی تعصّبات کو برانگیختہ کرتی ہے لیکن یہاں ہندوؤں کو ہر اس چیز سے نفرت ہوگئی جو مسلمانوں کی حکومت کی یادگار تھی اسی جذبہ سے انھیں اردو زبان سے بھی نفرت ہوگئی۔ ۱۸۸۴ء میں بنگال کے مشہور اسپیکر سر سریندر ناتھ بنرجی نے ہندوستان کے مختلف شہروں کا دورہ کیا جس کا مقصد تھا کہ ہندوستان کے تعلیم یافتہ لوگوں کو اس بات پر آمادہ کریں کہ گورنمنٹ نے جو سول سروس امتحان کے امیدواروں کی عمر ۲۱ سال سے گھٹا کر ۱۹ سال کی ہے اس کے متعلق گورنمنٹ سے درخواست کی جائے کہ سروس امتحان کی عمر ۲۱ سال کی جائے دوسرے ایک فنڈ بنام ''نیشنل فنڈ'' قائم کیا جائے تا کہ ملکی اغراض کے سلسلہ میں جب گورنمنٹ انگلستان سے کوئی مطالبہ کیا جائے تو مصارف اسی فنڈ سے ہو۔ نیشنل فنڈ کا قیام گویا نیشنل کانگریس کی قیام تھا اور وہ وقت ایسا قریب آگیا تھا جب انفرادی سبب ایک اجتماعی صورت اختیار کریں اور ملک میں ایک ایسی پولیٹکل انجمن قائم ہو جس کے پلیٹ فارم سے سیاسی مسائل پر بحث وگفتگو ہو۔ ۱۸۸۵ء میں انجمن نیشنل کانگریس کے نام سے قائم ہوئی جس کا پہلا اجلاس ممبئی میں منعقد ہوا جس میں تقریباً ۸۰ ڈیلی گیٹ شریک تھے لیکن اس انجمن سے تقریباً ۲۰ سال پہلے مئی ۱۸۶۶ء میں سرسید نے ''برٹش انڈیا ایسوسی ایشن'' قائم کیے لیکن سرسید کی تعلیمی معاملات میں مصروفیت نے ان کو اس میدان میں توجہ دینے کا موقع نہیں دیا۔ انڈین نیشنل کانگریس میں ابتدا سے یہ دعوا کیا گیا تھا کہ یہ کسی خاص مذھب وملت کی مجلس نہیں بلکہ پوری ہندوستانی قوم کی مرکزی مجلس ہے لیکن اس کے پہلے اجلاس میں صرف دو مسلمان ہی شریک تھے سرسید نے اس نیشنل کانگریس کی مخالفت کی کیونکی مسلمان تعلیم میں پس مادہ تھے اور عادت واطوار کے لحاظ سے مشتعل مزاج تھے چنانچہ انہوں

نے بدرالدین طیب جی جو اس کانگریس میں شامل تھے لکھا کہ۔

غدر میں کیا ہوا ہندوؤں نے شروع کیا مسلمان دل جلے تھے وہ بیچ میں کود پڑے ہندو گنگا نہا کر جیسے تھے ویسے ہی رہ گئے مگر مسلمانوں کا تمام خاندان برباد ہو گیا۔۔۔

اگست ۱۸۸۸ء میں سرسید نے علیگڑھ میں ''پیٹریاٹک'' ایسوسی ایشن قائم کی جسکا مقصد تھا جو امراء کانگریس میں شریک نہیں ان کے خیالات پمپلیٹ کے ذریعہ پر انگریزی میں شائع کیے جائیں تا کی ان کے خیالات کے ذریعہ ہندوستان اور انگلستان میں مشتہر کیے جائیں اس تحریک میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک تھے۔

غرض اس زمانی میں سرسید کی تحریک سے مسلمانوں کی یہ پالیٹکس قرار پائی کہ

(۱) مسلمان سیاست میں حصہ لینے سے قطعی اجتناب کریں۔

(۲) کانگریس میں شریک نہ ہوں اور ہر طرح کے ایجیٹیشن سے علیحدہ رہیں۔

(۳) گورنمنٹ کے ساتھ اتحاد عمل رکھیں کیونکی ہندوستان میں انکی فلاح و ترقی گورنمنٹ کی وجود اور اسکے استحکام پر مبنی ہیں۔

سرسید کا یہ خیال تھا کہ اگر مسلمان کسی قسم کی ایجیٹیشن میں حصہ لیں گے تو گورنمنٹ ان سے چشم پوشی نہ کرے گی خود مدراس کے گورنر نے اپنی تقریر میں اس طرف اشارہ کیا تھا:

عقاب چڑیوں کی چائیں چائیں کی کچھ پرواہ نہیں کرتا لیکن اگر باز اس کے آگے چوں بھی کرتا ہے تو فوراً اس کی گردن موڑ ڈالتا ہے۔

ابتدا میں سرسید ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے لیکن ۱۸۶۷ء میں بعض سربراہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو تمام سرکاری عدالتوں سے اردو زبان اور فارسی زبان کو نکال کر دیوناگری میں لکھی جائے۔

اس تحریک نے سرسید کو مایوس کیا اور اس کے بعد اب سرسید کے پاس سیاست سے علیحدہ رہنے اور گورنمنٹ سے اتحاد عمل رکھنے کا مشورہ دینے کے علاوہ کوئی راستہ نہ تھا لیکن اس زمانہ میں کبھی کبھی گورنمنٹ سے ایسے معاملات پیش آئے تھے کہ کچھ کہنے کی ضرورت ہوئی تو سرسید اور ان کے رفقاء باہم جمع ہو کر درخواست کرتے تھے یا سوسائٹی کے اخبار میں شائع کرتے تھے عام مسلمان اور علماء سرسید کے مذہبی خیالات سے ہم آہنگ نہ تھے لیکن سیاسی معاملات میں ان کی اصابتِ رائے اور طرز عمل کے اکثر لوگ معترف تھے اس لئے سرسید کی رائے مسلمانوں کی عام رائے سمجھی جاتی تھی اور گورنمنٹ اسی حیثیت سے ان کی رائے پر توجہ کرتی تھی جس کی وجہ سے تمام مسلمان کانگریس سے علیحدہ رہے۔

لیکن جیسے جیسے مسلمانوں میں تعلیمی ترقی ہوئی اور کانگریس کا دائرہ اقتدار وسعت اختیار کرتا گیا اور اخبارات بھی

سیاسی مضامین لکھنے لگے تو مسلم نوجوان اس حالات سے متاثر ہوئے اور ان کو یہ خیال پیدا ہوا کہ مسلمانوں کو بھی سیاست میں حصہ لینا چاہئے چنانچہ ۳۰ دسمبر ۱۸۹۳ء کو سرسید کے مکان پر ایک جلسہ مسٹر بیک کے ایڈرس سے منعقد ہوا اپنی تقریر میں مسٹر بیک نے کہا

(۱) ہندوؤں کے ایجیٹیشن میں شریک ہونا

(۲) ہندوؤں کے مخالف ایجیٹیشن کرنا

(۳) کچھ نہ کرنا بلکہ اپنی کوشش کو صرف تعلیم کی جانب مصروف رکھنا

(۴) پولیٹیکل مستعدی کا ایک ترمیم شدہ طریقہ اختیار کرنا یعنی نا بالکل خاموش رہنا نہ ایجیٹیشن۔

مسٹر بیک نے ان میں سے ہر طریقہ پر تفصیلی بحث کرنے کے بعد مسلمانوں کو آخر الذکر طریقہ اختیار کرنے کو کہا کہ اب مسلمان نوجوانوں کو پالیٹکس (Politics) میں حصہ لینے سے باز رکھنا ناممکن ہے۔ اس تقریر میں انہوں نے کام کرنے کا تفصیل سے طریقہ بھی بتایا۔ تقریر کے خاتمہ کے بعد سرسید کی تحریک اور محسن الملک کی تائید کے بعد یہ رزولوشن (Resoulution) پاس ہوا کہ :

''ایک ایسوسی ایشن محمڈن اینگلو اورینٹل ڈفینس ایسوسی ایشن اپر انڈیا (Mohammadan Anglo Oriental Association Upper India) کے نام سے قائم کی جائے۔''

یہ انجمن تو قائم ہوگئی لیکن سرسید کی تمام تر توجہ تعلیمی اُمور پر تھی اور انحطاط عمر کی وجہ سے یہ ایسوسی ایشن کچھ نہ کرسکی۔ سرسید کی وفات کے بعد صوبہ میں اردو ہندی تنازع شروع ہوا اور ہندوؤں کی کوشش سے عدالتوں میں ہندی زبان رائج ہوگئی۔ اس واقعہ سے مسلمانوں کے دل پہ نہایت گہرا اثر پڑا۔ اور مسلمان یہ محسوس کرنے لگے کہ پولیٹکل معاملات سے علیحدگی اور خاموشی موت کے مترادف ہوگی اس زمانے میں مسٹر ماریسن کالج کے پرنسپل تھے۔ مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی کا منصب اختیار کیا اور مسلمانوں کو یہ بتایا کہ مسلمانوں کو اپنے پولیٹکل حقوق کی حفاظت کے لیے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے۔ انہوں نے کسی ایسوسی ایشن کے قیام کو ناممکن العمل اور فضول بتایا ایک کونسل قائم کرنے کی رائے دی جس کا سکریٹری ایک تنخواہ خوار ہو اور جو لوگ سیاسی معاملات سے دلچسپی رکھتے ہوں وہ کبھی کبھی جمع ہوکر بحث و گفتگو کیا کریں۔ کونسل کا ایک ریڈنگ روم ہو اور اس کے پالیٹکل خیالات رسالوں کے ذریعہ سے اختیارات آبزرور کے ذریعہ سے شائع کیے جائیں جس میں مضامین لکھ کر مسلمانوں کی کانگریس کی شرکت اور اس کے نتائج سے آگاہ کیا اور یہ رائے دی کہ مخصوص

احباب کی جوایسوسی ایشن سرسید نے ۱۸۹۳ء میں قائم کی تھی اس کو زندہ کیا جائے۔نواب وقار الملک بھی سرسید کے حلقہ کے ایک رکن تھے لیکن ابتدا میں سرکاری ملازمت اور حیدرآباد چلے جانے کے بعد ان کو عملی سیاست میں حصہ لینے کا موقع نہ ملا۔ البتہ اس زمانہ میں ایک دفع ۱۸۸۸ء جب وہ کسی ضرورت سے بمبئی آئے ہوئے تھے ایک مختصر سا مضمون ٹائمز آف انڈیا میں لکھا جس میں مسلمانوں کو کانگریس سے باز رہنے کی ہدایت کی تھی یہ ٹھیک وہی زمانہ تھا جبکہ سرسید شمالی ہند میں کانگریس کے برخلاف تبلیغ واشاعت میں مصروف تھے.....

حیدرآباد سے واپسی کے بعد وہ خانگی مشکلات میں مبتلا ہوگئے اس کے علاوہ اسکولوں میں مذہبی تعلیم کے رائج کرنے اور روایتی برداری میں اصلاح رسوم پر ان کی توجہ رہی.....سرسید کی وفات کے بعد کالج میں مسلسل طور پر جو واقعات پیش آئے انہیں اس میں مبتلا ہونا پڑا یہاں تک ۱۹۰۰ء میں اردو ہندی تنازعہ اسی صوبہ سے شروع ہوا اور اس صوبہ کی گورنمنٹ نے عدالتوں میں ہندی رائج کرنے کا حکم جاری کر دیا تو مسلمانوں میں ایک بے چینی پھیل گئی اور علی گڑھ میں بھی اس کا خاص اثر محسوس ہوا۔مئی ۱۹۰۰ء کو علی گڑھ میں اس رزولوشن کے خلاف جلسہ ہوا جس میں نواب وقار الملک نے بھی حصہ لیا پھر اس کے بعد ۱۹۔۱۸/اگست ۱۹۰۰ء لکھنؤ کے قیصر باغ میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت محسن الملک نے کی اور وقار الملک بھی شریک تھے اور ایک زبردست تقریر کی جس میں صراحت کے مثالیں دے کر بیان کیا کہ دیوناگری حروف کے رواج دینے کے لیے برادران وطن کیسی سازشیں اور ناپاک تدبیریں کر رہے ہیں انہوں نے لوگوں کو حوصلہ دیا کہ وہ استقلال کے ساتھ اپنی کوشش اس رزولوشن کے علاوہ جاری رکھیں اور تقریر کے خاتمہ پر کہا کہ :

''مجھ کو امید ہے کہ ہماری کوششوں سے ملک کو اس دن کو دیکھنے کا موقع نہ ملے گا جب کہ اردو کا جنازہ سرکاری دفتروں سے اٹھایا جاتا ہو یہ جملہ نواب وقار الملک کی سیاسی زندگی کا باقاعدہ آغاز تھا۔اس جلسہ کے بعد انہوں نے یہ محسوس کیا کہ اب خاموشی کا وقت نہیں ہے۔''

البشیر اخبار نے لکھا:

''مسلمانوں میں جو لوگ ہر قسم کی سیاسی کارروائیوں سے اجتناب کرنا اور صرف گورنمنٹ کی مہربانی پر بھروسہ کرنے کی پالیسی کے حامی اور ساعی تھے خود ان ہی لوگوں میں گورنمنٹ ممالک متحدہ کی کارروائیوں سے یہ خیال پیدا ہوا کہ جب تک مسلمانوں کی پالیٹکل ایسوسی ایشن نہیں ہوگی مسلمانوں کو نقصان پہنچے گا۔''

ان مباحث ومضامین کا یہ اثر ہوا کہ ایک جلسہ ۲۲۔۲۱/اکتوبر ۱۹۰۲ء کو مسٹر حامد علی خاں بیرسٹر کی کوٹھی پر لکھنؤ میں

منعقد ہوا۔ سید محمد شرف الدین صاحب بیرسٹر اس جلسہ کے صدر بنائے گئے۔ اپنی تقریر میں صدر جلسہ نے کہا کہ تمام ہندوستان میں کچھ عرصے سے مسلمانوں کا درجہ کس طرح روز بروز تنزل کرتا جاتا ہے اور خاص خاص صوبوں میں بھی ان کے پولیٹکل حقوق پر حملہ ہو رہا ہے اردو ناگری کے مسئلہ اور سرکاری عہدوں پر مسلمانوں کی قلت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ بھی بیان کیا کہ مسلمان وائسرائے کی قانونی کونسل اور صوبہ کی کونسلوں میں اپنے انتخاب سے ممبر نہیں بھیج سکتے.....

دوسرے روز نواب وقار الملک کی زیر صدارت جلسہ منعقد ہوا جس میں حسب ذیل تجاویز منظور ہوئی۔

(۱) اس جلسہ کی یہ رائے ہے کہ مسلمان ہندوستان میں ایک ایسی (کمیٹی) قائم کرنی چاہیئے جو اپنے سوشل اور پولیٹکل معاملات اور ضروریات میں متفقہ طور پر کارروائی کر سکے.....

(۲) اس جلسہ کی رائے ہے کہ اس کمیٹی کا ایک مقصد یہ ہوگا کہ مسلمانوں کی تقریبات وغیرہ میں مصارف بے جا روکنے اور تہذیب اخلاق اور دیگر امور معاشرت کی درستی میں کوشش کرے۔

(۳) اس جلسہ کی رائے ہے کہ اس کمیٹی کا ایک مقصد یہ ہوگا کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں اس دعوٰہ کو ذہن نشیں کیا جائے کہ ان کی بہبود صرف اس پر منحصر ہے کہ ہندوستان میں برٹش حکومت کو دوام واستحکام حاصل رہے۔

(۴) اس جلسہ کی رائے ہے کہ کمیٹی کا ایک مقصد یہ ہوگا کہ مسلمانوں کی ضروریات کو اعتدال اور ادب کے ساتھ گورنمنٹ میں پیش کرے اور اس بات کی کوشش کرے کہ گورنمنٹ کی جو اصل منشا ہو اس کے سمجھنے میں مسلمان پبلک کو کوئی غلط فہمی واقع نہ ہو.....

(۵) اس جلسہ کی رائے ہے کہ مقاصد متذکرہ بالا کو ملحوظ رکھتے ہوئے کمیٹی کو دوسرے قوموں کی کسب معاندانہ برتاؤ سے اجتناب کرنا چاہیئے۔

(۶) اس جلسہ کی رائے ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس کے دو بڑے اصول ایک ان کا مطالبہ Representative گورنمنٹ اور دوسرا گورنمنٹ کے عہدوں پر امیدواروں کا تقرر امتحان مقابلہ کے ذریعہ سے ہندوستان کے مسلمانوں کے حق میں مضر ہیں۔ اور اس کے علاوہ کانگریس میں بعض ایسے رزولوشن پیش ہوتے ہی جس پر اگر عملدرآمد ہو تو ہندوستان میں برٹش گورنمنٹ کے قیام واستحکام میں خطرہ پیش ہوگا جس سے مسلمان اتفاق نہیں کر سکتے۔

اس اجلاس کے بعد نواب وقار الملک صاحب نے مختلف اضلاع میں دورہ کیا اور پولیٹکل ایسوسی ایشن کے اغراض ومقاصد لوگوں کو سمجھانے اور جلسہ منعقد کرانے میں کامیاب ہوئے۔

اسی زمانہ میں گورنمنٹ نے ہندوستانی کونسلوں کو از سر نو ترتیب دینے کا ارادہ کیا اور رعایہ کے مختلف گروہوں کے

حقوق کا معاملہ زیر بحث آیا۔ مسلمانوں کے تعلیمی و سیاسی مرکز علی گڑھ میں بھی جنبش ہوئی۔ نواب وقار الملک نے ایک مفصل یاد داشت مرتب کر کے نواب محسن الملک کو بھیج دی مختلف سیاسی مسائل پر گفتگو ہونے کے بعد یہ طے ہوا کہ پولیٹکل معاملات سے علیحدگی مسلمانوں کے لیے مضر ہے اس لیے ضرورت جلد سے جلد ایک پولیٹکل ایسوسی ایشن کا قیام مسلمانان ہند کے لیے قائم کی جائے اور مسلمان اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے کوئی مستقل انتظام کریں۔

نواب وقار الملک جو کہ پہلے سے سیاسی جدوجہد میں مصروف تھے اسی سال ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ڈھاکہ میں ہونے والا تھا۔ نواب وقار الملک نے یہ خواہش ظاہر کی کہ کانفرنس کے اجلاس کے بعد ۳۰ر دسمبر ۱۹۰۶ء کا دن پولیٹکل آرگنائزیشن کے واسطے مخصوص کر دیا جائے لیکن کانفرنس کے سکریٹری نواب محسن الملک کی طرف سے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں حسب ذیل اعلان شائع ہوا :

''محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے قواعد میں یہ امر داخل ہے کہ اسے پالیٹکس سے کچھ تعلق نہ ہوگا، نہ اس پر کسی قسم کی کانفرنس میں بحث کرنے کی اجازت ہوگی۔ یہ اصول کانفرنس کی جب بنیاد پڑ رہی تھی اس وقت مقرر قرار دیا گیا تھا۔ جواب تک بدستور قائم ہے اور آئندہ قائم رہے گا۔''

بہر حال کسی قدر مراسلت کے بعد ڈھاکہ میں ایسوسی ایشن کے جلسہ کا انتظام ہو گیا اور ۳۰ر دسمبر کی تاریخ اس کے لیے تجویز کی گئی۔ ۳۰ر دسمبر ۱۹۰۶ء کو جلسہ شروع ہوا اور نواب صاحب ڈھاکہ کی تحریک سے نواب وقار الملک اس جلسہ کے صدر تجویز ہوئے جس میں حسب ذیل تجویزیں منظور ہوئیں۔

یہ جلسہ جس میں ہندوستان کے ہر حصہ کے مسلمان بہ مقام ڈھاکہ شریک ہیں فیصلہ کرتا ہے کہ ایک پولیٹکل ایسوسی ایشن بنام آل انڈیا مسلم لیگ حسب ذیل مقاصد کے لیے قائم ہونی چاہیئے۔

(۱) مسلمانان ہند کے دل میں برٹش گورنمنٹ کی نسبت وفادارانہ خیالات کو ترقی دینا اور گورنمنٹ کی کسی کارروائی کے متعلق ان میں جو غلط فہمی ہوا سے دور کرنا۔

(۲) مسلمانان ہند کے پولیٹکل حقوق و قواعد کی نگہداشت اور ان کی ضروریات کو مؤدبانہ طریقہ سے گورنمنٹ میں پیش کرنا۔

(۳) لیگ کے دیگر مقاصد کو نقصان پہنچائے بغیر مسلمانان ہند میں ایسے خیالات پیدا نہ ہونے دینا جو دوسرے فرقوں کے لیے نقصان دہ ہوں۔

مسلم لیگ کے اجلاس کے بعد نواب صاحب لیگ کے کام میں مصروف رہے چنانچہ اسی سلسلہ میں انہوں نے

۲۳/مارچ ۱۹۰۷ء کو علی گڑھ کالج میں طلبہ کے سامنے مسلمانانِ ہند کی پالیٹکس پر ایک اسپیچ دی جس میں انہوں نے طلبہ کو سمجھایا اور کانگریس کی مضرتیں بیان کرتے ہوئے اب تک خاموش رہنے کی پالیسی پر بحث کرتے ہوئے فرمایا :

''حقیقت یہ ہے کہ اب تک ہمارا خاموش رہنا اور کوئی پولیٹکل مجلس نہ بنانا اور اسے قومی نفع ونقصان پر غور نہ کرنا اور تعلیم یافتہ کو آزادی کے ساتھ ان مسائل پر بحث کرنے کا موقع نہ دینا جس پر ان کی قوم کی بقاء کا دارومدار ہے بدقسمتی سے اس خاموش پالیسی نے ہمارے بہت سے حقوق صلب کرڈالے ہیں۔اب ہم مسلمانوں کی ایک خاص پولیٹکل مجلس قائم ہوگی جس کا نام ''آل انڈیا مسلم لیگ'' ہے۔

۱۹۰۹ء میں رفارم اسکیم کے سلسلہ میں مشترکہ انتخاب کا مسئلہ معرکۃ الآرا مسئلہ تھا خود مسلمانوں میں بعض آزاد اور تعلیم یافتہ مسلمان مشترکہ انتخاب کے حامی تھے لیکن نواب صاحب کو معقول وجوہ کی بنیاد پر اس سے اختلاف تھا۔

مشترکہ انتخاب کے متعلق نواب صاحب نے کہا کہ مسلمانوں کو ہمیشہ ایسی پالیسی رکھنی چاہیئے کہ جس طرح ہمیشہ سے مسلمانوں اور ہندوؤں کا چولی دامن کا ساتھ رہا ویسے ہی آئندہ برقرار رہنا چاہیئے اور بغیر اپنے پولیٹکل حقوق کو صدمہ پہنچائے ہوئے جہاں تک ممکن ہے یہ کوشش ہونی چاہیئے کہ دونوں گروہ باہم شیر وشکر رہیں۔مسلمانوں کا مشترکہ انتخاب میں شریک ہونا مسلمانوں کے لیے ضرور مضر ہوگا ہمارے لیے صحیح وقت یہی ہے کہ ہم مشترکہ انتخاب سے علیحدہ رہیں اور جو کچھ گورنمنٹ ہمیں دے وہ علیحدہ انتخاب کے ذریعہ سے دے ہم اس پر قائم رہیں۔اور اگر مشترکہ انتخابات کے ذریعہ کسی مقام پر کامیابی ہوئی تو وہ ہماری کوششوں کی وجہ سے نہ ہوگی بلکہ وہ دوسرے غالب گروہ کی مہربانی کی وجہ سے ہوگی اور پھر وہ مہربانی معلوم نہیں کہ کس قسم کے معاوضوں اور اقراروں پر مبنی ہوگی۔

۱۹۰۵ء میں لارڈ کرزن کے عہد میں بنگال کا وسیع صوبہ دو صوبوں پر منقسم کردیا گیا اور مشرقی بنگال ایک علیحدہ صوبہ قرار دیا جہاں مسلمانوں کی آبادی زیادہ تھی۔یہ تقسیم عام مسلمانوں کے لیے مفید سمجھی گئی۔ہندو بنگالی اس تقسیم کے سخت مخالف تھے۔۱۹۱۱ء میں ملک معظم قیصر ہند نے تقسیم بنگال کی تنسیخ کا بھی اعلان کردیا جس نے مسلمانوں کو سخت حیرت زدہ کردیا۔نواب صاحب بھی اس اعلان سے بے حد متاثر ہوئے اور سمجھ گئے کہ ہوا کا رُخ کس طرف ہے چونکہ وہ مسلمانوں کے مسلمہ لیڈر تھے اس لیے ان کا فرض تھا کہ صحیح طریقہ سے مسلمانوں کی رہنمائی کرے چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور ایک مضمون انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع کیا جو مسلمانانِ ہند کی سیاسی تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے کیونکہ عام طور پر یہ یقین کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی سیاست کا دور جدید ۱۹۱۲ء سے اسی مضمون کے بعد شروع ہوا جس میں انہوں نے لکھا تھا :

''ہم اس سے تو متفق ہیں کہ گورنمنٹ کی طرف سے ضرور ایسی کارروائی ہوئی جس سے مسلمانوں کے دلوں کو واجبی طور پر صدمہ پہنچا ہے لیکن اس سے ہم کو قطعی اختلاف ہے کہ اپنے قومی شیرازہ کو منتشر کر کے ہم دوسرے زبردست گروہ کے ساتھ اس طرح شامل ہو جائیں جس طرح کوئی دریا سمندر میں شامل ہو کر اپنی ہستی کو معدوم کر دیتا ہے ہماری علیحدگی کانگریس وغیرہ سے اس بنا پر ہے کہ ہم کو گورنمنٹ کے ساتھ وفادار رہنا چاہیئے ۔ وفاداری خود غرضی ہے نہ کہ جوہر۔ مسلمان جو من حیث القوم نیشنل کانگریس سے اب تک علیحدہ رہے ہیں اس کی بنیاد یہ ہے کہ اس کا سوا راج مسلمانوں کے حق میں تباہ کن ہے۔''

نواب صاحب (وقار الملک) کے مضمون کا یہ اثر ہوا کہ مسلمانوں کے سیاسی خیالات میں زبردست انقلاب پیدا ہوا یہاں تک کہ چند روز بعد مسلم لیگ نے بھی سیلف گورنمنٹ کو اپنا نصب العین قرار دے دیا۔ وقار الملک کا یہ بھی ایک سیاسی کارنامہ ہے کہ انہوں نے کالج کا سکریٹری ہونے کے چند ماہ بعد اس دیرینہ قاعدہ کو توڑ دیا جہاں ایک مدت تک مسلمانوں کا سیاسی مباحث میں حصہ لینا ایک مدت تک ناجائز سمجھا گیا۔ چنانچہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ نے یہ اطلاع حسب ذیل شائع کی۔

کالج کے طلبہ کو اب تک پولیٹکل مسائل پر گفتگو کرنے کی بحث ومباحثہ کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ نواب وقار الملک کے مثل دیگر معاملات کالج کے اب اس کی طرف بھی اپنی خاص توجہ مبذول کی ہے انہوں نے ہدایت کی ہے اگر یونین کلب میں کوئی پولیٹکل مضمون بحث ومباحثہ کے لیے پیش کیا جائے تو اس مضمون کے تائید اور مخالف حسب معمول فرضی طور پر اس کی تائید وتردید نہ کریں بلکہ انہی اصلی خیالات کے لحاظ سے پیش کردہ تحریک کے موئید ومخالف ہوں۔

اسی زمانہ میں جب کہ نواب صاحب نے طلبہ کو سیاسی مسائل پر گفتگو کرنے کی آزادی دی۔ لندن میں MAO کالج کا سالانہ جلسہ زیر صدارت سر جیمس (Sir James) منعقد ہوا اس موقع پر ایک اسپیکر نے نواب صاحب کے اس طریق عمل پر بحث کرتے ہوئے کہا۔

کالج کے موجودہ سکریٹری علی گڑھ والوں میں مذہبی روح پھونکنے کے لئے انہوں نے جدید تجویز اختیار کی ہے لیکن اس امید کو میں نہایت مسرت سے بیان کرنا چاہتا ہوں کہ جناب ممدوح جبری پالیسی کے حامی نہیں معلوم ہوتے انہوں نے اپنے زمانے میں نہایت دانشمندی کے ساتھ اس امر کی اجازت دیدی ہے کہ علی گڑھ کے یونین کلب میں ملکی معاملات پر آزادانہ مباحثہ ہو۔

نواب وقار الملک دنیائے اسلام کے ان مصائب سے بے حد متأثر ہوئے انہوں نے ترکوں کی حمایت میں متعدد مضامین لکھے اور نہایت جوش سے مسلمانوں کو چندہ دینے کے لئے آمادہ کیا نواب وقار الملک ۱۹۰۱ء سے ۱۹۱۶ء تک مسلسل طور پر ان سیاسی معاملات میں حصہ لیتے رہے۔ انہوں نے مسجد کانپور معاملے میں بھی حصہ لیا۔ اس طرح نواب صاحب کے سیاسی خیالات میں ترقی ہوتی رہی جس کا سلسلہ ۱۹۱۲ء جاری رہا۔

محمد احسان
ریسرچ اسکالر، شعبہ فارس
جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، لکھنؤ

خواجہ جہاں: سلطنت بہمنی کا ایک ادب پرور وزیر

سرزمین دکن جنوب ہند ہمیشہ سے علم وادب تہذیب وتمدن اور تصوف وفلسفہ گہوارہ رہا ہے بہمنی سلطنت کی ابتدا ءتقریبا چودھویں صدی کے درمیان (۱۳۴۷- ۱۵۲۷) وجود میں آئی، بہمنی سلاطین کا زیادہ تر وقت حدود سلطنت میں امن وامان کی فضا قائم کرنے پر صرف ہوا، اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے زمانے میں ادبی، علمی اور فنی ترقی بھی خوب ہوئی، جو اس بات کا بین ثبوت ہے کہ بہمنی سلاطین کا ادبی ذوق نہایت بلند تھا، تغلق اور خلجی کی طرح بہمنی سلطنت نے بھی زبان وادب کی آبیاری کی، ان کے دربار میں ادباء، شعراء، فلاسفہ، مورخین، اور صوفیائے کرام کی ایک بڑی تعداد رہا کرتی تھی، سلاطین کے ادبی ذوق اور ان کے ذریعے صاحبان فن کی حوصلہ افزائی کو دیکھتے ہوئے خراسان و ماوراء النہر کے دانشوران ادباء اور شعراء ان کے دربار کا رخ کرنے لگے، بہمنی سلاطین اپنے تقریبا دوسو سالہ حکومت میں زبان فارسی کی ترویج واشاعت کی طرف اس طرح توجہ دی کہ بہت جلد گلبرگہ اور بیدر سارے علوم وفنون کا مرکز بن گیا۔[1]

> ''سلطنت بہمنیہ عہد وسطی کی ایک سلطنت تھی جس میں بادشاہ کی شخصیت اور دربار کو غیر معمولی اہمیت حاصل تھی، مملکت کی ادبی علمی اور تمدنی زندگی کا محور اور مرکز بادشاہ کی ذات ہوتی تھی، اور جب شاہی تخت وتاج کو زینت دینے والے خود بھی نہ صرف شعر وفہم وسرپرست بلکہ بلند پایہ شعر گو تھے تو شعر وادب کی خوشبو سے مملکت کی فضا معطر ہو جاتی تھی۔ ایرانی نژاد ہونے کی بناء پر ان کو فارسی زبان وادب سے طبعی طور پر خاص شغف تھا، اس لئے ان کے زمانے میں فارسی زبان وادب کا خاص فروغ حاصل ہوا۔ چنانچہ بانی ءسلطنت علاء الدین حسن بہمنی علم و ہنر کا قدرداں شرفاء پرور اور کاردان بادشاہ تھا، اس کو علم وادب سے بڑی دلچسپی تھی، وہ اپنی فرصت کے اوقات علماء کی صحبت میں گذارتا تھا، داد ودہش عدل وانصاف اور علم پروری کی بناء پر شمالی ہند کے بہت سے منتخب ادیب وعلماء دکن چلے آئے، اس نے اپنے بیٹوں

کو بھی فارسی کی اعلیٰ تعلیم دلوائی تھی''۔[۲]

محمد شاہ اول نے بھی اپنے والد سلطان علاء الدین حسن بہمنی نے اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے فارسی زبان وادب کی ترویج وترقی کی روایت کو برقرار رکھا۔ محمد شاہ بہمنی اس سلسلے کا نہایت مدبر ومفکر بادشاہ تھا، ایک طرف فن حرب میں مورخین ان کی مہارت کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتے، تو دوسری طرف اس کے ادبی ذوق کی بلندی بھی زبان و ادب کی تاریخ پڑھنے والے کو حیرت میں ڈال دیتی ہے، چناچہ جب ان سے زین الدین داؤد کی شان میں گستاخی سرزد ہوئی تو معافی کے سلسلے میں یہ شعر ان کی خدمت میں لکھ کر بھیجا۔

من زان توام زان من باش
خوش باشد عشق اتفاق

یہ سرزمیں دکن بہمنی عہد میں بیشمار صوفیائے کرام اور ولی اللہ کا مسکن رہا ہے، انھیں میں ایک حضرت سید حسینی گیسوئے دراز خواجہ بندۂ نواز دکن کی جلیل القدر ہستی تھی، جنھوں نے اپنے روحانی علم سے دکن کو منور کیا، ان کے روحانی فیوض و برکات سے نہ صرف دکن کے لوگ بلکہ سارے ہندوستان کے عوام فیضیاب ہوتے تھے، اسی طرح وسیع النظر مورخ عبدالملک عصامی کا بھی نام لیا جا سکتا ہے جس نے فتوح السلاطین کے نام سے دکن کی منظوم تاریخ لکھی، اور ذھنوں میں فردوسی کی یاد تازہ کردی، فتوح السلاطین کا ادبی وشعری معیار اتنا بلند ہے کہ اسے شاہنامہ دکن یا شاہنامہ ہند کہا جاتا ہے۔[۳]

خواجہ محمود گاوان بہمنی سلسلہ کے لائق ترین وزیر تھے، ان کا تعلق گیلان کے ایک معزز اور شریف خاندان سے تھا، گیلان کے کچھ امراء کے سیاسی سازشوں کا شکار ہونے کی وجہ سے بدظن ہوکر دکن کی طرف راہ ہجرت اختیار کی اور کچھ ہی مدت میں خواجہ محمود گاوان اپنی خداداد فکری اور سیاسی صلاحیتوں کی وجہ سے سلاطین بہمنی کی دربار میں رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔

> ''خواجہ محمود گاوان ہر حیثیت سے سلاطین بہمنیہ بیدر کے دور کی سب سے ممتاز شخصیت تھی، وہ مجلس شوری میں بیدار مغز مشیر میدان جنگ میں خوش تدبیر سپہ سالار علماء میں عالم باعمل اور سیاست کے میدان میں ایک کامیاب وزیر اعظم تھا، وہ نہ صرف دکن کی عہد وسطی کی تاریخ میں عدیم النظیر ہے، بلکہ تاریخ اسلام میں ایسے مجموع الصفات فرد نادر الوجود ہیں کے دکن کے عہد وسطی کی تاریخ کی درخشانی اس کے تعلیمی ادبی اور سیاسی وتمدنی کارناموں سے عبارت ہے، غیر معمولی ادبی صلاحیتوں اور سیاسی بصیرت کی بناء پر نظام الملک طوسی ابوالفضل علامی اور سعداللہ

خان کی صف میں کیا جاسکتا ہے''۔[۴]

محمود گاوان کو سلطان علاء الدین احمد شاہ ثانی نے دہلی جانے سے روک لیا تھا، اور کئی انتظامی امور کی ذمہ داری ان کے سپرد کی تھی اور منصب ہزاری سے نوازا تھا، ہمایوں شاہ نے اسے ملک التجار کے لقب سے نوازا اور شاہی وکیل اور بیجاپور کا طرف دار مقرر کیا تھا۔ نظام شاہ کی کم سنی کی وجہ سے اسے مجلس تولیت کا رکن مقرر کیا تھا، اور جمیعت الملک اور وزیر کل کے خطاب سے نوازا تھا۔[۵]

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سلاطین بہمنی کو ادب کے ترویج وترقی میں اس قدر کامیابی کیسے ملی، تو اس کا جواب میرے محدود مطالعہ کی روشنی میں یہ ہے کہ ان سلاطین کو ایسے امراء اور وزراء میسر آئے جنھوں نے اپنے شعور وتدبیر کے ذریعے خوش اسلوبی سے یہ فرض انجام دیا، ان میں سے ایک اہم خواجہ محمود گاوان تھے۔

سلطنت بہمنی کے تمام سیاسی امور خواجہ محمود گاوان اور نرگس بانو ملکہ مخدومہ جہان کی مشورے سے طے کئے جاتے تھے، ۱۴۷۲ میں بیدر میں ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی گئی تھی تاکہ دکن میں علمی سرگرمی کو رواج عام میں لایا جائے، محمود گاوان کے سیاسی شعور اور تجربہ کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے انتقال کے بعد ہی بہمنی سلطنت کا زوال شروع ہوگیا لیکن ان کے بعد بھی ان کا قائم کردہ ادارہ عوامی علمی بیداری میں اپنا کردار ادا کرتا رہا۔

محمود گاوان کے علمی کارنامے:

محمود گاوان فارسی زبان وادب کے تمام اصناف جیسے نظم ونثر اور انشاء پردازی میں کامل مہارت رکھتے تھے، اور خط سیاق سے اچھی واقفیت تھی، انھوں نے جو تصانیف بھی چھوڑی ہیں اس سے ان کے علمی ذوق اور مطالعہ کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ بالخصوص نثری اصناف پر مکمل عبور رکھتے تھے۔ ان کی نثری خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے عبدالرحمٰن جامی نے شاعرانہ انداز میں کچھ اس طرح بیان کیا ہے۔

فقرہائے نثر او قوت دہ پشت ہنر　　نکتہ ہائے نظم او روشن گر شمع ذکا

ان کے خطوط پر ایک نظر:

ان کی دو اہم اور نادر تصانیف نثر میں موجود ہیں ان ہی دو کتابوں کی وجہ سے خواجہ کا نام فارسی ادب میں زندہ رہیگا۔

۱۔ ریاض الانشاء: اس میں وہ تین خطوط بھی شامل ہیں، جو دکن آنے سے پہلے انہوں نے تحریر کیا تھا۔ اس کے علاوہ مکہ اور شام سے اپنے بڑے بھائی شہاب الدین محمد کو ارسال کئے ہوئے خطوط بھی شامل ہیں، یہ خطوط تقریبا نصف صدی کے حالات پر مشتمل ہے، خواجہ محمود گاوان کے ۱۴۸ خطوط کا مجموعہ ہے۔ ''جو عہد وسطی کی انشاء کا اعلی نمونہ ہیں، اور

بلاشبہ ادبی شاہکار کا اعلیٰ نمونہ ہے، دکن میں ورود قبل کے تین خطوط بھی اس میں شامل ہیں، وہ خطوط جو اس نے مکہ اور شام سے اپنے بڑے بھائی شہاب الدین محمد کو لکھا، ان میں سیاست علم و ادب تہذیب و تمدن نفسیات رزم و بزم کے تعلق سے ایک جہاں معانی آباد ہیں، جس سے اس کی ہمہ گیر شخصیت اور سیاست و ادب کے امتزاج پر جو روشنی پڑتی ہے اس کا اندازہ ہوتا ہے''۔ [۶]

وہ خطوط جو ہندوستان کے باہر کے بادشاہوں وزیروں اور شاہزادوں کے لئے لکھے گئے ہیں جیسے ترکی کے بادشاہ سلطان حسین بائیقرا، گیلان کے شاہزادوں اور شاہزادیوں ان خطوط میں بہمنی سلطنت کے ساتھ سیاسی تعلقات کے بارے میں ذکر ملتا ہے۔ ایسے خطوط جو ہندوستان کے بادشاہوں کے نام ہیں جن میں مالوہ اور جونپور کے بادشاہ اور وزیر شامل ہیں، ان خطوط میں اس عہد کے ممالک کے درمیان سفارتی تعلقات کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ خطوط جو میدان کارزار سے دکن کے وزیروں کے نام لکھے گئے ہیں، جس میں بہمنی دربار میں خواجہ کے حاسدوں نے ان کے قتل کی سازش کی تھی اس کے متعلق ذکر ملتا ہے۔ [۷]

اور وہ خطوط جن میں ان کے عزیزوں دوستوں اور فرزندوں کے بارے میں نیک خیالات کے بارے میں ذکر ہے، یہ خانگی نوعیت کے خطوط ہیں، ان کے خطوط سے دکن کے تاریخی سماجی حالات اور تہذیب و تمدن کے متعلق کچھ نہ کچھ معلومات میں اضافہ ہو ہی جاتا ہے، ایک خط میں انھوں نے دکن کے تین سالہ قحط کا ذکر بہت ہی مفصل انداز میں کیا ہے۔ [۸]

۲۔ مناظر الانشاء: میں انشاء پردازی کے متعلق قواعد و قوانین اور اصول و ضوابط درج ہیں، یہ دونوں ہی تصانیف دکن کے عہد وسطیٰ کے فارسی نثر کا عمدہ ترین نمونہ ہے، بلکہ ان کتابوں کا شمار انشاء پردازی کی بہترین کتابوں میں ہوتا ہے۔ مناظر الانشاء فن لطیف اور نثر مرصع کے عمدہ ترین نمونوں پر شامل عربی و فارسی زبان کے مختلف انشاء پردازوں اور شاعروں کے حوالوں اور قرآن و حدیث کے اقتباسات کے نمونے دیئے گئے ہیں، جس سے خواجہ کی خداداد صلاحیتوں ادبی اعجاز اور عربی و فارسی زبان و ادب پر ان کی مہارت کا ثبوت ملتا ہے، تحقیقی اعتبار سے اس کتاب کو محمود گاوان کے تصنیف میں دوسرا درجہ حاصل ہے۔ موضوع کے لحاظ سے مناظر الانشاء میں انشاء پردازی اور نامہ نگاری کے فن میں بہت ہی معیاری کتاب سمجھی جاتی ہے۔ مناظر الانشاء میں وزیر کو مخاطب کرنے کے جو بھی اوصاف اور طریقے ہو سکتے ہیں سب کو بخوبی انداز میں پرویا ہے۔ وہ فطری طور پہ بہت ہی ذہین دانشمند اور دور اندیش تھے۔ انھیں قرآنی آیات احادیث نبوی، عربی و فارسی کے فصیح و بلیغ اشعار اور ضرب الامثال بہت ہی زیادہ یاد تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے کلام اور اسلوب نگارش میں ادبی چاشنی

پائی جاتی ہے،خواجہ محمود گاوان نے نامور شعراء اور دانشمند جیسے انوری، سعدی، حافظ، کمال اسماعیل کو بخوبی پڑھا تھا۔اسی وجہ سے ان شاعروں کی خوبیاں ان کے خطوط اور اشعار میں جھلکتی ہیں۔ انھوں نے تقریباً فارسی ادب کے تمام اصناف سخن میں دست آزمائی کی تھی، غزل، قصیدہ، قطعات اور رباعیات میں یکساں طور پر مہارت حاصل تھی۔

مصادر:

(۱) از مقالہء مناسبات فرہنگ ایران بسلسلہء بہمنیان، نوشتہ معین الدین عقیل، ترجمہ دکتر شاہد چودہری و دکتر علی محمد چودہری۔ تاریخ دکن کے چند ادبی گوشے ص۸، ڈاکٹر زیب حیدر، شعبہ فارسی جامعہ عثمانیہ۔

(۲) عہد بہمنیہ کا فرہنگی واجتماعی ادبی سرمایہ۔ص۸۱۔ڈاکٹر میر فضل الدین علی خان

(۳) از مقالہ بررسی جنبہ ھائی ادبی ءفتوح السلاطین عصامی (فردوسی دکن)۔ص۶۳، ڈاکٹر رادفر ابوالقاسم، از پژوھش گاہ علوم انسانی ومطالعات فرہنگی، پرتال جام علوم انسانی

(۴) عہد بہمینہ کا فرہنگی واجتماعی ادبی سرمایہ، ص۹۷، ڈاکٹر میر فضل الدین علی خان، عثمانیہ یونیورسٹی۔

(۵) تاریخ فرشتہ۔ج:ا۔ص:۸۸۷، محمد قاسم فرشتہ)

(۶) عہد بہمنیہ کا فرہنگی واجتماعی ادبی سرمایہ:ص۱۰۴۔۱۰۵، ڈاکٹر میر فضل الدین علی خان

(۷) تاریخ دکن کے چند ادبی گوشے۔ص۱۳، ڈاکٹر زیب حیدر، عثمانیہ یونیورسٹی)

(۸) تاریخ دکن کے چند ادبی گوشے۔ص۱۶، ڈاکٹر زیب حیدر، عثمانیہ یونیورسٹی

مآخذ ومنابع

(۱) ڈاکٹر خان فضل الدین، عہد بہمنیہ کا فرہنگی اجتماعی وادبی سرمایہ، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد

(۲) ڈاکٹر رادفر ابوالقاسم، تاریخچہء زبان وادبیات فارسی درجنوب ہند، دکن، عضو ھیئات علمی پژوھش گاہ علوم انسانی ومطالعات فرہنگی۔

(۳) علی اصغر حکمت، سرزمین ہند دانشگاہ تہران ۱۳۳۷

(۴) عبدالماجد صدیقی، تاریخ دکن، شائع ادارہ ادبیات اردو ۱۹۵۲

(۵) عبدالرحمٰن، سید صباح الدین، ہندوستان کی ایک جھلک، اعظم گڑھ ۱۹۵۸

(۶) علی بن عزیز اللہ طباطبا، برھان مآثر، مطبع جامعہ دہلی ۱۹۳۶

(۷) عبدالعلیم، نصر اللہ خان، تاریخ دکن، نول کشور، ۱۸۷۹ء

(۸) ہارون خان شیروانی، دکن کے بہمنی سلاطین، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰۹ء

(۹) محمد عبدالمنان، بہمنی حکومت کے تحت فارسی ادب، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد ۱۹۶۶ء

(۱۰) محمد عبدالمنان، زبان وادبیات فارسی درعہد بہمنیان، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد ۱۹۴۴ء

ڈاکٹر محمد قمر عالم
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ فارسی
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

اودھ کی تہذیب وثقافت کا اہم فارسی مآخذ: انشای لچھمی نرائن

صوبۂ اودھ ہندوستان میں فارسی زبان وادب کی ترویج واشاعت میں اپنا منفرد مقام رکھتا ہے، یہاں کہ نوابین اور حکمرانوں نے فارسی زبان وادب کی ترویج میں بیش بہا خدمات انجام دی ہیں جس کے نتیجہ میں اودھ میں فارسی ادب کی اہم تخلیقات منظر عام پر آئیں ان میں سے ایک انشای راجہ لچھمی نرائن بھی ہے۔ انشای لچھمی نرائن ۱۲ویں صدی ہجری کے اواخر اور ۱۳ویں صدی ہجری کے اوائل میں ہندوستانی تاریخ وتمدن بالخصوص صوبۂ اودھ کی تاریخ اور تہذیب وثقافت کے متعلق ایک قیمتی سرمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں، جن کو 'مولوی محمد فیض بخش' نے ۱۲۰۵ھ میں مرتب کر کے کتاب کی شکل میں پیش کیا، جیسا کہ خود مولوی فیض بخش رقم فرماتے ہیں:

'ترتیب وتالیف این مکاتیب درسن یک ھزار ودوصد وپنج اتفاق افتاد.....'

مرتب فیض بخش نے منشی لچھمی نراین کے کل مسودات کو جمع کر کے مکتوبات کی شکل میں مدون مرتب کر دیا۔ مختلف موضوعات پر مشتمل یہ کل ایک سو چار مکتوبات ہیں، جن میں اودھ کی تہذیب، ثقافت، رسم ورواج، تاریخ وغیرہ کے بارے میں اہم اطلاعات موجود ہیں۔ انشائے لچھمی نرائن کے دو قلمی نسخے 'مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ' اور ایک قلمی نسخہ آصفیہ لائبریری حیدرآباد، ان کے علاوہ دو مطبوعہ نسخے بھی مولانا آزاد لائبریری میں موجود ہیں ان میں سے ایک مطبع نول کشور لکھنؤ اور دوسرا مطبع حسنی میر حسین رضوی شامل ہیں۔

جس قلمی نسخے کا تعارف مقالۂ ہذا میں پیش کیا جارہا ہے وہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں جواہر زواہر کلکشن میں شمارہ نمبر ج۔ ف ۳۵۰ سے درج ہے نسخہ مکمل اور صاف ستھرا ہونے کے ساتھ قرائت میں آسان ہے، خط نستعلیق، اوراق کی تعداد ۹۸ ہے نسخہ کا آغاز اس طرح سے ہوتا ہے:

''ھر چند طوطی شکرین مقال خامہ را در برابر آئینہ بیان می گذارم چون سرمہ خوردگان بہ گفتار نمی آید و چندان کہ بلبل نواسنج دل را از خیالات گونا گون گلھای تازہ می نمایم.....

اختتام:

دیگر مشغلہ نباید داشت زدہ دزہ زر باید گرفت درین باب تاکید دانند قلت زر بہ راجہ اتم است جلدارسال معقول باید فرستاد باید چہ..

جیسا کہ ہم اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ ہر قلمی نسخہ کی خاص پہچان اسکا ترقیمہ بھی ہوتا ہے جس کے ذریعہ سے اسکی سن تالیف وسن کتابت، نام معلف ونام کاتب وغیرہ معلومات حاصل ہوجاتی ہیں، اس قلمی نسخہ کے ترقیمہ کے ذریعہ بھی ہم کو یہ چند اطلاعات ملتی ہیں کہ:

تمام شد انشای لچھمی نراین به تاریخ چهاردهم

جمادی الآخر ۱۲۵۳ھ

مولانا آزاد لائبریری میں موجود دوسرا قلمی نسخہ ناقص الاول ہے جسکا آغاز اس عبارت سے ہوتا ہے "**کہ دھان تواند کشاد، شاھنشاھیست کہ کمند افکار ادراک بر بام قصر بلند اسرار داتشی نمی رسد وجھان پناھی ایست کہ کسی اوھام افھام از خوف دریای بی پایان صفاتش خشک کردیدہ قالبت تھی می سازد.....**"

نسخہ کا خاتمہ "**امید کہ از الطاف سامی آنست کہ از کدلک عطوفت زنگ کدورت روابندۂ مدام از صحایف مھر بانی یاد فرمایاشند، ایام جمیعت بکام باد.....**" پر ہوتا ہے اس نسخے کے اندر ترقیمہ موجود نہیں ہے۔

ان دونوں قلمی نسخوں کے علاوہ مولانا آزاد لائبریری علیگڑھ میں موجود انشای لچھمی نراین کے دونوں مطبوعہ نسخوں کا آغاز تو ایک جیسا ہے البتہ اختتام دیگر نسخوں سے مختلف ہے جس کی عبارت حسب ذیل ہے:

.....ھر چند توقع اصلاحش آھن سرد کوفتن است لیک بہ سنگ مسن باید رسانید شاید کہ درحق این آھن حکم پارس بخشد لیک نشود کہ اثر مقناطیس نماید واورا معاودت بہ این طرف ندھد زیادہ والسلام.

مطبع نول کشور سے مطبوعہ نسخہ کا آغاز واختتام تو تمام نسخوں جیسا ہے البتہ ترقیمہ میں چند اطلاعات مختلف ہیں جیسا کہ اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے:

.....بعد ستایش رب العزت ونیایش ختم رسالت صلی اللہ علی خیر خلقہ محمد وآلہ وصحبہ اجمعین الی یوم الدین پوشیدہ مباد کہ درین ایام فرخی فرجام کتب بلاغت وفصاحت خزاین مسمی بہ رقعات لچھمی نراین در مطبع دولت مرجع سرامد ایل دول روزگار نامی و گرامی دیار وامصار صاحب اقبال وزور منشی نول کشور دام دولتہ وحشمتہ بہ اھتمام

متصرم نا کمال لالا بشیشر دیال بہ ماہ اپریل ۱۸۷۵ء حلیۂ طبع پوشیدہ مطبوع طبایع گردیدہ.

ساتھ ہی اس نسخے کی تاریخ طباعت سے متعلق ایک منظوم قطعۂ تاریخ سب سے آخر میں موجود ہے:

مایہ داران سخن را مژدۂ سرشار باد
طبع نثری صد در گنجینہ معنی گشاد
حرف حرفش چون زر جید مروج در جھان
نقد وقت طالبان این فن با عز و شان
مشقب خامہ در تاریخ طبع آن چہ سفت
مایۂ اھل سخن لچھمی نراین نام گفت

(۱۲۹۲ھ)

انشای لچھمی نراین کے مرتب مولوی فیض بخش نے مسودات خطوط کی تدوین سے پہلے ایک طویل اور جامع مقدمہ لکھا ہے، جس کے ذریعہ سے ہم منشی لچھمی نراین کے احوال سے بخوبی آشنائی حاصل کرتے ہیں۔ مقدمہ کا آغاز مروجہ رسوم کے مطابق حمد باری تعالیٰ سے ہوتا ہے، خدای عزوجل کی حمد وثنا میں نہایت شستہ اور پرتصنع فارسی نثر کا نمونہ پیش کرتے ہوئے مولوی فیض بخش یوں رقم طراز ہیں:

.....دبیریست کہ انشای علوم عالم علوی وسفلی را بہ یک نقطۂ کن، بر صفحہ ھستی رقم فرمودہ وناظمی است کہ مسبع افلاک سبعہ ومسدس جھات ستہ را بر اوراق وجود ثبت نمودہ سر لوح افلاک را بہ تذھیب شمس وقمر زینت بخشیدہ واز خطوط شعاعی خورشید بر حاشیہ بیاض صبح جدول طلایی برکشیدہ....

اس کے بعد رسول اکرمؐ کی مدحت میں چند نعتیہ اشعار بھی پیش کئے ہیں ملاحظہ ہو:

محمد فیض بخش ھر دو عالم
محمد پیشوای جن و آدم
محمد باعث ایجاد کونین
محمد رحمت حق فخر دارین
فلک از نور دانش گشتہ روشن

زمین از نقش پایش گشته گلشن
سلیمان بر درش از مور کمتر
سکندر درگھش را صاحب در

حمد ونعت کے بعد مرتب اپنا نام ومسکن بتاتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں کہ "امید وار مغفرت خلاق اکبر محمد فیض بخش ابن غلام سرور غفر الله تعالیٰ ذنوبهما متوطن قصبه کاکوری ....،"اس کے بعد مسودات کے متعلق یوں تحریر فرماتے ہیں کہ:

''......اکثر مسودات نظم ونثر از زاده های طبع بلند گل گلشن سخندانی،بلبل شاخسار معانی ، در سفینہ سینہ اش از مضامین رنگین خزاین، راجہ کچھمی نراین منشی کہ دریای مضامین عبارات موج خیزش شور افگن را قلوب نثاران شیرین گفتار است واشعار دلاویزش آشفتگی افزای خواطر شعرای عالی مقدار نظم راازوجود با کمالش رونقی است تام ونثر را از ذات باصفاتش عزتی تمام....؛

فیض بخش نے راجہ کچھمی نرائن کے فضل وکمال کی اتنی تعریف کی ہے کہ ملاظهوری، ملا زلالی اور منیر کی ادبیت اور انشاء پردازی پر بھی ترجیح دے دی ہے، اس پر ان کے کچھ دوستوں نے اعتراض بھی کیا جس کا وہ نہایت معقول اور خاموش کن جواب دیتے ہیں:

'بارتبہ سخن بلندش مرتبہ عبارات وارستہ لاھوری بغایت بی قدر ونابکار ومنشیات نصیرای همدانی نھایت تھی مغز و بی اعتبار، زلال مقالاتش آب نسیان بر آتش شهرت مقالات زلالی افشانده وشکوه طنطنۂ غورۂ خیالاتش بہ دلفریبی تزلزل وارکان افکار ناظم هراتی افگنده، چاشنی الفاظ گهر بارش صغرای سودای فکر از دماغ ملا میر بیرون برده و گرمی هنگامۂ مکات کلام بلاغت انتظامش گرمی بازار مولانای ظهوری افسرده از شادابی معانی دل نشینیش بزم اصحاب کمال رشک هزاران گلشن صفحہ کتاب سراپا انتخابش موجب حسد فراوان صحن چمن پریشان افتاده بود....

اس کے بعد راجہ صاحب کے نسب اور وطنیت کے متعلق فرماتے ہیں کہ:

''منشی موصوف قوم کھتری موطن اصلی او قصبۂ گنجاه از مضافات دار السلطنت لاهور است، رای جسونت جد امجدش در عهد عالمگیر بادشاه انار الله برهانہ، بجهت تلاش

معاش بہ شاہ جہان آباد رسیدہ در شہر کھنہ محلّہ وکیل پورہ کہ حورام عبارت از آنست اخت اقامت انداختہ.....''

منشی لچھمی نرائن کے جدامجدش جسونت رائے نے عالمگیر بادشاہ کے عہد حکومت میں دہلی آ کر سکونت اختیار کی اور امراء عظام کی وکالت کی خدمات انجام دینے لگے، ان کے انتقال کے بعد راجہ صاحب کے والد 'رای منی رام' نے بھی اسی عزت سے زندگی گزاری، لچھمی نراین نے علوم مداولہ فارسی کی تکمیل جو کہ اس وقت اطفال کی تدریس میں رائج تھا مولانا شیخ محمد برادرزادہ غنیمت کنجاہی سے حاصل کی۔

منشی لچھمی نرائن ابھی بارہ سال کی عمر کو ہی پہنچے تھے کہ آپ کی طبیعت کا میلان شاعری کی طرف ہوا جس کے سبب آئین عروض و قافیہ، معانی و بیان اور اصلاح غزل وغیرہ پر دسترس حاصل کرنے کے لئے سراج الدین علی خان آرزو کی شاگردی اختیار کی:

درسن دوازدہ سالگی متوجہ بہ تحصیل رسایل عروض وقوافی واصلاح غزل گشتہ درخدمت قدوۂ فصحا وزبدۂ بلغا سخن گو وسخندان سراج الدین علی خان متخلص بہ آرزو کہ چاشنی کلامش جھانیان راشیرین نمودہ وملاحت بیانش کباب دکھارا نمکین ساختہ مستعد بودہ ازعلوم مذکورہ ذخایراندوختہ مستثنای روزگار شد....

صرف ونحو کا درس رائے ٹیک چند بہار سے لیا:

مختصرات صرف ونحوازتیک چند بھار متخلص بہ بھار خواندہ...

اس کے بعد دہلی کے مشہور اطباء کی خدمت میں رہ کر طب اور نسخہ نویسی میں مہارت پیدا کر کے کامل بارہ سال تک علاج و معالجہ کی خدمات انجام دیتے رہے:

مایل بہ دیدن کتب طب کہ ازضروریات انسانیست گشتہ وعمری درخدمت اطبای دار الخلافہ مشغول نسخہ نویسی بودہ مدت دوازدہ سال بہ مشق معالجۂ اغنیاء وغربای دھلی پرداخت اکثرنسخی معتبرۂ عربی کہ طلبۂ علوم محتاجبہ خواندن آن می گردند بعضی راازعلماء و فضلای محقق درس گرفت وبذی بہ قوت ذھن رساوحدت طبیعت ذکامحض ازمطالعۂ خودش برخود آسان گرفت.....

احمد شاہ درانی کے دلّی پر مسلسل حملوں سے جو افراتفری کا ماحول پیدا ہوا تھا اسکے سبب راجہ صاحب نے دلّی کو خیرآباد کر کے کچھ مدت کے لئے اورنگ آباد اس کے بعد بریلی کی طرف توجہ کی۔ بریلی میں حافظ رحمت خان کے دیوان

رائے بہار سنگھ کے پاس تقریباً نو سال بسر کئے اسی عرصہ میں وہ چکلہ اٹاوہ یعنی ضلع اٹاوہ کی منشی گیری کی خدمت پر فائض ہو گئے، جہاں سے ترک روزگار کر کے ایک سال محمد محتشم خان خانزادہ پسر نواب امیر سخن افغان کے پاس منشی گری میں صرف کیا۔تقریباً دس سال کی مدت میں آپنے ترقی کی بلندیوں کو طئے کرتے ہوئے عنبر خان خواجہ سرا شاہی کی وساطت سے نواب آصف الدولہ کے سرکار میں بمشاہرہ ایک سو روپیہ ملازم ہوئے، دو سال کے بعد ملازمت کو ترک کر کے فیض آباد میں آ کر حسب سابق مقیم ہو گئے:

'ومعرفت عنبر علی خان خواجہ سرا بہ ملازمت بندگان عالی متعالی وزیر الممالک نواب آصف الدولہ بھادر مفاخرت اندوخت بہ مواجب یک صد روپیہ نوکر شد بعد انقضای دو سال کہ عنبر علی خان از ین عالم رحلت کردند رشتہ روزگار منشی ھم از حضور گسیخت باز متوجہ بہ فیض آباد شد بہ دستور سابق در سرکار عالم مدار نظارت مرتبت جا گرفت تا شش سال بہ وضع خوش گزرانیدہ...

مرتب انشای مولوی فیض بخش رقم کرتے ہیں کہ ان کو فیض آباد میں رہتے ہوئے اب تین سال ہو گئے ہیں ضعیفی کے ساتھ ساتھ دماغ میں کچھ خلل بھی پیدا ہو گیا ہے:

این سال سوم است کہ در حواس ایشان خللی بھم رسیدہ از خود بیگانہ ساخت وجنون سرشار عارض حال شست. درین وقت تحریر فی الجملہ بہ افاقت شدہ اجتماع حواس دارد چنانچہ بہ معنی شعر وسخن می رسد وجواب شافی مقابل ھر سوال می دھد خدایش صحت کامل نصیب نماید کہ چنین کس منصف بہ کمالات خصوص در فن انشاء درین جز وزمان وجود ندارد...

ھر چند کہ از فرقہ ھنود است اما بہ سبب کثرت مطالعۂ کتب کلام اھل اسلام وممرست صحبت علماء ایشان چدان اعتقاد باذھب خود ندارد.

چونکہ مولوی فیض بخش کی منشی صاحب سے بہت رسم وراہ تھی اس لئے اسی زمانے میں انہوں نے کچھی نرائن کے یہ اوراق پریشان بڑی دقتوں سے جمع کئے۔جس کا وہ خود اپنے مقدمہ میں اس طرح سے ذکر کرتے ہیں،

''ناچار اوراق پریشان برخی از قلم دان ایشان بزور برآوردہ وبعضی را در حالت جنون معزی الیہ خدمت گاری کہ تحویل دار کارخانجات بود بمن رسانید. مسودات سابق و لاحق را بر صفحۂ کاغذ حیز تحریر آوردم....''

مولوی فیض بخش صاحب فارسی زبان وادب کے ایک ممتاز ادیب میں شمار کئے جاتے ہیں اسی نسبت سے اس کتاب میں ہم انکی ادبی صلاحیت کو ایک مسجع ومقفع نثر کے نمونے کے طور پر بھی دیکھتے ہیں۔ پ نے عمدہ فارسی نثر تحریر کی جسکی بدولت اودھ کے فارسی ادب کی اہم خصوصیات میں اضافہ بھی ہوتا ہے چند مثال بطور نمونہ پیش کی جاتی ہیں:

گل گلشن سخندانی، بلبل شاخسار معانی

از مضامین رنگین خزاین، راجہ لچھمی نراین

انشای لچھمی نراین کے مرتب مولوی فیض بخش نے منشی لچھمی نراین کے کل مسودات کو جمع کر کے مکتوبات کی شکل میں اپنی تمام تر ادبی صلاحیتوں کے ساتھ مدون مرتب کر دیا یہ کل ایک سو چار مکتوبات ہیں جن کے عنوانات درج ذیل ہیں:

(۱) **احوال فتح اٹاوہ کہ از دست اولیائی دولت وزیر الممالک نواب شجاع الدولہ بھادر اتفاق افتادہ بود وساطت شاہ مدن صاحب بنظر نواب می گزرانیدند۔**

(۲،۳،۴،۵،۶،) رقعۂ مسمیٰ معیار الادراک بہ شیخ باقر علی می نویسد۔

(۷) **در تلازم آتش کہ در فیض آباد در سن ۱۱۸۹ھ افتادہ خانہائی محمد عطا خان وغیرہ۔**

(۸) **در تلازم ماہی کہ روزی مرزا صفدر علی بیگ داروغہ میر بحر نائب عنبر علی خان بہ شیخ احمد علی گزرانیدہ بود۔**

(۹) **در تلازم سگ ھای تازی کہ شخصی بخدمت جوھر علی خاں فرستادہ، می نویسد۔**

اس خط میں منشی لچھمی نرائن نے نواب جوہر علی خان کے دربار میں آئے ایک تازی کتے کے بارے میں طنز وظرافت کے عمدہ نثری نمونے کے ساتھ تعریف وتوصیف کی ہے۔ کتے کے کان، دہان، کمر، دم اور دانت کی بڑی خوبصورتی کے ساتھ تعریف کرتے ہیں جس سے ایک دلچسپ ادبی تحریر کا نمونہ ہم کو حاصل ہوتا ہے۔

خامہ را از جوع الکلب شوق ادای محمدت قادری زبان رغبت چون سگان از دھان بیرون دوید کہ سگی را تشریف پری پیکری ارزانی داشتہ وبہ نوع اشرف انسان موانست بخشیدہ بلکہ انسان را بہ خدمت او برگماشتہ، حبذا تازی سرایا بازی کہ شیر را از سگان خود می داند بہ اظہار ملاعبت واستعطاف کہ خواص او بیست معنی مصرعہ

پی نیگان گرفت ومردم شد

(۱۰) **در تلازم اسپ ابلق**

ان مکتوبات میں ایک دلچسپ مکتوب درصفت اسپ ابلق بھی ہے اس میں لچھی نرائن نے گھوڑے کے تمام اوصاف کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ نثر کا جامعہ پہنایا ہے۔ یہ خط بھی ہم کو ایک مکمل طنز وظرافت سے بھرپور نثر کا

بہترین نمونہ معلوم ہوتا ہے۔ ساتھ ہی صوبہ اُودھ میں اس وقت کے گھوڑوں کی قسم سے بھی بخوبی آشنائی حاصل کرتا ہے۔

فرخا اسپ ابلق خوش خرام تماشا گاہ ھم آغوش صبح با شام شیرین حرکات تر از چشم نکویان تند و تیز تر از آتشین رویان واز اختلاط سفیدی او با سیاہی درنجف راخار در دل واز ارتباط سیاھی او با سفیدی شب مھتاب منفعل مانند دانہ سبحہ سلیمانی.....

(۱۱) **درتلازم حنا**

(۱۲) **درتلازم پالکی**

صانعی کہ پالکی سپھر را بہ بانس خمار قوس قزح وکلس ماہ ومھر آراستہ وھتری گلدوز ثوابت را بجالر خطوط شعاعی پیراستہ بہ مدارج رفیعہ ومراتب علیہ رساندو روی حاسدان راچون دوش کھاران سیاہ گرداند.....

(۱۳) **درتلازم بندوق**

اس رقعہ میں لچھی نرائن نے بندوق کی تعریف وتوصیف، اس کی صفات کو بخوبی پیش کیا ہے۔ بندوق چلنے کے بعد نواب صاحب اس کو ہر وقت اپنے کندھے پر لیے پھرتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے مانو ہر وقت جنگ کے لیے تیار ہوں اس کے بعد شکر

درادای شکر این احسان مانند گولی سر بہ سجدہ بہ زمین خاکساری می سیارم وبسان مگس ببر دو دست تسلیم می گزارم حفظ ایزدی ھمیشہ دیدبان باد

(۱۴) **درتلازم کشت گاروزراعت کہ درین سرکار بیشتر آید**

(۱۵) **عرض داشت درتلازم آئینہ ہا کہ جواہر علی خاں بنواب فرستادہ بودند**

(۱۶، ۱۷) **درتلازم مصطلحات منطق وغیرہ می نویسد**

(۱۸) **درتلازم درد پا کہ خودش مبتلا شدہ بود وبحکم میر نواب می نویسد**

اس مکتوب کے ذریعہ ہم کو درد پا سے متعلق ایک اہم طبی نسخہ کی معلومات بھی حاصل ہوتی ہے:

اگر بقدر شش ماشہ یا ھفت ماشہ شیرہ مغز تخم کدو مناسب باشد اضافہ فرمایند.

(۱۹) **درتلازم فرد رزائی کہ عنبر علی خاں باخواند احمد علی خان از لکھنؤ فرستادہ بودند می نویسد**

(۲۰) **درتلازم زراعت کشت کاری نویسد**

(۲۱) **درتلازم گلھای بیلا کہ بہ طریقہ گلدستہ ھدیہ بہ آشنائی فرستادہ بود۔**

(۲۲) درتلازم سرمہ بحکم میرنواب می نویسد

(۲۳) عرضی کہ غلام رسول قوال بہ توسط بندہ بہ جواہر علی خان گزرانیدہ بود

(۲۴) درتلازم شیشہ ھای گلاب واچار مربہ کہ عنبر علی خاں از لکھنؤ بہ جواھر علی خاں فرستادہ بودند

(۲۵) درتلازم منطق

(۲۶) درتلازم سنبوسہ

(۲۷) درتلازم ظروف گلی مرادآبادی کہ مرزا حسین علی فوجدار بانس بریلی بجواھر علی خاں فرستادہ بودند می نویسد

(۲۸) درتلازم کبوتران وکمان کہ میر مردان علی بہ عنبر علی خان فرستادہ بودند

(۲۹) رقعۂ دیگر ''مرزا صاحب بسیار مھربان سلامت''

(۳۰) بحضرت احمد زمان پیرزادہ ساکن رودولی فرزند شاہ عبدالحق

(۳۱) بہ استاد خود می نویسد

(۳۲) درجواب خط حسن رضا خان درمقدمہ میر عبداعلی پیش نماز بجواھر علی خان نوشتہ بود

(۳۳) بغلام علی خان عامل.....

(۳۴) بہ التماس علی خان بھادر از طرف عنبر علی خان مینویسد

(۳۵) از طرف اخوند احمد علی خاں بہ میر امام الدین خان ھنگامی کہ میر موصوف از فوجداری گڑھ.....معزول شدہ، بحضور رفت می نویسد

(۳۶) خط خوند علی بخدمت جواھر علی خان

(۳۷) بہ شیخ باقر علی مع غزل می نویسد

(۳۸) بہ مرزا اسداللہ بیگ

(۴۰) خط اخوند احمد علی درجواب جواب عریضہ بھوانی بخش پسر شیوکرن فوطہ دار می نویسد

(۴۱) از طرف جناب عالیہ نواب بھوبیگم صاحبہ درجواب صاحب کلاں کلکتہ کہ از فرنگ بعد معزولی ہشتی صاحب مقرر شدہ آملہ بودمی نویسد

(۴۲) مسودہ دیگر برای صاحب مذکور

(۴۳) بہ صاحب مذکور ھنگامی کہ از کلکتہ قصد سیر عظیم آباد واودھ کردہ می نویسد

(۴۴) بصاحب مذکور ھنگامی کہ در لکھنؤ آمدہ قصد فرخ آباد کردہ بود در جواب خط او

(۴۵) ایں خط بنام نواب گورنر جنرل مسٹر جان مارکوس صاحب بھادر تحریر یافت

(۴۶) عرض داشت نواب بھوبیگم صاحبہ مدظلہ ہا بجناب حضرت ظل سبحانی شاہ عالم بادشاہ

(۴۷) عرض داشت دگر عوض خلعت

(۴۸) شقہ نواب بھوبیگم صاحبہ بنام نواب آصف الدولہ بھادر ھنگامی کہ غسل صحت فرمودہ

(۴۹) عرض داشت نواب بھوبیگم صاحبہ بجناب حضرت ظل سبحانی شاہ عالم بادشاہ

(۵۰) شقہ شاھزادہ صاحب عالم بنام شرف الدین حسین ھنگامی کہ غلام قادر خان روھیلہ با حضرت شاہ بادشاہ مصدر بی ادبیا شدہ بود شاھزادہ مذکور از بنارس بہ عزم شاہ جھان آباد کو چیدہ، می نویسد

(۵۱) عرض داشت جواھر علی خاں بہ جناب عالی نواب آصف الدولہ در باب فرستادن فیلان

(۵۲) عرض داشت جواھر علی خان بہ نواب آصف الدولہ بھادر در باب آنکہ یک ھزار مرصع الماس معرفت خاں موصوف خریدہ بلکھنؤ بردہ بودند برای قیمت آں می نویسد

(۵۳) عرض داشت جواھر علی خان برای مبارک باد عید و ابلاغ نذر بنواب آصف الدولہ بھادر

اس خط کے اندر ہم کو اودھ میں عید کی تمام رسموں سے آشنائی حاصل ہوتی ہے۔ کس طرح سے اس زمانے میں عید کے بعد خوشیاں منائی جاتی تھیں۔ عید کی نماز کے وقت عید گاہ میں کس طرح کا انتظام ہوا کرتا تھا۔ نماز کے بعد لوگ کیا کیا کرتے تھے۔ طرح طرح کے پکوان عید کے موقع سے بنائے جاتے جن میں شیر مال، کباب ،شیر، سنبوسہ، حبشی حلوا وغیرہ۔ عید کے روز کے لباس و دیگر رسوم کی بخوبی معلومات حاصل ہوتی ہے۔

(۵۴) عرض داشت مبارک باد عید الاضحیٰ از طرف جواھر علی خاں بجناب نواب آصف الدولہ بہادر

(۵۶،۵۵) در مابرک باد عید

(۵۷) عرضی کہ جواھر علی خان بہ جناب آصف الدولہ بھادر در مبارک باد نوروز و فرستادن نذر

(۵۸) جواب خط صاحب کلاں از طرف نواب بھوبیگم صاحبہ

(۵۹) عرضی کہ از طرف خود براجہ نور چند می نیوسند

(۶۰) بہ نواب محبت خان می نویسد

(۶۱) بر نائے تلسی رام می نیوسد

۶۲) بہ خدمت عنبر علی خان از طرف خود عرضی می نیوسد

(۶۳) در خدمت نواب محبت خان

(۶۴) درخدمت پسر حافظ رحمت خان

(۶۵) بہ خدمت راجہ نندرام دیوان حسن رضا خان

(۶۶) بہ نواب قاسم علی خان پسر نواب سالار جنگ

(۶۷) عرض داشت عنبر علی خان مرحوم بہ جناب آصف الدولہ بھادر کہ، دانی خربوزہ، ابلاغ حضور کردہ بود

(۶۸) درشکر گزاری انن ناس کہ عشرت علی بہ او مرحمت کردہ اند

(۶۹) عرض داشت عنبر علی خان مرحوم کہ در حالت مرض کہ بیماری استقا داشتند .....

(۷۰) عریضہ بہ راجہ ٹکیت می نویسد

(۷۱) بہ نواب قاسم علی خان عرضی می نویسد بعد وفات عنبر علی خان

(۷۲) بہ شیخ باقر علی

(۷۳) عرض داشت بہ جواب خط میر شمس الدین صاحب بہادر....

(۷۴) بہ آغا حسن رضا پسر مرزا کاظم لکھنوی می نویسد

(۷۵) خطبۂ بیاض نواب آصف الدولہ بہادر کہ حسب فرمائش عنبر علی خان نوشتہ

(۷۶) رقعۂ دیگر

(۷۷) تعریف فرستادہ سیب می نویسد

(۷۸) عرض داشت بہ جناب بہو بیگم صاحبہ

(۷۹) تمہید دیگری می نیوسد

(۸۰،۸۱،۸۲،۸۳) رقعات دیگر

(۸۴) بہ شیخ باقر علی

(۸۵) بہ شیخ فیض بخش (مرتب مکتوبات)

(۸۶) درتعزیت کدامی رانی

(۸۷،۸۸) رقعات دیگر

(۸۹،۹۰) بہ شیخ فیض بخش

(۹۱) بہ شیخ فیض بخش از جانب نواب علی خان

(۹۲،۹۳،۹۴،۹۵،۹۶،۹۷،۹۸) بہ شیخ فیض بخش

(۹۹،۱۰۰،۱۰۱،۱۰۲) بہ مولف

(۱۰۳) ازطرف شیخ جاراللہ بہ اخوند احمد علی وقی کہ اورادر فیض آباد گذاشتہ بہ لکھنؤ رفتہ بودند

(۱۰۴) ازطرف عنبر علی خان بہ اخوند احمد علی

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ راجہ لچھمی نرائن کے یہ تمام خطوط اس وقت کے موجودہ اودھ کی تہذیب وثقافت، رسم و رواج، طورطریقہ، نذرانہ، پھل پھول وغیرہ کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں

شازیہ پروین
ریسرچ اسکالر، شعبہ فارسی
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

تزک آصفیہ کے خطی نسخوں کا تعارف

سلطنت آصفیہ حیدرآباد دکن کی آخری مسلم حکومت ہے اسکے بانی نواب قمرالدین خان بہادر آصف جاہ تھے۔ اس عظیم الشان سلطنت نے دکن پر تقریباً دوسو چوتیس سال حکومت کی اس مدت میں سات بادشاہ تخت نشین ہوئے۔اس حکومت کا آغاز ۳۱ جولائی ۱۷۲۴ء میں اور خاتمہ ۱۷، ستمبر ۱۹۴۸ء میں نواب میر عثمان علی خان پر ہوتا ہے۔آصف جاہی عہد کی فارسی تواریخ میں سے کچھ نایاب تواریخ جیسے فتوہات آصفی، نسخہ فتیحہ زوال، سوانح دکن، تنمیق شگرف، مآثر آصفی، نگارستان آصفی، گلزار آصفیہ، تاریخ یادگار مکھن اور تاریخ آصف جاہی وغیرہ ہیں جن میں ایک تزک آصفیہ بھی ہے جسے آصف نامہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ کتاب نواب نظام علی خان بہادر آصف جاہ ثانی کے عہد کی مستند و معتبر اور مشہور تاریخ ہے۔ جو واقعات اس کتاب میں قلم بند کئے گئے ہیں ان میں سے اکثر واقعات کا مصنف خود عین شاہد ہے۔تزک آصفیہ میں ابتدائی جلوس سے ۱۲۰۷ھ یعنی ۱۷۹۳ء تک کے واقعات درج ہیں۔

اس کتاب کی ابتدا میں آصف جاہ کے اجداد کا تذکرہ ہے۔اس کے بعد آصف جاہ اول کے آغاز حکمرانی سے نواب نظام علی خان کی تخت نشینی تک اور ناصر جاہ جنگ وصلابت جنگ کے ضروری حالات بھی لکھے گئے ہیں۔اس کا مصنف جو کہ نواب نظام علی خان بہادر کے اہل دربار سے تھا، تجلی علی معروف صوفی شاہ معین تجلی کا شاگرد تھا۔اسلئے تجلی علی شاہ نے اپنے استاد کی مناسبت سے 'تجلی' لقب اختیار کیا۔ وہ صوفی سلسلے چشتیہ سے تعلق رکھتے تھے اور اعلیٰ درجے کے مصور، مشہور تاریخ نگار اور خوش نویسی میں دستگاہ رکھتے تھے۔ میر نظام علی خان نے انکی نقاشی سے متاثر ہوکر خوب انعام واکرام سے نوازا اور اپنے دربار میں اعلیٰ مقام پر فائز کیا۔

تجلی علی شاہ کی کتاب تزک آصفیہ کے متعدد قلمی نسخے ہندوستان کی مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں ذیل میں ان تمام نسخوں کا جائزہ لینے کی حتی الامکان سعی کی گئی ہے۔ امید ہے کہ فارسی ادب کے لئے یہ تحقیقی مقالہ سودمند ثابت ہوگا۔سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد میں تزک آصفیہ کے کل پانچ قلمی نسخے دستیاب ہیں۔ یہ تمام نسخے راقم الحروف کے چشم دید ہیں۔

(۱)نسخہ اول سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد: سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد میں تزک آصفیہ کا یہ نسخہ کتاب نمبر۱۵۴ (کیٹلاگ نمبر۵۸۳) کے تحت موجود ہے۔ یہ مکمل نسخہ خط نستعلیق میں لکھا ہوا ہے اور فولیوز کی تعداد ۱۷۳ ہیں۔ جسکی قد وقامت 26.6x16.0cms. ہے۔ نسخے کی شروعات 'بسم اللہ الرحمٰن الرحیم' سے ہوتی ہے۔ اس قلمی نسخے کی سال کتابت ۱۲۰۶ھ ہے اور کاتب کا نام موجود نہیں ہے۔ اس کے ابواب سرخ سیاہی میں لکھے ہوئے ہیں اور جگہ جگہ کرم خوردہ ہے۔ نسخے پر دو مہر دستیاب ہوتی ہیں جو 'منیر الملک' کے نام سے ہیں۔ اس کتاب میں تزک آصفیہ کا نام 'آصف نامہ' بھی تحریر کیا گیا ہے۔

(۲)نسخہ دوم سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد: سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد میں تزک آصفیہ کا یہ مکمل نسخہ کتاب نمبر۱۵۵ (کیٹلاگ نمبر۳۸۶) میں دستیاب ہے۔ تزک آصفیہ کا یہ نسخہ ۱۴۶ فولیوز پر مشتمل ہے اور ہر ورق پر ۱۹ سطور ہیں۔ یہ قلمی نسخہ خط نستعلیق میں لکھا گیا ہے۔ اسکی جلد سرخ رنگ کی ہے اور بہت عمدہ عبارت میں تحریر ہے۔ اول ورق پر 'بسم اللہ الرحمٰن الرحیم' کے بعد فہرست کتاب تاریخ نواب نظام الدولہ بہادر رقم ہے اور شروعات 'رب یسر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم وتمم بالخیر' سے ہوتی ہے۔ اوراق بالکل صاف اور چمکدار ہیں اور ہر باب کو سرخ سیاہی کے ساتھ واضح کیا گیا۔ اس کا سائز 31.5x19.6cms ہے۔ نسخے کی سال کتابت ۱۲۹۰ھ ہے اور کاتب **سید محمد پیران** ہیں، جو اس دور میں منصب دار کے عہدے پر فائز تھے۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل ترکیمہ سے ظاہر ہوتا ہے:

> **''تمت الکتاب بعون ملک الوھاب نسخہ تاریخ نواب فلک جناب خورشید رکاب نواب آصف جاہ نظام علی خان بھادر مغفور بتاریخ بیست وپنجم ماہ ذیقعدہ ۱۲۹۰ھ یک ھزار ودوصد ونود ھجری روز پنج شنبہ بوقت چاشت بیداضعف ملازم سرکار عالی علاقہ بمنصب سید محمد پیران امیدوار اضافہ حسب الحکم سرکار مدار المھام۔ نواب مختار الملک بھادر مدا اللہ ظلالہ واقبالہ باتمام رسیدہ بمعرفت میر اسد علی صاحب داروغہ کتاب خانہ سرکار داخل کتاب خانہ موصوف گردید۔''**

(۳)نسخہ سوم سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد: تزک آصفیہ کا یہ قلمی نسخہ خط شکستہ میں لکھا گیا ہے۔ یہ نسخہ کتاب نمبر۱۵۶ (کیٹلاگ نمبر۳۸۷) کے تحت موجود ہے اور فولیوز کی تعداد ۲۷۰ ہے۔ کاتب کا نام درج نہیں ہے البتہ سال کتابت سے متعلق آخری ورق پر عبارت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۰۷ھ یعنی ۱۷۹۳ء میں تحریر ہوا ہے۔ یہ نسخہ قدیم اور بوسیدہ ہے اور بیشتر اوراق کرم خوردہ ہیں۔ اس نسخے پر ایک مہر برآمد ہوتی ہے جو 'ارادت جنگ' کے نام سے ہے۔ اس نسخے میں بھی تزک آصفیہ کا نام 'آصف نامہ' سے تحریر کیا گیا ہے۔ قد وقامت کے اعتبار سے 23.7x12.8cms

ہے۔سطور کی تعداد کسی ورق پر ۱۸اور کسی پر ۱۲ ہیں۔

(۴)نسخہ چہارم سالار جنگ میوزیم،حیدرآباد: تزک آصفیہ کا یہ قلمی نسخہ ناقص الاخر ہے اور فولیوز کی تعداد ۲۴۸ ہے اور کتاب نمبر ۱۵۶ (کیٹالاگ نمبر ۳۸۸) میں دستیاب ہے۔اسکا سائز 32.0x21.6cms ہے اور خط نستعلیق میں لکھا گیا ہے۔کاتب کا نام 'محمد ندیم' اور سال کتابت ۱۲۵۹ھ ہیں۔نسخے میں ابواب سرخ سیاہی میں لکھے ہوئے ہیں اور عبارت با آسانی پڑھ سکتے ہیں۔اس نسخے میں ۱۷۷۶ء تک کے حالات درج ہیں اور خاتمہ مندرجہ ذیل عبارت پر ہوتا ہے:

''بعد انقضای ایام بارش کہ چہرہ سپھر نقاب ابر برداشت جھان را از پرتو خود درخشان نمود و آفتاب جھان تاب در برج کوس رایت اقبال افراختہ تمام روی را بہ خلاف موسم ولایت اقلیم دیگر سرسبز و شاداب فرمود بندگان حضرت بروز سید کہ دقیقہ سنجان کواکب نبک غنی۔''

(۵) نسخہ پنجم سالار جنگ میوزیم،حیدرآباد: تزک آصفیہ کا یہ نسخہ کتاب نمبر ۱۵۸ (کیٹالاگ نمبر ۳۸۹) کے تحت موجود ہے اور ناقص الاول ہے۔قد و قامت کے اعتبار سے یہ نسخہ 24.5x15.2cms ہے اور خوبصورت خط نستعلیق میں تحریر ہے۔اوراق کرم خوردہ اور زرد ہیں اور اس میں سطور کی تعداد ۱۵ ہے۔اس نسخہ کی شروعات 'ادگیر' کی جنگ سے ہوتی ہے جو ۱۷۶۰ء میں واقع ہوئی تھی۔ذیل کی عبارت سے اسکا آغاز ہوتا ہے۔

''زبال جوش پختہ نبود تدبیر بشری و تقدیر ایزدی۔۔۔۔۔''

اورینٹل مینوسکرپٹ لائبریری،حیدرآباد میں تزک آصفیہ کے دو قلمی نسخے دستیاب ہیں مندرجہ ذیل انکا ذکر کیا جا رہا ہے۔

(۱)نسخہ اول: تزک آصفیہ کے اس قلمی نسخے کا شمارہ کتاب ۵۲۶ ہے جو ۲۰۲ فولیوز پر مشتمل ہے۔اسکی لمبائی چوڑائی 22.5x13.5cms ہے۔ہر صفحہ سطر ۱۴ کا حامل ہے۔نسخے میں اوراق کے چاروں اطراف سرخ بارڈر ہے اور صاف و قابل استفادہ ہے۔اس میں ابواب کی عبارت کو سرخ سیاہی سے واضح کیا گیا ہے۔نسخے کی شروعات میں ایک مہر ثبت ہے اور ساتھ میں کچھ تحریر بھی ہے جسکا مطالع دشوار ترین ہے۔نسخے کے آخر میں نواب آصف جاہ کی مدح میں اشعار درج ہیں۔

نعل سم یکران او در گوش گردون حلقہ بر
وصف عمیم احسان او شیرین تر از شیر وشکر
امرش بہ ارباب جھان باید سرا پا عدل زان

بذلش بر اصحاب امان شاید چہ در بحروچہ بر
انعام او دان عام تر اکرام او خوان پی حصر
صحن زمین زو بھرور بام فلک زان مھر بر

نسخے پر کاتب کا نام درج نہیں ہے البتہ سال کتابت سے متعلق نسخے کے آخری صفحہ پر ترکیمہ موجود ہے جس میں سن کتابت ۱۲۶۰ھ تحریر ہے۔

ترقیمہ: ''تمت الکتاب بعون الملک الوھاب بتاریخ چھارم شھر شوال المکرّم ۱۲۶۰ حسب الفرمایش را و حاجب المناقب عالی مناصب فیض بخش فیض رسان منبع الجود والاحسان واقف علوم سیاق وسباق مصدر حلم والاشفاق کاخ فطانت رای بنید وفھرست دفتر و داد بھادر میدان ھمت جوھر شمشیر استقامت جادہ پیائ عقل وفرھنگ ودریائ بزرگی رانھنگ مشرف فیلخانہ سرکار گردون اقتدار بلند اخلاق نیک طینت وبلند قیاس نیک نیت دانائ اسرار دولت راو پاندورنگ پنڈت سلمہ اللہ تعالی تمت الکتاب تزک آصفیہ من تصنیف جامع علوم صوری ومعنوی تجلی علی عرف شاہ تجلی رحمۃ اللہ علیہ کتبہ العبد المذنب احقر العباد میر احمد علی غفر ذنبہ وستر عبدہ اللھم اغفر وارحم وتجاوز عما تعلم انک انت العلی الاعظم۔''

آلھی ھر آنکس کہ این خط نوشت
عفو کن گناھان عطا کن بھشت
ھر کہ خواند دعا طمع دارم
زانکہ من بندہ گنہ گارم

(۲) **نسخہ دوم:** تزک آصفیہ کا یہ مکمل نسخہ خط نستعلیق میں تحریر ہے جس میں فولیوز کی تعداد ۱۹۷ ہیں۔ شروعات 'بسم اللہ ارحمٰن الرحیم' سے ہوتی ہے۔ اسکا کتاب نمبر ۳۲۷ اور سائز .31.5x19.6cms ہے۔ ہر صفحہ پر تعداد سطور ۱۵ ہے۔ نسخے میں نظم اور ابواب کی عبارت کو سیاہ سیاہی سے لکھا گیا ہے اور اول ورق پر فہرست کتاب تواریخ تزک آصفیہ تحریر ہے۔ کاتب کا نام 'محمد عباس لکھنوی' اور سال کتابت ۱۲۹۸ھ ہے اسکی تصدیق مندرجہ ذیل ترکیمہ سے کی جاسکتی ہے:

''الحمدللہ کہ نسخہ تاریخ تزک آصفیہ بتاریخ بیست ودویم شہر ربیع الاول ۱۲۹۸ھ روز دو شنبہ وقت سہ پہر بخطابی ربط احقر الناس محمد عباس اوستادزادہ نواب مقرب مقرب

الدولہ بہادر خویش غازی الدین حیدر اباد شاہ لکھنو حسن تحریر یافت نوشتہ بماند سیہ بر
سفید نویسندہ را نیست فروا امید۔"

نسخہ تزک آصفیہ، نیشنل میوزیم نئی دہلی: نیشنل میوزیم، نئی دہلی میں تزک آصفیہ کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے جو خط نستعلیق میں تحریر ہے جس میں ۱۷۳ فولیوز موجود ہیں۔ ہر صفحہ پر سطور کی تعداد ۱۵ ہے۔سائز کے اعتبار سے .26.6x16.0cms ہے۔ نسخے کے شروع میں دو مہر ثبت ہیں جو **'منیر الملک'** کے طور پر پڑھی جاسکتی ہیں۔اسکی حالت قدر بہتر اور قابل استفادہ ہے۔ نسخے کے مطالع سے معلوم ہوتا ہے کہ تجلی علی شاہ کو خط نستعلیق میں مہارت حاصل تھی اور ساتھ ہی نسخے پر مصنف کے دستخت (صفحہ F3) سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خط شافعی اور خط شکستہ میں بھی دسترس رکھتے تھے۔اس مخطوطہ میں مصنف نے اپنی نقاشی کے خاص جوہر دکھائے ہیں جسکی گواہ خوبصورت اور دلکش تصاویر ہیں۔تجلی نے یہ نسخہ ۱۱۸۵ھ یعنی ۱۷۷۱ء میں لکھنا شروع کیا تھا۔مصنف نے کتاب کی شروعات تمہید کے بعد میر نظام علی خان کی پیدایش ۱۱۴۶ھ یعنی ۲۴،فروری ۱۷۳۴ء کے واقعات سے شروع کی ہے،اس کے بعد نظام ملک آصف جاہ کی سلطنت کی آخری دور کی تاریخ رقم کی ہے جو اس دور کے بانی تھے۔عیدالفطر ۱۲،مئی ۱۷۹۳ء تک کے واقعات پر اس نسخے کا اختتام ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا جن اہم کتب خانوں اور تحقیقی مراکز میں تزک آصفیہ کے قلمی نسخوں کی رسائی کا ذکر ہو چکا ہے انکے علاوہ بھی یہ امید کی جاسکتی ہے کہ ہندوستان اور دیگر ممالک کے کتب خانوں میں تزک آصفیہ کے اور بھی قلمی نسخے موجود ہو سکتے ہیں جو کسی نہ کسی وقت محققین کی کاوشوں سے منظر عام آینگے۔

فہرست مراجع:

۱۔دکن کے بہمنی سلاطین، ہارون خان شیروانی مترجم رحیم علی الہاشمی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی، ۱۹۷۸ء

۲۔ارمغان ادب، ڈاکٹر سیدہ عصمت جہاں، شعبہ فارسی مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد، ۲۰۰۹ء

۳۔ایضاً

4.The Early History of the Deccan,G.Yazdani,New Delhi-55

5.Dictionary of Indo-Persian Literature,Nabi Hadi,New Delhi,1995

۶۔ مخطوطہ تزک آصفیہ، کیٹالاگ نمبر ۳۸۵، ص ۱۷۲، سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد

۷۔ مخطوطہ تزک آصفیہ، کیٹالاگ نمبر ۳۸۶، ص ۲۹۲، سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد

۸۔۴۔ مخطوطہ تزک آصفیہ، کیٹالاگ نمبر ۳۸۷، ص ۲۷۰، سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد

۹۔ مخطوطہ تزک آصفیہ، ص ۴۰۳، اورینٹل مینوسکرپٹ لائبریری، حیدرآباد

۱۰۔ایضاً،ص۳۹۵

۱۱۔مخطوطہ تزک آصفیہ،ص۳،نیشنل میوزیم،نئی دہلی

ڈاکٹر احمد حسن ندوی
شعبہ فارسی
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

مخمس کریمای سعدی

تفتہ کی تصانیف میں ایک کتاب ''خمسۂ عجیب خاطر فریب'' معروف بہ ''مخمس کریما'' کے نام سے نظر آئی جس کا تذکرہ نہ تو مالک رام نے اپنی کتاب (تلامذۂ غالب اور ذکر غالب) میں کیا اور نہ ہی دوسرے تذکرہ نگاروں مثلاً عبدالرؤف عروج (بزم غالب)، لالہ سری رام (خمخانہ جاوید)، مظفر حسین صبا (روز روشن)، عرش ملسیانی (فیضان غالب)، نصر اللہ خاں خویشگی (گلشن ہمیشہ بہار) نے کیا ہے۔ یہ حسن اتفاق کہئے کہ تفتہ کی تصانیف کی تلاش کے دوران رضا لائبریری رامپور میں اسکا ایک نسخہ مل گیا جو ۱۸۵۹ء میں مطبع مفید الخلائق، آگرہ سے چھپا ہے۔

یہ تصنیف درحقیقت سعدی کی کتاب کریما پر مخمس ہے جو زیادہ تر حمد و نعت، خطاب بہ نفس، جود و کرم، بخل و تنگ دلی، تواضع و انکساری، کبر و غرور، علم و دانش، عدل و انصاف، ظلم و جبر، حرص و آز، قناعت و سیر چشمی، طاعت و عبادت، صبر و شکیبائی وغیرہ دینی اور اخلاقی مضامین پر مشتمل ہے۔ ظاہر ہے ایسے مضامین کو سعدی جیسا مشہور قادر الکلام شاعر جس انداز سے بیان کرے گا اس میں چار چاند لگا دے گا۔ کیونکہ وہ غیر معمولی علم و دانش، عقل و فہم، شاعرانہ ذوق و قریحہ اور تجربات کے حامل تھے۔ اسی کے ساتھ ان خیالات کے دلآویز اظہار کی غیر معمولی صلاحیت و لیاقت بھی رکھتے تھے کہ اگر اسے بے نظیر نہ کہا جائے تو کم نظیر ضرور ہے۔ تقریباً سات سو سال گذرنے کے بعد بھی سعدی کی نظیر ایران میں نظر نہیں آتی ہندوستان کا کیا پوچھنا۔ دور حاضر کے مشہور نقاد اور مصنف علی دشتی نے اپنی مشہور آفاق کتاب ''قلمرو سعدی'' میں سعدی کے بابت جو کچھ لکھا ہے اس سے بہتر نہیں لکھا جا سکتا ہے:

> ''جدل ناپذیر ترین کار سعدی سخن اوست۔ در تاریخ ادبی ایران کہ گویندگان چیرہ طبع فراوانند سعدی بطور خیرہ کنندہ ای می درخشد۔ کسی چون او صنعت و سادگی، استحکام و روانی، عذوبت و رقت را بہم نیامیختہ و بدین موزونی سخن نگفتہ است۔
>
> قدرت وی در سخن بہ پایہ ایست کہ نقطہ ہای قابل انتقاد وی را در ناحیۂ فکری پوشانیدہ و حسن بیان چنان بر مطالب او پوشش زیبای می ریزد کہ خوانندہ را از غور و

تعمق بازمی دارد و نقطہ ہای ضعف و متناقضات گفتہ ہای وی بچشم نمی خورد۔''(۱)

سعدی کا کلام ایسا ہے جس میں بحث کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ایران کی ادبی تاریخ میں جہاں بہت سے قادر الکلام شاعر پیدا ہوئے ہیں ان کے درمیان سعدی حیرت انگیز طریقے پر اپنی درخشندگی کا جلوہ دکھاتے رہے ہیں۔ کوئی شاعر ان کی طرح صنعت و سادگی، استحکام و روانی، حلاوت و شیرینی کو اتنی ہماہنگی اور موزونی کے ساتھ اپنے کلام میں پیش نہیں کر سکا۔

شاعری میں اس کی توانائی اور قدرت کا یہ عالم ہے کہ اس کے قابل تنقید نقاط بھی اس کے فکری پہلو میں نہاں ہو کر رہ گئے ہیں اور حسن بیان ان کے مضامین کے قالب کو اتنا خوبصورت لباس پہناتا ہے کہ قارئین کو اس پر غور و فکر کرنے میں وہ آڑے آتا ہے اور سعدی کے متضاد اور کمزور الفاظ اس کی نگاہوں میں نہیں کھٹکتے ہیں۔

ایسے قادر الکلام شاعر کے کلام پر مخمس لکھنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے۔ راقم السطور نے مخمس کریما کا اول سے آخر تک بغور مطالعہ کیا اور محسوس کیا کہ سعدی کی تقلید میں تفتہ نے اپنی فکری اور ذہنی صلاحیتوں کو پوری طرح کام میں لگایا اور اس ذمہ داری کو بخوبی نبھایا ہے۔ اس نے اپنے دماغ میں محفوظ ذخیرۂ الفاظ کے استعمال اور دلکش و دلآویز ترکیب سازی میں اپنی صلاحیت و لیاقت اور استادگی و مہارت کا پوری طرح مظاہرہ کیا ہے۔ سعدی کہتے ہیں:

کسی را کہ گردد زبان دروغ
چراغ دلش را نباشد فروغ

''دروغ'' اور ''فروغ'' کے قافیہ کا تلاش کرنا بہت مشکل کام تھا لیکن تفتہ نے اپنے ذخیرۂ الفاظ سے اس کے ہموزن الفاظ نکال کر انتہائی مہارت سے انہیں استعمال کیا اور سعدی کے شعر کی قطار میں لا کر اس طرح کھڑا کر دیا کہ قاری تفتہ اور سعدی کے کلام میں کوئی فرق نہیں کر سکتا۔ اور اسی کے ساتھ اسے غیر معمولی لطف بھی ملتا ہے۔

بود گر ترا خنجر و تیغ و توغ
بود گر ترا سوی کس عز و سوغ
ہمین روغن آوردہ ام من ز دوغ
کسی را کہ گردد زبان دروغ
چراغ دلش را نباشد فروغ

توغ علم و نشان کے معنیٰ میں ایک ترکی لفظ ہے اور سوغ روانگی کے معنیٰ میں اور دوغ مٹھا (چھاچ) کے معنی میں ہے۔ تقریباً یہ سب الفاظ نامانوس اور کم استعمال ہیں۔ لیکن تفتہ کے شاعرانہ ذوق کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ ان کو

سعدی کی تقلید میں کامیابی حاصل ہوئی۔

اس مخمس میں سادگی، شگفتگی اور برجستگی بالکل سعدی کے کلام جیسی نظر آتی ہے جس سے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بہت سے مقامات پر تفتہ نے اپنے تخلص کو بھی اس میں شامل کر دیا ہے لیکن سادگی و شگفتگی کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ ذیل میں کچھ نمونے ملاحظہ ہوں:

تو گر تفتہ پُر دانشی زینہار
میاموز جز علم و شو با وقار
بہ پندی کہ گویم دمی گوشدار
برو دامن علم گیر استوار
کہ علمت رساند بدار القرار

بود تفتہ در فقر عز و وقار
بکن تفتہ از صدق فقر اختیار
دہد فقر آسودگی بیشمار
ندارد خردمند از فقر عار
کہ باشد نبی را ز فقر افتخار

بطاعت چہ می پرسی از خیر و شر
ز طاعت بود بہ نہ چیزی دگر
خرد مندی ای تفتہ اینجا اگر
ز طاعت نپیچد خرد مند سر
کہ بالای طاعت نباشد ہنر

بیا بہر تقوی دل خود بسوز
دگر دیدہ بر روی تقویٰ بدوز
ز سعدیست این بیت بر لب ہنوز
ز تقوی چراغ روان بر فروز
کہ چون نیک بختان شوی نیکروز

بدوزخ مسوز و بعصیان مساز
بعصیان مساز و سرخود مباز
درین راہ کج تفتہ ہرگز متاز
ز عصیان کند ہوشمند احتراز
کہ از آب باشد شکر را گداز

شاید انہیں خصوصیات کی وجہ سے منشی جوالاسروپ مبارک نے اس مخمس کی تاریخ کہی ہے:

این مخمس بارک اللہ طرفہ چیزی گوئیا رحمت آورد آسمان بر مدفن سعدی ازو
دید وتاریخش مبارک از زبان تفتہ گفت ''می دمم جان دگر اندر تن سعدی ازو''

۱۲۷۵ھ

حوالہ جات:

۱۔قلمروی سعدی،علی دشتی، چاپ تہران ص۳۲
۲۔مخمس کریما،منشی ہرگوپال تفتہ چاپ مبطع مفید خلایق ۱۸۵۹ء،ص۲۱
۳۔ایضاً ص۸،۱۲،۱۵،۱۶،۲۶،۲۷

محمد سعد ظفر
ریسرچ اسکالر، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

نجات الرشید: عہد اکبری کی اہم تصنیف (ایک مطالعہ)

عبدالقادر بن ملوک شاہ بن حامد شاہ، متخلص بہ قادری، ہندوستان میں دسویں صدی ہجری کے معروف و مقبول نثر نگار ہیں. وہ مؤرخ، قلمکار، مترجم، شاعر، موسیقی دان، اور بادشاہ اکبر کے پیش امام (بروز بدھ) تھے. وہ " بدایونی اور ملا بدایونی" کے نام سے بھی شہرت رکھتے ہیں. راجستھان کے بساور کے مضافات "ٹوڈہ بھیون" میں 17 ربیع الاول سنہ 947ھ مطابق 21 اکتوبر 1540ء میں شیر شاہ سوری کے عہد میں ایک فاروقی گھرانے میں پیدا ہوئے ۔(منتخب التواریخ، نولکشور، ص۹۸) وہ شیخ بچو سنبھلی کے شاگرد اور شیخ مبارک ناگوری کے تربیت یافتہ تھے. تحصیل علم کے بعد وہ حسین خان کے یہاں نو سال تک مامور خدمت رہے اور 981ھ میں جلال خان قورچی کے توسط وسفارش سے اکبر کے دربار میں ملازمت اختیار کر لی، وہ خود رقمطراز ہیں:

"ودراواخر ذی حجہ این سال فقیر بحسب تقدیر کہ زنجیر پای تقدیر است از صحبت حسین خان گسستہ واز بداون بہ آگرہ آمدہ بہ وسیلہ جلال خان قورچی ومرحوم جالینوسی حکیم عین الملک شاہنشاہی راملازمت نمود" (منتخب التواریخ، ج۲، تہران، ص۱۱۸)

بدایونی نے متعدد مذہبی کتابوں کا سنسکرت سے فارسی زبان میں ترجمہ کیا. انہوں نے سنگھاسن بتیسی (نامہ خردافزا)، اتھرین (اتھروید)، مہابھارت اور راماین جیسی کتب کا ترجمہ کیا. اس کے علاوہ بھی انہوں نے کئی ترجمے کئے لیکن ان کی شاہکار تصنیف "منتخب التواریخ" ہے جسے "تاریخ بدایونی" کے نام سے بھی جانا جاتا ہے. بدایونی 1004ھ میں بدایوں میں انتقال کر گئے۔

ان کی ایک کتاب "نجات الرشید" بھی ہے. اس کتاب کو بدایونی نے اپنی عمر کے آخری پڑاؤ (منتخب التواریخ سے قبل) میں نظام الدین احمد ہروی کے ایماء اور تشویق پر لکھا. یہ کتاب ظاہر فقہی موضوعات پر مشتمل ہے، اس کے سارے مسائل کو عقلی ونقلی دلائل کے ساتھ ساتھ احکایات وامثلہ سے مزین و مرتب کیا گیا ہے اور جا بجا قدیم شعرا کے مناسب اشعار سے عبارت کی پیوندکاری کی گئی ہے. وہ کبھی تصوف وعرفان کے مسائل پر بحث کرتے ہیں تو کبھی اخلاقی مطالب اور انسانی سجایا وطبائع کے بارے میں بات کرتے ہیں۔

دسویں صدی ہجری کا ہندوستان بہت سے الٹ پھیر سے دوچار ہوا ۔اس لئے کہ اس دور میں ہندوستان تیموریوں کے تسلط میں آ گیا تھا اور بابران کا سرخیل تھا ۔اس کے بعد اس کا بیٹا ہمایوں تخت سلطنت پر متمکن ہوا اگر چہ پندرہ سال تک اس کو ہندوستان سے باہر زندگی گزارنا پڑی مگر اس نے قزلباش فوجوں اور صفوی حکمرانوں کی مدد سے دوبارہ اپنے باپ کی گدی حاصل کر لی ۔اس کے بعد اس کا بیٹا اکبر ہندوستان کی گدی پر جلوہ افروز ہوا اور پچاس سال تک حکومت کی ۔بادشاہ اکبر کا عہد ہندوستانیوں کے لئے بہت سی نوید اور بعض مذہبی خرافات لے کر آیا ۔یہ الگ بات ہے کہ اکبری عہد کو سنہری عہد کہا گیا لیکن یہ بات بھی صحیح ہے کہ مذہبی مسلمانوں اور ہندوں کے لئے یہ دور بہت تلخ بھی تھا. اس دور میں بہت سے گروہ ایسے وجود میں آئے جو جدیدیت کے علمبردار تھے انہوں نے آزاد منشی کو اپنا شیوہ بنایا ۔اکبر خود بھی متعصب علماء کی گرفت سے آزاد ہونا چاہتا تھا اور وہ آزادی کو پسند بھی کرتا تھا اسی سبب سے اس کے ارد گرد تجدد پسند افراد اکٹھا ہو گئے جس کے نتیجے میں عوام الناس کے درمیان ایک قسم کا خلل پیدا ہو گیا. اس دوری وخلل کو دور کرنے کے لئے بہت سی کوششیں کی گئیں ۔اور حالات کو دوبارہ بحال کرنے کے نتیجے میں کئی تحریکیں وجود میں آئیں ۔علماء اور اصلاح کنندگان نے فرداً فرداً بہت کوششیں کیں ۔شیخ عبدالحق محدث دہلوی انہیں علماء میں سے تھے جنہوں نے اصلاح معاشرہ کے لئے انتھک کوششیں کیں۔

جو علماء عوام الناس کے لئے متفکر تھے ان میں سے ایک نام ملا عبدالقادر بدایونی کا بھی تھا ۔وہ اگر چہ اکبر کے امام اور درباری ملازم تھے مگر اصلاح معاشرہ اور ایک نستعلیقی سماج کی تعمیر کے لئے بہت فکرمند تھے ۔زیر بحث رسالہ ان کی انہیں کوششوں میں سے ایک ہے ۔ یہ کتاب عبادات کے لئے ابھارتی اور شوق دلاتی ہے اور خرافات سے متنفر و بیزار کرتی ہے ۔اس لئے اگر ہم اس کتاب کو ان کی دوسری کتاب "منتخب التواریخ" سے مقایسہ کرتے ہیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ "نجات الرشید" ایک قسم کا مقدمہ یا منتخب التواریخ کا ابتدائی نقش ہے اور وہ موضوعات جو کہ نجات الرشید میں خوبصورت جملوں اور سادہ سبک کے ساتھ آئے ہیں وہی ان کی اگلی کتاب یعنی منتخب التوریخ میں تند و تلخ لہجے کی صورت میں وارد ونمودار ہوئے ہیں اور ان میں طنز و بیزاری شامل ہو گئی ہے.

بدایونی نے نجات الرشید میں معاشرے کی خرابیوں اور ان کی اصلاح کی صورتوں کو آشکار کیا ہے ۔اگر چہ اس کتاب کے موضوع کے سلسلے میں اختلاف ہے ۔ کتاب کے مطالعہ کے بعد ایسا معلوم پڑتا ہے کہ کتاب اپنے معاصر عہد کی خرابیوں اور بدلاو کے بارے میں ہے، معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب ظاہرا فقہی اور معنوی طور سے صوفیانہ ہو مگر اس کی اصلی روح اصلاح معاشرہ خصوصا اس عہد کے مسلمانوں کی اصلاح ہے جو کہ آج بھی افادہ واستفادہ سے خالی نہیں ۔ محققین نے اس کتاب کے موضوع کے بارے میں مختلف قسم کی آراء کا اظہار کیا ہے اس کتاب کے

بارے میں انسائکلو پیڈیا آف اسلام کہتا ہے کہ:

"A work on Sufism, ethics and the Mahdawi Movement of Badaunis day"

(Encyclopedia of Islam)

یہ بات صاف ہے کہ اس کا موضوع تصوف نہیں ہے . لیکن اگر اس کا موضوع اخلاق شمار کیا جائے تو بھی درست نہیں اس لئے کہ خود بدایونی نے اس کتاب کے اخلاقی ہونے کے بارے میں عدم اتفاق ظاہر کیا ہے وہ اسی کتاب میں لکھتے ہیں کہ:

"واگر توفیق رفیق باشد مجملی از آن اخلاق در دفتر ہا علاحدہ بعد ازین مذکور می گردد، انشاء اللہ تعالی –وآنچہ درین وقت بالفعل ضروری است بیان گناہانی است ورای اخلاق کہ بزبان شرع، اسم صغیرہ وکبیرہ بران اطلاق می رود" (نجات الرشید، ص۲۲)

اس لئے اگر ہم یہ کہیں کہ یہ رسالہ اکبری عہد میں رائج مذہبی انحرافات کے ردعمل میں لکھا گیا اور اس کا موضوع اصلاح معاشرہ ہے، تو زیادہ مناسب معلوم پڑتا ہے . اور اس طرح سے ہم سید معین الحق جو کہ اس کتاب کے مرتب ومحشی ہیں کی رائے کے زیادہ قریب پہونچ جاتے ہیں وہ اس کتاب کے مقدمے میں اس کے موضوع کے بارے میں فرماتے ہیں کہ:

''یہ حقیقت ہے کہ اس کا موضوع تصوف نہیں بلکہ قرآن، حدیث اور فقہ کی روشنی میں شعائر اسلام یا اسلامی اقدار کی تشریح ہے"

نجات الرشید صرف ادبی لحاظ سے ہی اہمیت کی حامل نہیں ہے بلکہ اس میں تاریخی، اصلاحی، فقہی، عرفانی پہلو کے ساتھ ساتھ اور بھی خصائص پائے جاتے ہیں . یہ کتاب دسویں صدی ہجری کے سماجی حالات کو بھی بیان کرتی ہے، اس میں ان مسائل کو جگہ دی گئی ہے جو مصنف کے عہد یا اس سے کچھ سال پہلے وجود میں آئے اور اس موضوع پر جامع ترین کتاب ہے. چونکہ یہ کتاب اپنی انفرادیت وجامعیت کے باوجود ابھی تک محققین کی توجہ کو اپنی طرف جلب نہ کرسکی اور جو کچھ اس کتاب کے بارے میں اطلاعات ومعلومات ہیں وہ بہت ہی کم اور مایوس کرنے والی ہیں. دو یا تین مختصر و ناکافی مقالوں کے سوا کچھ نہیں ہے اس لئے اس کے بارے میں مزید بحث کی ضرورت ہے.

بدایونی نے اس کتاب کو لکھنے کی جو وجہ بتائی ہے کافی دلچسپ ہے کیوں کہ اس سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے

کہ کس طرح سے لوگ شکوک وشبہات سے بچتے تھے .وہ کہتے ہیں کہ ان کے ایک دوست نظام الدین احمد ہروی (958ھ تا1003ھ) جو کہ اکبر کے دربار میں ملازم تھے وہ ایک دن ان کے پاس ایک طومار لے کر آئے جس کو انہوں نے خود تیار کیا تھا اور مجھے اس کو پورا کرنے کے لئے مہمیز کیا، فرماتے ہیں کہ:

" یکی از اصحاب رفعت وارباب مکنت لایزال کاسمہ، نظام الدین احمد کہ صورتش لطف مجسم وحقیر را رسم اخلاص با او مستحکم بود، طوماری داد مشتمل بر ایراد عیوب دل و آفات نفس از قلیل وکثیر ومحتوی بر مقدار بعضی از افراد گناہان کبیرہ وصغیرہ وفرمود کہ چون این جرائم وکبائر ذمائم کہ دانستن آن از عظائم عزائم است، اینجا بر سبیل اجمال است، بتفصیل ودلیل باید کہ پارہ دیگر اضافہ ساختہ منشاء وماخذ آنہا را درمیان ایجاز مخل اطناب مملّ بیان کنی ." (ہمان ماخذ، ص۲)

ایک دوسری جگہ جو کہ شاید نظام الدین احمد کی وفات کے بعد کا اضافہ ہے فرماتے ہیں کہ:

"چون باعث وبانی این خطاب مستطاب میرزای مرحومی ومغفوری ومبروری بود" (ہمان ماخذ، ص۵۳۰)

یہاں پر یہ سوال ضرور اٹھتا ہے کہ آخر کار نظام الدین نے اس کو خود کیوں نہیں پورا کیا؟ کیوں بدایونی کو اس کے لئے آمادہ کیا؟ اس سلسلے میں سید معین الحق صاحب نے تین امکانات پیش کئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ نظام الدین اکبر کے درباری ملازم تھے اس لئے وہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ اکبر کی بے التفاتی کا شکار ہو جائیں یا ملازمت کی وجہ سے ان کو اتنی فرصت نہیں تھی کہ وہ اس کو پورا کر سکیں یا پھر بڑھاپے کے سبب سے ان کی ہمت جواب دے گئی ہو (مقدمہ نجات الرشید). تو یاد رکھنا چاہئے کہ نظام الدین احمد نے 1003ھ میں وفات پائی ہے اس لئے تیسری توجیہ خارج از بحث ہے اس لئے کہ 45 سال کی عمر ایسی نہیں ہوتی ہے کہ اعضاء بدن مضمحل ہو جائیں، اب دوسری وجہ یعنی عدم فرصتی باقی رہ جاتی ہے اور یہ سبب بھی اہمیت کے قابل نہیں، اس لئے باوجود ے کہ نظام الدین اس مدت میں متعدد قسم کی مشغولیات رکھتے تھے مثلاً وہ 991ھ میں گجرات ڈسٹرکٹ میں 998ھ تک مخالفین کی سرکوبی اور اکبر کی حکومت کو استحکام بخشنے کے لئے بہت ہی نمایاں خدمت انجام دیتے رہے اور پھر 1000ھ میں اجمیر، گجرات اور مالوہ میں 1002 تک بخشی گری کے عہدے پر مامور ومشغول رہتے ہیں اس لئے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ مہمات ومشغولیات ان کے اس کام میں مخل ہوں، اس لئے کہ بہت سی کتابیں ہیں جو کہ سفر ومحاصرہ کی حالت میں لکھی گئی ہیں . خود نجات الرشید کو بدایونی نے سفر کی حالت میں لکھا ہے:

"وچون عجالہ اکثر در سفر نوشتہ شدہ وکتابہا در نظر نہ بود". (ہمان ماخذ، ص۴۲۵)

دوسری جگہ پر انہوں نے مقام مسافرت کا بھی ذکر کیا ہے:

"ومقدار آنکہ درسن نہ صدونو دونہ کہ در بلدہ لاہوراین عجالہ رامی نوشتم" (ہمان ماخذ،ص۳۱۸)

اس لئے صرف پہلی وجہ باقی رہ جاتی ہے وہ یہ کہ نظام الدین نہیں چاہتے تھے کہ شک کی سوئی ان کی طرف گھومے یا کوئی منفی عمل ان کی طرف منسوب ہواور وہ شاہی عتاب کا شکار ہوجائیں اس لئے بدایونی جوکہ ان دنوں امورسلطنت سے دوراور علاحدہ تھےان کو ان کی طبیعت کے موافق جان کر یہ کام سپرد کردیا۔

بدایونی متعدد صلاحیتوں کے مالک ہونے کے ساتھ ساتھ فن تاریخ گوئی میں بھی مہارت تامہ رکھتے تھےاور انہوں نے بہت سی تاریخیں کہی ہیں جوکہ ان کی کتاب منتخب التواریخ میں بکھری ہوئی ہیں اس لئے انہوں نے اس کتاب کو لکھنے کے بعد بھی ایک تاریخ کہی جس سے اس کتاب کا سن تالیف نکل آتا ہے:

شداین نامہ ازلطف ایزد پدید
بسال سعید و بروز حمید
چوآمد نجات دلم زان بفال
نجات الرشیداست تاریخ سال

(ہمان ماخذ،ص۵۳۱)

اس سے اس کتاب کا سن تالیف 999ھ حاصل ہوتا ہے، دوسری جگہ انہوں نے اس کتاب کی سنہ تکمیل اور مقام دونوں ذکر کیا ہے:

"ومقدار آنکہ درسن نہ صدونو دونہ کہ در بلدہ لاہوراین عجالہ رامی نوشتم" (ہمان ماخذ،ص۳۱۸)

نجات الرشید سید معین الحق کی ترتیب وحواشی کے ساتھ ادارہ تحقیقات پاکستان، پنجاب یونیورسٹی لاہور سے نومبر 1972ء میں اشاعت پزیر ہوئی تھی . یہ کتاب ۵۳۱صفحات پر مشتمل ہے جس میں سات سو سے زیادہ فارسی اور عربی کے اشعار کا ذخیرہ موجود ہے جن میں سے 50 عربی اشعار اور 50 فارسی کے اشعار ملا عبدالقادر بدایونی کے شامل ہیں جس سے بدایونی کی شعری صلاحیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے . پوری کتاب سات فصل پر منقسم ہے اور ہر فصل کے ضمن میں چالیس مسائل پر گفتگو کی گئی ہے . پہلی فصل توبہ کے مسائل پر ہے، دوسری کفر صریح کے اقسام پر مبنی ہے، تیسری بدنی افعال وعبادات کے بیان میں ہے، چوتھی فصل بغیر کسی عنوان کے ہے اور اس فصل میں شاید مصنف نے کئی مسائل کو نہیں لکھا ہے اور وہ چالیس کی عدد کو نہیں پہونچتے ہیں اور پڑھنے کے بعد یوں محسوس ہوتا ہیکہ جلدی میں لکھا گیا ہو، پانچویں فصل منافی مروت اور خلاف ادب کے بارے میں ہے، چھٹی محرمات اور منہیات دیگر کے عنوان سے بیان کی گئی ہے، ساتویں فصل منہیات متفرق کے عنوان سے ہے. یقینی طور پر یہ کتاب اکبری عہد کو سمجھنے کے لئے ایک بہت بڑا گنجینہ ہے.

اگر منتخب التواریخ اور نجات الرشید کا آپس میں مقایسہ کیا جائے تو دونوں کے تار و پود ایک معلوم پڑتے ہیں اور ایک دوسرے کی مدد سے ان کا تجزیاتی مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

بدایونی نے اپنی اس کتاب میں جو روش اختیار کی ہے وہ معاصر سبک سے بالکل الگ ہے کیوں کہ اس عہد میں عموماً منشیانہ اور تصنع آمیز طرز تحریر رائج تھی مگر بدایونی نے بالکل سادہ و سلیس نثر میں اس کتاب کو لکھا، یہ کتاب سادہ تر روش اور معقول تر شیوہ رکھتی ہے اور مترادف و متضاد الفاظ کی مقدمہ چینی سے پاک اور سادہ و رواں جملوں سے مزین اور آسان مطالب وصنعت گری بیان و معانی سے عاری ہے . مصنف نے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ واقعہ نگاری کے وقت کبھی کبھی مترادف جملات کا بھی استعمال کیا ہے یا کوئی ضرب المثل یا بزرگوں کی زندگی سے کوئی واقعہ یا قدیم شعرا میں سے کوئی فارسی یا عربی کا شعر اپنے مطالب کو بیان کرنے کے دوران بڑھایا ہے جس سے پڑھنے والے کو تھکان محسوس نہیں ہوتی اور کبھی کبھی بدایونی اپنے کلام کے اثبات کے لئے دوران کلام کوئی ایسی حکایت جو کہ ان کے زمانے میں ہوئی ہو کو بھی بیان کرتے ہیں:

" درسن نہ صد وہفت صد و شش در آگرہ جوانی پاکیزہ منظری از اعیان سادات بلاد گرم سیر کہ در کالپی از ہند توطن داشت سید موسی نام – بر ہندوزنی زرگری مقبول بدیع الجمال عاشق شد و مدتہای دراز در بوتہ ی عشق او می سوخت و می گداخت ..... و چند مرتبہ قصد برآوردن او کرد . الاخ" (ہمان ماخذ، ص ۴۵۷)

بدایونی نہ صرف فارسی زبان سے بخوبی آشنا تھے بلکہ زبان تازی پر بھی قدرت تامہ رکھتے تھے اگر چہ ایک مدت تک ترجمے کی مشغولیات کی وجہ سے ان کی رغبت فارسی سے زیادہ ہوگئی تھی لیکن اس مشغولیت کے باوجود بھی ان کی وہ کتابیں جن کو انہوں نے اپنی مرضی اور طبیعت سے لکھا ہے سب دینیات سے وابستہ ہیں وہ ہمیشہ دینیات اور تصوف کی طرف مائل رہے اسی وجہ سے اکبر چاہتا تھا کہ ان کو اجمیر میں معین الدین چشتی علیہ الرحمہ کے مرقد اقدس کا مجاور بنادے لیکن ابوالفضل کی مداخلت کی وجہ سے ایسا نہ ہوسکا بدایونی نے اس بارے میں منتخب التواریخ میں بات کی ہے، وہ عربی زبان کے عالم تھے اور عربی زبان کے ادبی اشارات سے بخوبی آشنا تھے اسی لئے وہ عربی شعرا کے کلام سے بھی اپنے مطالب کو بیان کرنے کے لئے مدد لیتے ہیں، ایک جگہ وہ حشر ونشر کے بارے میں بات کرتے کرتے ابوالعلاء المعری (363/449 ھ) کا شعر اس طرح سے چسپ کر دیتے ہیں کہ ان کا موقف واضح ہو جاتا ہے اور سارے اختلافات بھی رفع ہو جاتے ہیں، اگر چہ یہ شعر دیوان میں کچھ الفاظ کے پھیر بدل کے ساتھ درج ہے، دیکھئے:

قال المنجم والحکیم کلاہما لن یحشر الاجساد قلت الیکما

ان صح قولکما فلست بخاسر ان صح قولی فالخسار علیکما

ترجمہ: منجم و حکمایہ کہتے ہیں کہ بدن محشور نہیں ہوگا، اگر ان کا قول صحیح ہے تو میں خسارے میں نہیں ہوں اور اگر یہ بات درست ہے تو تم دونوں کو نقصان ہے۔

دوسری جگہ وہ یہ شعر بھی نقل کرتے ہیں جو اختلاف قرات کے ساتھ بھی وارد ہوا ہے:

اذا کانت الغراب دلیل قوم

سیھدیھم سبیل الھالکینا

(ہمان ماخذ، ص۸۴)

ترجمہ: جب کوا کسی قوم کا رہنما بن جائے تو وہ صرف ہلاکت کی طرف ہی رہنمائی کریگا۔

بدایونی نے اپنے اشعار کو بھی اس کتاب میں جگہ دی ہے:

شاہ عربی کہ شد جہان مظہر او سوگند سرش خورد جہان داور او

خود سایہ حق بود ازان سایہ ندارد تا پا نہ نہد کسی بجای سر او

(ہمان ماخذ، ص۴۹۵)

وہ کبھی ہندوستانی رسوم کے ذریعہ سے عشق خداوندی کا درس دیتے ہیں کہ اگر تم چاہتے ہو کہ عشق کو سمجھو تو ہندوں کی عورتوں کو دیکھو جو شوہر کی وفات کے بعد شوہر کے ساتھ آگ میں جل جاتی ہیں اس لئے کہ محبوب کے بغیر عشق کوئی معنی نہیں رکھتا اور عشق کا نقطہ عروج وصل ہے جو اس دنیائے مادی میں میسر نہیں .اس اقتباس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ بدایونی متصوفانہ فکر و نظر کے حامی رہے ہیں:

"اما آنچہ دیدہ آن است کہ بعد از مردن شوہر چہل چہل و پنجاہ پنجاہ و بیش از زنان نگاہی سرمتی (؟) وزرو زیور پوشیدہ بالنعش شوہر مردہ بازی کنان وسخن گویان بشوق تمام سوختہ اند و پروانہ وار در وفای او وخود را بپاد فنا در دادہ ــ و در بعضی دیار مردان نیز کہ خدمتی متعین نزدیکی داشتہ اند از روی وصلات ہمراہ صاحب خود در آتش افتادہ اند ــ وعجب از مردانگی ما ست نہادان کہ مقدار زنان ہم در وادی محبت نشدیم ونسبت صدق عشق با محبوب حقیقی درست نہ کردہ ایم ــ واگر غیرتی داشتیم ہمین تازیانہ بس بود ــ اما کاہل تنان رااز ینہا چہ باک:

در طریق عشق نتوان شد کم از ہندو زنی

ازبرای مردہ سوز دزندہ جان خویش را"

(ہمان ماخذ،ص۴۱۲)

اس مختصر مقالے میں طول کے سبب سے اس کتاب کے بارے میں بہت ہی مجمل اطلاعات فراہم کی گئی ہیں گویا کہ یہ نجات الرشید کا ایک مختصر تعارف ہے ۔ یہ کتاب ایک ایسا معجون ہے جس کا قوام فقہ،تصوف،اخلاق واصلاح کی آمیزش سے تیار کیا گیا ہے ۔ کتاب نقد و بررسی کا تقاضا کرتی ہے اس لئے کہ اس کی بہت سی جگہوں پر اشعار، الفاظ و بیت کی تبدیلی کے ساتھ درج کئے گئے ہیں۔اگر اس کتاب کا نظر عمیق سے مطالعہ کیا جائے تو یہ کتاب عہد اکبری کی تہذیب وثقافت کی جا بجا نشان دہی کرتی ہوئی نظر آتی ہے جو کہ افادہ واستفادہ سے خالی نہیں اس لئے کہ بنیادی طور پر یہ کتاب ان مسائل پر گفتگو کرتی ہوئی نظر آتی ہے جو اس دور میں عوام الناس کے درمیان غلط طریقے سے رائج ہو گئے تھے۔

منابع وماخذ:

- آزاد: مولانا محمد حسین، دربار اکبری، مطبع ایچ ایس آفسیٹ پریس چاندنی محل نئی دہلی 2-.2012
- بدایونی: عبدالقادر، منتخب التواریخ . منشی نول کشور.1867
- بدایونی: عبدالقادر، نجات الرشید، بہ ترتیب وحواشی سید معین الحق، ادارہ تحقیقات پاکستان، پنجاب یونیورسٹی، مطبوعہ ظفر سنز پرنٹرز،9-کوپر روڈ، لاہور، نومبر.1972
- بدایونی: عبدالقادر، منتخب التواریخ، جلد اول، دوم وسوم، تصحیح مولوی احمد علی صاحب چاپ تہران.
- الدیوان ابی العلاء المعری www.aldiwan.net//:https
- عبدالرحمٰن: سید صباح الدین، بزم تیموریہ، دارالمصنفین شبلی اکیدمی اعظم گرہ.1995

E.G.Brill. FIRST ENCYCLOPEDIA OF ISLAM,Vol.2, 1913-36, new york London 1987.

ISSN: 2394-5567 **S. No. 18**

بخواندم یکی مرد هندی دبیر سخن گوی و گوینده و یادگیر

(فردوسی)

DABEER

(An International Peer Reviewed Refereed Quarterly Literary Research Journal for Persian Literature)

VOLUME: VI ISSUE: III & IV

JULY - DECEMBER 2019

Editor

Ahmad Naved Yasir Azlan Hyder

Address:

Dabeer Hasan Memorial Library

12, Choudhri Mohalla, Kakori,Lucknow,

U.P.-226101 (INDIA)

Review Committee

Prof. Azarmi Dukht Safavi, Aligarh

Prof. Shareef Hussain Qasmi, Delhi

Professor Abdul Qadir Jafery, Allahabad

Prof. Masood Anwar Alvi Kakorvi, Aligarh

Prof. Umar Kamaluddin Kakorvi, Lucknow

Prof. Tahira Waheed Abbasi, Bhopal

Prof. Mazhar Asif, New Delhi

Editorial Board

Prof. Syed Hasan Abbas, Director Rampur Reza Library, Rampur

Prof. S. M. Asad Ali Khurshid, Director IPR, AMU, Aligarh

Prof. Aleem Ashraf Khan, HOD Persian, DU, Delhi

Prof. Syed Mohammad Asghar, Chairman, Deptt. Of Persian, AMU

Pro. Shahid Naukhez Azmi, HOD Persian, MANUU, Hyderabad

Dr. Mohammad Aquil, HOD Persian, BHU, Varanasi

Dr. Iftikhar Ahmad, HOD Persian, Maulana Azad College, Calcutta

Dr. Mohammad Qamar Alam, Aligarh Muslim University, Aligarh

Dr. Anjuman Bano Siddiqui, Deptt. Of Persian, Karamat College, Lucknow

Co-Editor

Dr. Mohammad Tauseef Khan Kaker

Assistant Professor, Department of Persian, Aligarh Muslim University, Aligarh

Atifa Jamal

Research Scholar, Department of Persian, Lucknow University, Lucknow

Prof. Latif Hussain Shah Kazmi
(Professor & Chairman)
Department of Philosophy,

Aligarh Muslim University, Aligarh, UP., India.

RELEVANCE OF MORAL VALUES FOR PEACEFUL CO-EXISTENCE

A. INTRODUCTION:

Our present society around the globe has mostly become valueless, selfish, irrational, full of prejudice, unethical and inhuman in its thought and action. There is no need to refer to various religious texts or otherwise to authenticate the claims of modern person for his/her being a political, social, religious and humane agent to serve humanity irrespective of any man-made consideration. Our crises aredeepeningthat we prefer to remain fixed in our so-called self-created cages and corners which we generally owed from our misunderstood culture, rituals, irrational historical narrations, illogical religious arguments and self-preferred ideologies. A good life is, and must be, lived with values --- and amongst all values the spiritual and moral values play a vital role in a person's life for building of his/ her character, career, and concern about the other human and non-human beings.

In Indian scenario, particularly, our so-called political, religious and social leaders and advocates irrespective of any particular partyor group have left a remarkable ill-impression of their unethical and immoral behaviour on the minds of thousands of people and unnecessarily provoke them for immoral activities through thought and action. The human values are mostly wiped out and no care or fear for breaking of any religious or state law and order. Religion could guide human beings for all sorts of difficult situations in life and making balance in home and society but the true spirit of religion is lost somewhere.

In fact, religion has effectively been an important source of inspiration as well as a spiritual force for humankind. In reality, religion is the embodiment of man's first onto-cosmic, moral, legal and social conceptions. It starts with the recognition of human nature or the given state of man; the condition, in which he carries with him the legacy of his animal nature. Indeed, the all-embracing nature of religion is highlighted by the fact that it embraces the totality of human existence.

Moreover, religions with their subsequent theological interpretations as well as systematizations have been providing vital and

crucial world-views, value-systems and civilisational endeavours to billions of people throughout the ages. However, it is also true that various religions tend to provide propagate and impose their exclusivistic agenda, which is both understandable and explainable. Like other great religions, the conventional interpretation of Islām is also a powerfully crafted *exclusivistic* outlook. This exclusivistic propaganda not only hindered non-Muslims to understand the vision and mission of Islām but also the Muslims who themselves failed to know its true spirit based on *al-Tawhīd*(Oneness of God)and theProphet's *Sunnah* (practices) embeddedwith love and service to humankind keeping in view of human rights and duties as well.

Here, we would like to bring out Islāmic perspective of morality, earnest care for human rights with special reference to the Qur'ān, traditions *(Sunnah)* of the Prophet, his beloved companions and few great Islāmic Ṣūfī-poets and thinkers.

B. THE QUR'ĀNIC MORAL TEACHINGS:

1. The Islāmic Mission of Peace and Respect of Human Rights

Islām is one of the major religions of the world. It is a religion of peace, tolerance and good-will. It has swayed the minds and hearts of a large section of humankind. '*Islām'* literally means 'submission'. Accordingly, Islām is a religion (*din*) that is based upon the universal principle of submission to God. A Muslim, thereupon, is he 'who completely submits himself to *Allah*' (God). To stipulate Islām as '*Muhammadanism'* or to consider it as Semitic Religion is to misunderstand its basic character and content. It is not derived after the name of Prophet Muhammad, as is the case with other great religions like Christianity, Buddhism, etc. Islām is the universal religion of humankind. It is chiefly based on *Tawhīd* (unity of God). All messengers of Allah in this sense were the messengers of Islām because their call or invitation to people was: "Submit to *Allah* (God) in worship and obedience, and associate nothing with Him'.[1] Muhammad is not the founder of Islām, but last of the prophets and the messengers of God. According to the Islāmic teachings, Muhammad as a person must be regarded as immune from serious errors. In fact, his overall behaviour is regarded by the Muslims as *Sunnah* or the 'perfect model', and its cognitive internationalization by Muslims may become so acute and so keen as to make their consciousness identical with the moral law itself.[2] We find in Muhammad's personality both the moral law and religious values, which are indeed God's commands. He acted upon the commandment of God regarding making peace even with enemies of Islām, maintaining goodwill and caring for human rights. The Qur'ān instructs to the Prophet:

[1] *The Holy Qur'ān*(Text, Tran. and Commentary by A. Yusuf Ali, Amana Corp. Maryland (USA), 1983),4:36.

[2] Fazalur Rehman, *Islām*(Weidenfeld & Nicolson, London, 1966), pp.11-29.

> As for such [of the unbelievers] as do not fight against you on account of your faith, and neither drive you out from your homelands, God does not forbid you to deal kindly with them and to behave towards them with full equity: for, verily, God loves those who act equitably. (*Al-Qur'ān,* 60:8)

He forcefully and devotedly tried to translate *Allah's* Words (the Qur'ān) into action and made all possible efforts for establishing peace, mutual harmony and goodwill as a caretaker of human rights and duties. Thus, his own conduct is a 'perfect example' to be followed by the humankind as he has been presented to be mercy for all the realms of Being by the Qur'ān. He explains theoretically and demonstrates practically about human rights and duties, the meaning of mercy, justice, kindness, goodness and tolerance to humankind and to other non-human living creatures of God.

2. The Qur'ānic Ethics of Man and Human Dignity:

The Qur'ān exhorts us about the respect and betterment of humanity. The central concern of the Qur'ān is '*man'* and his betterment. The Qur'ān, in a simple and forceful manner, emphasizes "the individuality and uniqueness of man,"[1] and assigns him the highest status of being a Vicegerent *(Khalīfah)* and trustee of God on the Earth. The Qur'ān says:

> Behold, thy Lord said to the angels: I will create a Vicegerent on earth". They said: "Wilt Thou place therein one who will make mischief therein and shed blood?—whilst we do celebrate Thy praises and glorify Thy holy (names)?" He (God) said: "I know what ye know not." (*Al-Qur'ān,* 2:30)

> O mankind! Be conscious of your Sustainer, who has created you out of one living entity, and out of it created its mate, and out of the two spread abroad a multitude of men and women. And remain conscious of God, in Whose name you demand [your rights] from one another, and of these ties of kinship. Verily, God is ever watchful over you! (*Al-Qur'ān,* 4:1)

> Now, Indeed, We have conferred dignity on the children of Adam, and borne them over land and sea, and provided for them sustenance out of the good things of life and favored them far above most of Our creation. (*Al-Qur'ān,* 17:70)

The Qur'ānic message or mission is to establish a better social order on moral grounds to promote peace, justice and goodwill with a view to bringing about a humane world-order by respecting and giving human rights to the concerned. Accordingly, *Allah* has also prescribed certain

[1] Iqbal, M., *The Reconstruction of Religious Thought in Islām,* (Sh. M. Ashraf Lahore, 1944), p. 95. (Also see *al-Qur'ān*2:30 & 33:72).

ethical commandments for the regulation of human conduct. These commandments provide a framework for human behaviour and it is essential for men to perform or operate every action within the given framework. Man should not at all jump to the suicidal conclusion that he can make and unmake moral law according to his 'heart's desire'. Human fulfillment or self-realization is attainable only through surrender to the value-system prescribed by God *(Allah).* The Absolute Supremacy and Majesty of God are most strikingly emphasized by the Qur'ān.[1]

In fact, among all creation, man has been given the most immense potentialities and capabilities and is also endowed with the 'Trust' which entire creation shrank in fear from accepting. Moreover, the idea of justice flows directly from that of the supremacy of the **Moral Law**, an idea equally emphasized by the Qur'ān. The Holy Book, with the same insistence condemns hopelessness and lack of trust in the Mercy of *Allah*, which it declares to be a cardinal infidelity. The same is true of the whole range of moral domain; power and weakness, knowledge and ignorance, suffering and retaliation, suppression and encouragement etc. – whatever man does, he must never become oblivious to the Majesty and Mercy of *Allah*. Again, it is also clearly stated in the Qur'ān that while the potentialities and capabilities of man are immense, equally immense are the penalties which man must face (on the Day of Judgment) as a result of his failure and disregarding human rights and ignoring his duties towards man and God.

The Qur'ān expresses great concern for **general moral imperatives**. The Holy Scripture, repeatedly underlines such values as individual freedom, social justice, mutual kindness, interpersonal goodness and intra-societal as well as inter-societal tolerance etc.. The Holy book persistently commands Muslims to enjoin the good. The word used for "the good" is "*ma'ruf"* which means 'that which is commonly known to be good and has got God's sanction'. It always preaches or rather commands doing good and keeping oneself away from the evil (*amr bil ma'ruf wa nahi un il munkir*).[2] Therefore, goodness, in the Qur'ānic discourse, is a part of what one may call a lived reality as it is the product of human existential experience and constructed out of our normative interpretations. In the same manner, the Qur'ānic term for kindness is "*ihsan*" which literally means 'to beautify and improve upon'. However, beautification or improving upon can have meaning and use only in the context of a certain socio-political practice under human rights.[3]

The characteristic features of Islāmic religion are grounded in moral principles for taking care of human rights and maintaining peace and goodwill in human society. It ordains us to be sincere and friendly to all

[1] Fazalur Rehman, *op. cit.,* p. 35.
[2] *AI-Qur'ān,* 3: 104 and 110.
[3] Khaled Abou El Fadl, ""The Place of Tolerance in Islām" (Beacon Press, 2002; An Article through *Islāmic Research Foundation,* Inc.(source: Internet), p. 4.

human beings and has very carefully elaborated upon human values, rights, and duties since its inception.

The Qur'ānic ethical teachings forcefully stress the significance of human reality in all aspects of life without any racial or religious or socio-political prejudices. In fact, Islām in multiple contexts underlines the need for inculcation of tolerance. Its' prime ethicalvalues such as freedom, justice, equality, compassion, respect for life, dignity of man, goodness, etc., are intimately linked to man's historical quest for a culture of tolerance. In fact, these values are reciprocally reinforced by the Islāmic culture where respect for human rights and exercise of justice and tolerance become essential elements of religion. Therefore, according to the Islāmic ethicalteachings, tolerance promotes justice and good-will towards Gods' creatures. The spiritual enlightenment of man, which is one of the prime objectives of the Qur'ān, cannot be promoted in an atmosphere of intolerance. Regarding human rights, peace and justice, the Qur'ān emphasizes that we should adopt these as moral ideals. Justice becomes an essential component of Human Rights and that is why *Allah* commands people to be just towards one another.[1] He further commands that while judging between man and man one must judge justly,[2] for God loves those who judge equitously.[3] The Qur'ān further states:

> O you, who believe, stand firmly for justice, as witness for God, if it means testifying against yourselves, or your parents, or your kin, and whether it is against the rich or poor, for God prevails upon all. Follow not the lusts of your hearts, lest you serve, and if you distort justice or decline to do justice, verily God knows what you do.(*Al-Qur'an,* 4: 135).

According to Islāmic ethicalframe-work, this world is a place of actions, a field where one sows the seeds of one's deeds, an area of self-examination and self-control, a location where man exercises his normative discretion and makes the distinction between good and evil. Again, it is a living venue where mutual love and understanding should be developed, an arena where such values as freedom and justice and tolerance should be won with indefatigable struggle and a situation where the supreme value of tolerance should not be given up even in the face of irreconcilable socio-political, theological and ideological dilemmas. All human beings are entitled to equal treatment in all matters and spheres of life.

3. The Qur'ānic EthicalConception about Other Religions:

The Qur'ān categorically and repeatedly asks us to serve human beings and be conscious of their rights and duties. Again, the Qur'ānic discourse clearly

[1] *AI-Qur'ān,* 2: 29; 16: 90; 42: 15.
[2] *AI-Qur'ān,* 4 : 58.
[3] *AI-Qur'ān,* 4 : 45.

supports an ethic of diversity and tolerance. The Holy Book accepts the reality of differences and diversity or multiplicity within human society. It says:

يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ إِنَّا خَلَقۡنَٰكُم مِّن ذَكَرٖ وَأُنثَىٰ وَجَعَلۡنَٰكُمۡ شُعُوبٗا وَقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوٓاْۚ إِنَّ أَكۡرَمَكُمۡ عِندَ ٱللَّهِ أَتۡقَىٰكُمۡۚ إِنَّ ٱللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٞ

O mankind! We created you from a single (pair) of a male and a female, and made you into nations and tribes, that ye may know each other (Not that ye may despise each other). Verily, the most honoured of you in the sight of God is (he who is) the most righteous of you. (*Al-Qur'ān,* 49:13).

لَآ إِكۡرَاهَ فِي ٱلدِّينِۖ قَد تَّبَيَّنَ ٱلرُّشۡدُ مِنَ ٱلۡغَيِّۚ فَمَن يَكۡفُرۡ بِٱلطَّٰغُوتِ وَيُؤۡمِنۢ بِٱللَّهِ فَقَدِ ٱسۡتَمۡسَكَ بِٱلۡعُرۡوَةِ ٱلۡوُثۡقَىٰ لَا ٱنفِصَامَ لَهَاۗ وَٱللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ

There shall be no coercion in matters of faith. Distinct has now become the right way from [the way of] error: hence, he who rejects the powers of evil and believes in God has indeed taken hold of a support most unfailing, which shall never give way: for God is all-hearing, all-knowing. (*Al-Qur'ān,* 2:256).

Moreover, other than a general endorsement of human diversity, the Qur'ān also accepted the more specific notion of plurality of religious beliefs and laws. Although the Qur'ān clearly claims that Islām is a Divine Religion (*din*) and entailing belief in the authenticity of Prophet Muhammad as the last messenger in a long line of acknowledged Abrahamic prophets, it does not completely exclude the possibility that there might be other paths to salvation. The Qur'ān says:

قُولُوٓاْ ءَامَنَّا بِٱللَّهِ وَمَآ أُنزِلَ إِلَيۡنَا وَمَآ أُنزِلَ إِلَىٰٓ إِبۡرَٰهِـۧمَ وَإِسۡمَٰعِيلَ وَإِسۡحَٰقَ وَيَعۡقُوبَ وَٱلۡأَسۡبَاطِ وَمَآ أُوتِيَ مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ وَمَآ أُوتِيَ ٱلنَّبِيُّونَ مِن رَّبِّهِمۡ لَا نُفَرِّقُ بَيۡنَ أَحَدٖ مِّنۡهُمۡ وَنَحۡنُ لَهُۥ مُسۡلِمُونَ

Say: "We believe in God, and in that which has been bestowed from on high upon us, and that which has been bestowed upon Abraham and Ishmael and Isaac and Jacob and their descendents, and that which has been vouchsafed to all the [other] prophets by their Sustainer: we make no distinction between any of them. And it is unto Him that we surrender ourselves." (*Al-Qur'ān,* 2:136).

At another place, the Qur'ān further asserts that diversity is a part of the Divine intention and it has a fine purpose in creation:

وَلَوۡ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ ٱلنَّاسَ أُمَّةٗ وَٰحِدَةٗۖ وَلَا يَزَالُونَ مُخۡتَلِفِينَ

And had thy Sustainer so willed, He could surely have made all

> mankind one single community: but [He willed it otherwise, and so] they continue to hold divergent views. (*Al-Qur'ān,* 11:118-120)

In reality, diversity as the fundamental feature of creation, as indicated by the Qur'ān in the above-mentioned verses, actually remained undeveloped in Islāmic theology for various reasons. However, when we look at the historical circumstances as well as the Islāmic civilizational march we clearly find instances where the followers of the Prophet of Islām, possessing authority or otherwise, have been following the teachings of the Qur'ān by treating all human beings justly. They trod the path of love and tolerance. They intuitively incorporated the crucial teachings of Islām in their lives and stood for pluralistic ethos.

The Qur'ān insists on God's unfettered discretion to accept in His Mercy whomsoever He wishes. The Qur'ān recognizes the legitimate multiplicity of religious convictions and laws. In one such verse, for example, the Qur'ān states:

> To each of you God has prescribed a Law and a Way. If God had willed, He would have made you a single people. But Gods' purpose is to test you in what He has given each of you, so strive in the pursuit of virtue, and know that you will all return to God (in the Hereafter), and He will resolve all the matters in which you disagree. (*Al-Qur'ān* 5.51).

In the same manner the Qur'ān further states that it is possible for non-Muslims to attain the blessing and salvation if they believe in God, follow the right path and do good:

> Those who believe, those who follow Jewish scriptures, the Sabians, the Christians, and any who believe in God and the Final Day, and do good, all shall have their reward with their Lord and they will not come to fear or grief. (*Al-Qur'ān,* 5: 69,72).[1]

In the light of the aforementioned verses and particularly given the fact that '*there is no compulsion in religion'* (*Al-Qur'ān,* 2:256), it follows that differences of opinion must be discussed rationally and tolerated and not suppressed. This theme is not unconnected with the principle of Divine Mercy: just as God's Mercy is described as *encompassing all things* (*Al-Qur'ān,*7:156), so Divine Guidance through revelation encompasses all human communities. The Prophet is described as a *'mercy to the whole of creation'* (*Al-Qur'ān,* 21:107), and his pious character *(Sirah)* is described as merciful and kind in the Qur'ān (9: 128); in the traditional sources the trait which is most often used to define the essence of His personality is Mercy *(hilm)*, a forbearance compounded of wisdom and gentleness.

[1] See other verses of the Qur'ān like, 22:17; 16:125.

The tolerance accorded to the other by the Prophet is thus an expression not only of knowledge of the universality of revelation, but also of the mercy, love and compassion from which this universal Divine Will to guide and save all peoples itself springs. Seen thus, the spirit of Islāmic notion of human rights and tolerance goes infinitely beyond a merely formal toleration of the Other; it is the outward ethical form assumed by one's conformity to the very nature of the Divine, which encompasses all things '*in mercy and knowledge'* (*Al-Qur'ān,* 40:7). It is also a mode of emulation of the prophetic nature which directs to the Prophet: '*Say [O Muhammad]: If you love God, follow me; God will love you*' (*Al-Qur'ān,* 3:31). To follow the Prophet means, among other things, to be gentle, lenient, sympathetic, caring and sharing to all, in accordance with the *hilm,* which defined his character: 'It was a mercy from God that you are gently disposed to them; had you been fierce and hard-hearted, they would have fled from you' (*Al-Qur'ān,* 3:159).

Moreover, concerning the disbelievers, then, the Muslim is enjoined to let them go their way unmolested, to let them believe in their own 'way' or 'religion' whatever they like as the Holy Book categorically states:

> 'Say: O you who disbelieve, I worship not that which you worship, nor do you worship that which I worship. And I shall not worship that which you worship, nor will you worship that which I worship. For you your religion, for me, mine. (*Al*-Qur'ān, 109:1-6)'.

Again, returning to the duty to deliver the message and no more, there are a number of verses to mention, for example:

> 'If they submit, they are rightly guided, but if they turn away, you have no duty other than conveying the message ...' (*Al-Qur'ān,* 3:20).

> 'If they are averse, We have not sent you as a guardian over them: your duty is but to convey the message' (*Al-Qur'ān,* 42:48).

It is for this reason that the initiatives such as "the Charter of Compassion", which admittedly presents only one side of the picture – the peaceful, loving, caring and compassionate side – are so badly needed in our times. It is our hope and prayer that the present initiative will help to draw attention to the absolute centrality of the principles of compassion and mercy, peace and love in the Qur'ānic worldview. If divine Mercy takes precedence over Divine Anger, it is because "My Mercy encompasses all things" and because God "has prescribed Mercy for Himself" (*Al-Qur'ān,* 6:12). Mercy will indeed have the last word and the disastrous situations of the international human community can safely be saved, and this is what Islāmic perspective of human rights aims at.

4. The Qur'ānic Views about Rights in Various Human Relations and Affairs:

Taking serious concern and care about human rights and duties, the Qur'ān categorically instructs the believers to remain vigilant in their relationships and in various affairs of human life. The sacred Book talks about the family relations—woman-man relationship, children and parents' relationship,[1]—behaving with relatives, orphans, friends, wayfarers, unknown human beings, believers, unbelievers and general masses.[2] The Holy Scripture also gives instructions to its believers about maintaining law and order in their social and political life, peace and goodwill, justice and tolerance, acting fairly and honestly upon business rules and following business ethics,[3] implementing ethical principles in everyday life, supporting honest and truthful persons for governing bodies and participating in public life[4] to maintain justice, impart knowledge about human rights and dignity of man[5] and helping people of all classes and faiths in their educational, social, economic and other matters and respecting other faiths.[6] The Qur'ān further lays down the principles for the faithful individuals to make themselves aware of the rights of enemies captured in war, believers of other faiths and unbelievers, how war and peace matters are dealt with[7] and so on and so forth.

Even presently, the strong political or religious oreconomic power holders are vehemently suppressing and dominating the weaker sections of human society around the world. They are foisting their social, political, cultural, and even religious supremacy upon others and especially those developing countries across Asia and Africa. One can clearly witness the violations of human rights even in the twenty-first century. Among such aggressive and shameful instances are included, for example, Hiroshima and Naga Saki (Japan), Afghanistan, Iraq, Palestine, Syria and other central Asian countries.

What needs to be emphasized here is that in keeping with the sanctity of human rights the religious leaders, politicians and other persons or leaders of various human sections should not impart controversial speeches, write, or create something that hurts the sentiments of others' faith. All such activities of the ignorant and mischievous ones entail mistrust and hatred between the followers of other religions or even

---

[1] *Al-Qur'ān,* 4:1; 4:34-35; 30:21; 33:35; 2:233;31:14-15.
[2] *Al-Qur'ān,* 2:177; 53:39; 16:90.

[3] *Al-Qur'ān,* 45:13; 16:14; 25:67; 83:1-3.

[4] *Al-Qur'ān,* 9:119; 3:104; 7:31-32; 49:11-12.
[5] 49:13; 17:70; 30:22; 2:30-39.
[6] *Al-Qur'ān*2:256, 285 16:125, 136; 11:118-20; 60:8; 29:46.
[7] *Al-Qur'ān,* 2:190; 4:75, 2:216; 8:62; 9:6.

between non-believers andbelievers. Therefore, all the intellectual lovers of human rights shall jointly have to fight against all such inhumane activities based on injustice and violation of human laws as no religion teaches hatred but preaches love *(prem, mohabat)* and service to humanity.[1]

C. THE PROPHETIC TRADITIONS:

Prophet Muhammad's life and teachings exemplify the best values of the culture of tolerance. He was undoubtedly a perfect person *(al-Insān-i Kāmil),* who possessed in him a nature so pure, so tender and yet so heroic. He inspired not only reverence, but love and goodwill as well. His courtesy to the great his affability to the humble and his dignified bearing to the presumptuous, procured him universal respect and admiration. He was the most kindhearted person and a blessing and grace *(barakah)* from God. When asked to curse someone for his misbehaviour, he replied, "I have not been sent to curse, but to be a mercy to mankind".[2] The Prophet was the pioneer of tolerance who always followed the *Tawhīdic*principles entailing love of and service to humanity. In the words of Justice Ameer Ali, the Prophets' "Modesty and kindness, patience, self-denial and generosity pervaded his conduct, and riveted the affections of all around him. With the bereaved and afflicted he sympathized tenderly. He shared his food even in times of scarcity with others, and was sedulously solicitous for the personal comfort of everyone about him."[3]

Thus, regarding the qualities of the Prophet it can be said that he is human equilibrium which has become extinct in the Divine Truth. In the words of Seyyed Hossein Nasr, the Prophet marks the establishment of harmony and equilibrium between all the tendencies present in man, his sensual, social, economic, political etc., which cannot be overcome unless the human state itself is transcended. He beautifully displays the integration of these tendencies and forces with the aim of establishing a basis, which naturally leads towards contemplation of and extinction in to the Truth or the Supreme Being. Therefore, *his spiritual way means to accept the human condition: to work for peace, goodwill, justice and tolerance, to do everything to serve humanity at large and to establish a universal process in this regard which can be normalized and sanctified as the ground for the loftiest spiritualsanctum-sanctorum*. Thus, Prophet Muhammad in his innumerable qualities that he displayed so profoundly became at once the prototype of human and spiritual perfection as well as a role-model towards its realization. The Qur'ān attests his greatness:

---

[1] *Al-Qur'ān,* 60: 8; 30:58; 17:9;21:107. (The mission of Sri Krishna, Kabir, Nanak, Hafiz, Rumi and Iqbal was to preach the religion of love, which would unite all castes and creeds and encourage serving humanity).

[2] *Cf.* Ameer Ali's *The Spirit of Islām,* (B.I. Pub., New Delhi, 1922), pp.118-9.

[3] Amir Ali, *The Spirit of Islām*, *op.cit.,* p. 120.

> We have indeed in the apostle of God a beautiful pattern (of conduct) for any one whose hope is in God and the Final Day, and who engages much in the praise of God. (*Al-Qur'ān*, 33:21)

The Prophet's love and sympathy were universal. It was he who invoked the Mercy of the Creator on all living beings. The Qur'ān revealed on him declared that the saving of one human life tantamounted to the saving of entire humankind and conversely, if anyone deliberately kills a life he kills the whole of humankind.[1]To him the service of entire humanity was the highest actof devotion. The spirit of the mission and message of Prophet Muhammad is equally valid and inspiring today and for all times to come.

Prophet Muhammad possessed the best qualities like (a) piety: the quality which attaches man to God; (b) combativeness: always engaged in combat against evil forces that negated the Truth and disrupted harmony; (c) magnanimity, because of which he became the true "model" for later ages to which all generations of Muslims have sought to imitate and emulate. In this way, the nobility or generosity of the Prophet shows itself most of all in charity towards "all men" and more generally towards "all beings". He possessed the unique qualities of doing-good (*ihsān*) to all people and nations and emerged as a Perfect Ideal of moral life. Therefore, whoever follows him understands the meaning of the religious laws, avoids error and controversy, and so can attain salvation (*najāt*).[2]

In the sphere of human rights and his services to humanity, the life and ethicalteachings of the Prophet clearly demonstrate that there were no boundaries to his charity and no limitations in *"giving"* of himself to others. In fact, in Islāmic tradition a spiritual man is one who always *"gives"* to those around him and never *"receives".* "It is more blessed to give than to receive". Therefore, it was the characteristic of the Prophet to have always 'given' till the last moment of his life. He never asked anything for himself and never sought to receive. The Prophets' most significant contributions to the spiritual authentication of man are unparalleled in the annals of human history. Undoubtedly his leadership to both the worlds (this world and the world here-after) was legitimized by the Divine Revelation. His central mission was to guide humankind towards right path, purify them outwardly and inwardly[3] and to prepare them for both the worlds.

A Charter with pluralistic provisions was issued by Prophet Muhammad for the Christian populace of Najrān, which is generally known

---

[1] Al-Qur'ān, 5: 35.
[2] Seyyed Hossein Nasr & Oliver Leaman (edts.), *History of Islāmic Philosophy* (Part II), (Routledge, London, 19960, pp. 847-8.
[3] Seyyed Hossein Nasr, *Ideals and Realities of Islām,* (George Allen & Unwin, London, 1985), pp. 73-5.

as "*The charter of Najrān"* in which he emphasized regarding their rights and other privileges(excerpt):

> To the Christians of Najrān and the neighbouring territories, the security of God and the pledge of his Prophet are extended for their lives, their religion and their property-to the present as well as the absent and others besides; there shall be no interference with [the practice of] their faith or their observances, nor any change in their rights or privileges; no bishop shall be removed from his bishopric; nor any monk from his monastery; nor any priest from his priesthood, and they shall continue to enjoy everything great and small as heretofore; no image or cross shall be destroyed; they shall not oppress or be oppressed; they shall not practice the right of blood vengeance as in the Days of Ignorance; no tithes shall be levied from them nor shall they be required to furnish provisions for the troops.[1]

In fact, Prophet Muhammad is the Blessing for all the worlds. He is perfection personified. He embodies all ethical, religious and spiritual norms. Most importantly, he was an embodiment of tolerance and patience. He represented both the *'nasut'* (human) and *'lahut'* (spiritual) dimensions at their highest. This multidimensional supreme excellence of the Prophet makes possible the presence of spirituality in Islām.[2] This spiritual path paves the way for the love, sympathy and tolerance among human beings belonging to different races, religions, areas, sects etc. Thus, the Prophet was the perfect model of an ethical behaviour, the best ruler, judge and leader of human beings. He was, undoubtedly, the creator of the perfect Islāmic society. For example, regarding women's rights, he in his Farewell Speech, said (excerpts):

> You have rights over your wives and they have rights over you…. [and] they have the right to their food and clothing with kindness. Treat women graciously and with kindness, for they are virtual captives in your keep though you have taken them only as a trust from God, and you have the enjoyment of their persons by the words of God…[3]

However, he was in addition, the prototype of the spiritual life. That is why

---

[1] Ahmed Zaki Safwat, *Jamharat Khutab al-'Arab fi'Usur al-'Arabiyya al-zahira,* 3 vols. (Beirut: n.d.),. I: 180, (cf. *Human Rights and the World's Major Religions*, (Vol. 3, The Islāmic Tradition) by Muddathir 'Abd al-Rahim, William H. Brackney, (Series Editor), Praeger. London, 2005, p. 152).

[2] *Ibid.,* p. 90.

[3] Ibn Hisham, *Sirat Rasul Allah,* 1023-1025. English translation by Alfred Guillaume, *The Life of Muhammad* (Oxford: Oxford Univ. Press. 1955), 651-652, (cf. Muddathir 'Abd al-Rahim, *op.cit.* p.153).

it is absolutely necessary to follow in his footsteps (his *Sunnah*) if one aspires towards spiritual realization. The Islāmic ethicalprinciples based on love, sympathy and grace of the Prophet are for all the human beings and it is incumbent upon all of them and more especially upon all Muslims to love him and follow his principles of universal love and tolerance. In fact, this love must be understood in an individualistic sense. Rather, the Prophet is loved because he symbolizes that harmony and beauty that pervade all things, and displays in their fullness those virtues, the attainment of Which allow man to realize his theomorphic nature or spiritual depth.[1]

Prophet Muhammad lived with dignity and he single-handedly performed the functions of prophet, lawgiver, religious leader, chief judge, commander of the army as well as the civil head of the state. In each mentioned sphere, he did his best in discharging his duties towards peoples of all faiths and the Will of God. In fact, Prophet Muhammad was the role-model of the whole human race:

> Serious or trivial, his daily behaviour has instituted a canon, which millions observe at this day with conscious mimicry. No one regarded by any section of the human race as Perfect Man has been imitated so minutely.[2]

Sir Sayyid Ahmad Khan, while discussing the spirit of the Divine mission of the Prophet of Islām, pointed out that the uniqueness of the personality of the Prophet Muhammad lies in his magnanimous and humanely nature equipped with sound metaphysical foundations. Such a great man as Muhammad, who neither received any formal education from any school or university nor bowed himself before any great philosopher or savant or seer, enlightened and inspired not only the Arab-world but also the whole of humankind across the globe.[3]

The Prophet's divinely inspired morality and respect for humanistic values and rights became blessing (*al-barkat*) for humanity as a whole. He performed great task of preaching and practicing human values that it could not have been achieved by any great philosopher or any powerful political ruler till today. What was the thing in this orphan person that demonstrated not only to the Arab peninsula but also to the whole world the wonder of divinity. These few words about our affirmation of Prophethood will be sufficient to satisfy the mind of any person who possesses a little Wisdom.[4]

The Prophet exhibited his moral behaviour and the virtue of tolerance

---

[1] *Ibid.,* pp. 80-90.

[2] D.G. Hogarth, *Arabia*, (Oxford, 1922), p. 52 (Cf. Hitti, P.K,*History of the Arab*s, (Mac., London, 1970 (10 ed. , p. 120.

[3] Christian W. Troll, *Sayyid Ahmad Khan: A Reinterpretation of Muslim Theology*, (Vikas Publishing House Pvt. Ltd., New Delhi, 1978), pp. 323-4.

[4] *Ibid.*, p. 324.

in normal social life as well as in war-situations. He never taught his companions and followers to transgress in interpersonal engagements or show an intolerant attitude towards people belonging to any faith or creed. The history of Prophet's actions, his *Suluk* and teachings are open to anyone to judge. His attitude towards non-believers, prisoners of war, non-Muslims and other enemies of Islām etc. made him a great model that translated the Words of God into actions and emerged His real representative *(Khalīfah)* on the earth.

After the Prophet of Islām, Imam 'Ali's teachings can be cited as example of careful consideration and implementation of human rights, peaceful co-existence and tolerance. In fact, for Imām 'Ali, tolerance is like a general principle or law that is applicable to the management of all the affairs of man's life in keeping with the Islāmic tradition of human rights and duties. As weknow, with regard to human rights imperative, tolerance with humane behavior has a wide scope, which covers mostly the meaning of patience, open-mindedness, steadfastness against misfortunes, forbearance, and liberalism; doing justice to all and self-control as well. In Imām 'Ali's life we clearly find all these qualities. A major portion of the *Nahj al-Balāghah*categorically deals with the superb explanation of human rights and man's duties towards man and God as well as to other non-human beings.[1]

It is high time that Muslim exegetes and interpreters intimate to their non-Muslim brethren that Islām, of all religions, exhorts man to inculcate in himself the capacity for mutual love, understanding, good-will, justice and tolerance. Conversely, the non- Muslims must also faithfully and fairly try to understand the spirit of Islām. Factually, Islām does not merely preach human rights and moral values but inspires its believers to respect human rights and abide by moral values, irrespective of personal consequences or socio-political implications.

Finally, in the sphere of careful understanding of humane situations in the twenty-first century, such doctrines of love for human rights and service to humanitiyas formulated by the Qur'ān, traditions of Prophet Muhammad, his beloved companions and the Islāmists — like Persian littérateurs and Sufi-poets like Sanāī, 'Attar, Rumi, Sa'dī, Hāfiz, and others as well as Indian Persian poets like Bu Ali, Khusru, Urfī, Faizī, Naziri, Zuhuri, Tālib, Kalīm, Dara Shikoh, Ghanī Kashmiri, Nasir Ali, Bedil, Ghālib and socio-political thinkers and educationists like Sir Sayyid, Iqbāl, Imām Khumayni and others— in the Islāmic framework, would pave the way to enlighten the global human civilized society for the better understanding of fundamental

[1]Imam Ali, *Nahj al-Balāghah,* [(Eng. Tr.), Ansarian Publication, Qum, Iran, 1981], Saying: 190, p. 531, see *Ibid*. Savings: 10. 52 and 190; *Ibid.,* Letter No. 51, p. 454; Letter No, 53, pp. 457- 459.

rights based on *humanism*and *universal brotherhood.* Let us revisit Islām, a message for all, without prejudice and narrow mindedness and see its vital and effective approach to human rights and duties anchored on its pristine mystico-ethical and human framework to live friendly and peacefully. Thus, Relevance of Moral Values for Peaceful Co-Existence requires working with dedication in the light of Islāmic spiritual and humanistic teachings and universal understanding as practiced by the great Prophet of Islām.

Dr. Bilquees Bashir

Asst. Professor, Sheikh-ul-Alam MemorialDegree College Budgam, J&K

PARVEEN EITSAMI – A REAL POETESS

Social Life

During the last eighty six years all the famous poets could not cover the fame and popularity that was bestowed to Parveen Eitsami, the Iranian poetess. Her original name was Rakshanda, but Parveen was her literary name which gained so popularity that nobody bothered to remember her by her original name. Parveen Eitsami was born in Tabriz in 1907. Her grandfather Mirza Ibraim Khan was from the dynasty of Najbahaiya Ashtiyan. He had come to Tabriz to fulfill his mission which was very important for him and dwelled at Tabriz. Parveen was born also born in Tabriz. Her father Mirza Mohd Yousf Khan was a great scholar and historian. He was expert in speaking Persian and Arabic. In so many magazines and books his articles were printed and published. During her childhood Parveen accompanied her father and other family members to Tehran and spent her whole life there. She received her basic education at her home. Later she got admission in American High School where she passed her examination in 1924. She was counted among intelligent students in the school. During her bidding goodbye to her school she delivered a lecture that denotes her ability which is famous by the name 'Women and History'. In this American High School she received education to her entire satisfaction from her teachers. She spent her time in visiting different countries and gained fame in her literary work.

Her natural gift of intelligence brought her a dominant fame among literary circles. At the age of 25, she obtained place among great poets and writers, of that time. She was married to a nearby relative in 1936, but this marriage could not last long, and she got separation very soon from her husband. In 1914, Parveen became victim of typhoid disease and passed from this world at the age of 35 and was buried in Qum.

Poetry of Parveen Eitsami:

In the Persian literature parveen obtained a supreme position which others could not do or to compete her. Her poetry follows the classical Persian tradition its form and substance. At the age of 35 she wrote Divan(book of poetry) comprising Qasaid, Mathnavi, Gazals, Qeta and stanza forms and was published three times. The famous poet and scholar Mohd Taqi Bahar wrote an

introduction of her first edition of Divan. Her poetry is full of philosophy relating to character bound and Sufism. The following verses are as under:

Ilm ast meveh shakeh haste ra

Fazal ast payeh maqsad vala ra

Ilm sarmayeh haste ast na ganj zar o mal

Rooh bayed kea z aen rah mufkher gardadd

Rehnumaye rah maneh juzz chirag aqal nest

Koosh parveen ta be tareeqi na bashee reh sepaar

We also find the colour of humanity learning and mystic concepts in her poetry and are evident from the following verses:

Aaverdeh fasal e bahar paygaam

Ien sabzeh ke bar taraf joyebaar

Dar rehguzar seel khaneh karden

Beroon shudan az kheteh aitbaar ast

Dardak ahel reseman na gardadd

Aan pambeh ke hamsayeh sharar rast

Az samil tan gar kinareh giri

Soz e tu dar aen behre kinar ast

In the poetry of parveen, we also find her aptitude and sympathy for the downtrodden and poor parsons. She represents their conditions in a pathetic way. Her essays can be divided into two parts one in which she presents the misery and anxiety of poor orphans and the other denotes the problems and sufferings of other poor persons, among which some depict reality[8]. All those essays and her poetry that represent the emotions of and bad feelings of these poor persons are given in the following writings.

1. Kalb e Rooh
2. Be pidar
3. Tifl e yateem
4. Gowher e ishq

In 'Kalb e Rooh' she represents through the tongue of orphan and poor by the feelings and emotions in a pathetic way. For example:

Way kudaki bedaman madar gireest raaz

Kaz kudakan kuye be man kase nazar nadasht

Tifli mara ze pehluye khud be gunah rand

Aan teer tanah zakham kam az neeshtar nadaasht

Atfaal ra be suhbat man az che behal neest

Kudak magar nabood kasi ku pidar na daasht

Imroz ustad va bedarsam negah nakarad

Mana ke ranj o saye faqiran samar nadasht

Juz man miyan aen gul o baran kasi nabuvad

Ki muzeh eh bepa ve kulahi basar nadasht

Bar vasleh haye peer human khandeh mee kunad

Dinyar door hami pidar man magar nadasht

Az zindagani pidar khud mapurus az aanak

Cheezi begyar teshe ve daas tabar nadasht

Through these figures she holds up a mirror to others showing them the abuses of society and their failure in moral commitment. Likewise, in these debates she eloquently expresses her basic thoughts about life and death, social justice, ethics, education and supreme importance of knowledge. Some of her these kinds of poems are as follows:

1. Ganj e Aimen
2. Ey Zanjeer
3. Saiq e Agnia Ast

Here are the following verses of poem Ganj e Aimen:

Nihad kudak khirdi badar gul tabi

Be khandeh guft shahan ra cheneen kulahi neest

Bero guzasht haqimi ve guft kayi farzand

Mebarhan ast ki misl tu padshahi neest

Hanooz rooh tu ze aalayish badan pak ast

Hanooz kalab tur a neest tabahi neest

Tela khuda maslak ve tariqat shar

Juz aastaan pindar sajdeh gahi neest

Qanaat maal e yateem ast ve baghe mulk sageer

Tamaam hasil zulm ast maal o jahi neest

Bahar has compared Parveen and kept her to the level of Nasir Khusroo

One of the most important topics that Parveen presents is the way of spending life in wisdom and passes the life accompanied with ups and downs of the time.

According to Ishaq sahib this is the particular mission of Parveen. Following are the names of such kind of poems:

1. Ey Gurbeh
2. Khoon e Dil
3. Murg e Zareeq
4. Mayar e Nadan

Ey Gurbeh is an emotional poem. This poem contains modern cycle of thoughts. In Persian poems there we find examples of love in abundance but such examples are very rare, in which like Parveen someone has touched the emotions, feelings and pathos with animals in this way. The verses of this poem are as under:

Ey Gurbeh tera che shud ke nageh

Rafti ve neyaamdi digar bar

Bas ruz guzasht ve hafteh ve mah

Maloom neshud ki chun shud aen kaar

Jayee tu shabangeh ve sehar gah

Dard aman man tehsiyat besyaar

Dar rah tu kunad aasman chah

Kar tu zamaneh kard dushvar

Paydeh na bekhaneh ne barbaam

Bahar has compared parveen and kept her the level of Nasir Khusroo and Saadi. In her poetry we find the influence of Sabq e Iraqi, because these two poets were representatives of this style during these days. The words of Bahar are as under:

" aen divan tarkibi ast az du subk va shiveh lafzi manvi aamekhteh ba sabuk mustakil ve aan yaki

Shiveh shureh khurasani ast khaseh ustad Khusroo ve digar shureh Iraq v Fars be vejeh Sheikh maslah u Din Saadi …….ve aen jumleh ba sabuk ve asloob mustakili (ki khas asar imrozi ve beshtar peeru mujasim maani ve haqiqat jui ast) ki tarkeeb yafteh ve shiveh e badeh bevajud aavurdeh ast.

In her qasidas we find that there is colour and influence of wisdom. Her Qasidas are without any parise. It is because of these writings in addition to morality of the world she gives advices about the way of life. She says that the world is mortal so she discarded the luxurious life and set aside all comforts of the world. She advised that one should keep aside the jealousy envoy from his heart and live a simple life.

Aey shudeh shifteh giti ve du Danish

Dehar darya ast benadeesh ze tufanash

Aankas ki chu see murg be neshanast

Az rehzan ayaam dar amanst

In short, during her short life span she played a marvelous role in revolutionizing the Persian poetry which other poets could not do. Definitely her poetry is a precious addition to the Persian poetry. If the life had been faithful to her she would have added the new chapters to the Persian poetry.

Notes and References:

1. Daneshgar, Ahmad(2004) Parveen Etesami: a poetess from light's area. 3rd edition, Iran: Hafez Tehran. P 20
2. Akbari, Rahim Chavosh(1999), life and poems of Parveen Etesami: the famous poem. Tehran: salesnashr. P 25
3. Divan Parveen P 28.
4. Ibid P 17.
5. Ibid P 108.
6. Ibid P 228 – 229
7. Hafezi, Banafshe,(1998). "Parvin's politics and her social thought." Women's perspectives. Tehran: Nashr Tosea. P 30

Sabahat Nausheen
Assistant Librarian, Rabindra Bhavana, Visva-Bharati, Santiniketan,Bolpur
West Bengal

Hidden Treasures of Tagore's Land: Collection of Arabic, Persian and Urdu Manuscript of Visva-Bahrati

Abstarct:

This article brings about the hidden treasure of Tagore's land, which is a collection of Arabic, Persian and Urdu Manuscript of Visva-Bharati. Under a huge golden bunch of manuscript lies the collection of some oriental manuscript which opens the door of many research avenues not only in the concerned subject but about the interest of Tagore's and his fore fathers towards the Language and rendering services for its upliftment. This article also reveals the growing interest of Rabindranath Tagore and travelling across India and Globe for the Poet of the concerned subject, meeting with them and inviting some to his asrama for better understanding of the subject.

Introduction:

Visva-Bharati University is one of India's major public Central University and institution of national importance located in Santiniketan, West Bengal, India. It was founded by Noble Laureate Rabindranath Tagore who called it Visva Bharati, which means the communion of the world with India. In its initial years Tagore expressed his dissatisfaction with the word 'university', since university translates to Vishva-Vidyalaya, which is smaller in scope than Visva Bharati. Until independence it was a college. Soon after independence, in 1951, the institution was given the status of a university and was renamed Visva Bharati University.

Rabindranth's grand father was known as Prince Dwarkanath Tagore because of his lavish in expenditure. His extravagances brought him the title of Prince .He had the proud privilege of being called "Prince Dwarkanath" by the people of Bengal and outside.

Maharishi Devendranath Tagore was thrity years old only when his father Prince Dwarkanath Tagore passed away. He faced a lot of financial crisis and state management affairs. But his strong belief on unseen supreme power made him cross every difficulty. His management of States and paying off to creditors is still remarkable to entrepreneurs of today and indeed a matter of further research.

[He did not like to see the God in the darkness of belief rather in the light of knowledge, and for that aim of his he had put every endeavour. He felt that with the knowledge of the outward things we can reach the inner core of our ownself.]

He visited numerous places in Bengal, Amritsar, Lahore, Multan and Rangoon are worth mentioning. He travelled to preaching , proclaiming and establishing Brahmo Samaj where practicable.

In 1863 Maharishi Brought a land at Bolpur in Birbhum district where he made an abode of peace called Santiniketan.He dedicated Santiniketan with all its grounds and belongings to the public for the purpose of worship by a trust-deed.

On 19th January 1905 when Devendranath left for the eternal abode of peace, Shri Anand Mohan Bose addressed to Satyendrantah Tagore in one of his letters that "he might have been a maharaja long before this .but he choose for him the better part, maharajas die but Maharshis live in the greatful hearts of the unborn generations".

Rabindranath Tagore writes "Fortunately for me I had a place ready to my hand where I could begin my work. My father, in one of his numerous travels, had selected his lonely spot as one suitable for his life of communion with God. This place, with permanent endowment, he dedicated to those who seek peace and seclusion for their meditation and prayers. I had about ten boys with me when I came here and started my new life with no previous experience whatever. My resources were extremely small, with the burden of a heavy debt upon them. But this poverty itself give me the strength of freedom, making me rely upon truth rather than upon materials". I found my message in the sunlight that touched my inner mind and felt a fullness in the sky that spoke to me in the word of our ancient rishi_ "who could ever move and strive and live in this world if the sky were not filled with love?"

Visva-Bharati in making:

The origins of the university date back to 1863 when Maharshi Debendranath Tagore, the zamindar (land lord) of Silaidaha in East Bengal, was given a tract of land from Babu Sitikanta Sinha, the Zamindar of Raipur, which is a neighboring village not far from Bolpur and present-day Santiniketan and set up an ashram at the spot that has now come to be called Chatim Tala at the heart of the town. The ashram was initially called Brahmacharya Ashram, which was later renamed Brahmacharya Vidyalaya. It was established with a view to encourage people from all walks of life to come to the spot and meditate. In 1901 his youngest son Rabindranath Tagore established a co-educational school inside the premises of the ashram.

From 1901 onwards, Tagore used the ashram to organize the Hindu Mela, which soon became a centre of nationalist activity. Through the early twentieth century the zamindars of Surul (Sarkar Family), another neighboring village, a few minutes by cycle from the Uttarayan Complex, and the zamindars of Taltore, a village just north of the university town, continued to sell their lands and other properties to the ashram and the college that was being built on this spot.[2]

On 23 December 1921 Tagore formally started the college with proceeds from the prize money of the Nobel Prize he received in 1913 for the publication of his

book of poems Gitanjali. The college also became a centre of Brahmo learning in this period. It was granted full university status in May 1951 by the government of independent India. The poet's youngest son, Rathindranath Tagore, became the first upacharya (vice chancellor) of the new university. Another member of the Tagore family who performed the role of upacharya was Indira Devi Chaudhurani, a niece of the poet.

Rabindranath Tagore believed in open air education and had reservations about any teaching done within four walls. This was due to his belief that walls represent conditioning of mind. Tagore did not have a good opinion about the western method of education introduced by British in India, on this subject Tagore and Gandhiji's opinion matched. Tagore once said "I do not remember what I was taught; I only remember what I learnt". Tagore's idea on education was that every person is genius and that all students may not bloom at the same time. So he devised a new system of learning in Visva-Bharati. He allowed students to continue their course till the student and his teacher both are satisfied.

The formal inauguration of the Visva-Bharati took place on 22 December, 1921 at a meting held at Santiniketan which marked the anniversary of dedication of the Asram Temple by his father thirty years ago. The constitiution was registered in May 1922 and a trust deed was also drawn up at the same time.

At every step Rabindranath tried to associate Santinketan with the World at large. He wrote to his son Rathindranath in 1916:

“The Santiniketan School must me made the thread linking India with the World .we must establish there a center for humanistic research Concerned with all the World’s peoples. The age of narrow Chuvanisim is coming to an end for the sake of the future; the first step towards this great meeting of the world humanity will be taken in these very fields of Bolpur. The task of my last years is to free the world from the coils of national Chauvinism”.

Visva-Bharati represents **“*Indian where she has her wealth of mind which is for all. Visva-Bharati acknowledges India’s obligation to offer others the hospitality of her best culture and India’s right to accept from others their best*”** (***Rabindranath Tagore)***.

Gurudev Rabindranath Tagore had a broad vision of the cultural unity of the Asian countries which he expressed at several occasions during his visit to Iraq and Iran. The idea of giving shape and form of such centre of learning of Arabic, Persian, Urdu and Islamic Studies was conceived and materialized by Tagore himself in the year 1927 with generous donation of Rs one lakh by the then Nizam of Hyderabad. Julius Germanus, Ex –Prof of Islamic Studies, Oriental Institute of the Royal Hungarian University, was the first Nizam Professor of Islamic Studies and L. Bagaanov was the first Persian Teacher.

In 1932, Rabindranath received an invitation he could not refuse. The King of Iran, Reza Shah Pehalvi, had invited to host him in Iran. The inveterate traveler

started his journey along with his daughter in law, Pratima Debi and his literary secretary, Amiya Chakravorty.

On May 6, 1932 Tagore's birthday was celebrated by many Persian admirers in Iran.
Acknowledging a medallion and a scroll of honour sent by the government, he wrote in his diary, *In my country... only my relations were there to rejoice and receive me. Today on the anniversary of my birth date, the recognition that you have given me in a foreign land has made me a truly universal man*.

Rabindranath Tagore's father Maharishi Debendranath Tagore knew Persian Language and collection of Persian Poet Hafiz was always found by his bedside, hence he was also keen towards the language. On his visit to Ajmer he listend to translation of Josh mallihabadi's Poem "The Dawn" from Sarojini Naidu and the next day it happened to met Josh Malihabadi and praised a lot, Tagore gave him a title "The son of Dawn". Tagore wanted to know in details about Poetry of Hafiz so he invited Josh Malihabadi to Santiniketan. Josh has explained in his autobiography "Yadon ki Barat"about his stay in Santiniketan and meeting with Rabindranath Taogre.

There are other examples also where famous Urdu Novelist Munshi PremChand Novels finds similarities from that of rabindranath Tagore. There are evidences where the Premchand confesses to be inspired by short stories of RabindraNtah Taogre.The common interst of both the authors has invited the meeting of them.Once Munshi PremChand was invited to Santiniketan, at those time travelling was not a very easy and comfortable phenomena,hence due to ill health Munshi Prem Chand Could not make it to Santiniketan.Though he admired Rabindranath Tagore many a times for his creativity in short stoties, novels and paintings.

Abuzar hashmi Says that Tagore was awre of Iqbal and his poetry.Quoting Prabhat Kumar Mukhopadhyay ,Santiranjan Bhatatacharya,Tagore visited Lahore in 1934 and went to Iqba's House but the latter was away from Lahore .Tagore praised the Poetry of Iqbal and latter wrote a poem on Iqbal when he died in1936.Both of them have similarities in poem for their common interest ie: love for nature, patriotism .

***The Journey of Manuscript*:**

Thus we can say that the ties between Tagore and his dream behind development of the Department dedicated to the studies of Arabic, Persian, Urdu and Islamic Studies was inherited from his Father Maharishi Debendranath Tagore. It is needless to state the role of manuscript in Arabic, Persian and Urdu played a significant role for the enhancement of the study of the above mentioned subjects. It was the Department of Arabic, Persian, Urdu and Islamic Studies which donated all the manuscripts to the Central library ,Visva-Bharati by Late Prof Tahir Ali of the Deapartment for better preservation and use by the Scholars, latter on when the separate Manuscriptorium of Visva-Bharati was set up which is called Lipika Manuscriptorium, these manuscript were transferred

to the Lipika manuscriptorium. It is an integral Part of the Visva-Bharati dedicated to the preservation, Conservation , restoration and rendering services to research scholar.

Manuscript Details:

Sl No	**Title**	**Author**	**Subject**	**Date**	**Language**	**No of Folios**	**Condition**	**Beginning Portion**	**End Portion**
1.	Unknown	NF	Astronomy	NF	Persian	70	Bad	Missing	Missing
2.	Unknown	NF	Poetry	NF	Persian	83	Bad	Missing	Missing
3.	Bustan	Sadi	Poetry	NF	Persian	64	Bad	Missing	Missing
4.	Bustan	Sadi	Poetry	NF	Persian	93	Bad	Missing	Missing
5.	Unknown	NF	Religion	NF	Persian	109	Worm Eaten	Missing	Missing
6.	Unknown	NF	Rhetoric	NF	Persian	28	Bad	Missing	Missing
7.	Khulasae Khamsae Nizami Gnajavi	Nizami Gnajavi	Poetry	1855	Persian	12	Good	Not Missing	Not Missing
8.	Dasturul Insha	Md Qalandar	Insha	NF	Persian	32	Worm Eaten	Missing	Missing
9.	Roqát-e Abul Fazal	Abul Fazl	Insha	1786	Persian	19	Worm Eaten	Missing	Not missing
10.	Diwan-e Asifi	Asifi	Poetry	NF	Persian	15	Worm Eaten	Not Missing	Missing

11.	Diwan e-Asifi	Asifi	Poetry	NF	Persian	16	Worm Eaten	Not Missing	Missing
12.	Dastur ul Insha	Yar Md Qalandar	Prose	NF	Persian	65	Worm Eaten	Not Missing	Missing
13.	Unknown	Unknown	Religion	NF	Persian	141	Worm Eaten	Missing	Missing
14.	Tuti Namah	Ziya Nakhshabi	Prose Literature	NF	Persian	102	Bad	Missing	Missing
15.	Inkthkhab-e Diwane Nasir Ali	Nasir Ali	Poetry	NF	Persian	59	Worm Eaten	Not Missing	Not Missing
16.	Kafiya	Ibne Hajib	Arabic Grammar	NF	Arabic	138	Worm Eaten	Missing	Missing
17.	Part of Quran	--	Religion	NF	Arabic	61	Bad	Missing	Missing
18	Insha-e Mukta Sarul Ebarat	Md Sharif &Amanullah Hussaini	Literature		Persian	39	Bad	Not Missing	Not Missing
19	Unknown	NF	Miscellaneous Literature	NF	Persian	73	Bad	Missing	Missing
20	Gulistan-e Sadi	SK Sadi	Literature	NF	Persian	79	Bad	Missing	Missing
21	Unknown	Unknown	Grammar	NF	Persian	107	Bad	Missing	Missing

22	Majmuae Khani	Kamal Karim Nagori	Religion	1195 AH	Persian	218	Worm Eaten	Missing	Missing
23	Madanul Jawahar	Maulvi Tarzi	Literature	NF	Persian	156	Bad & Worm Eaten	Missing	Missing
24	Unknown	Unknown	Miscellaneous	NF	Persian	48	Bad	Missing	Missing
25	Diwan-e Hafiz	Hafiz Shirazi	Poetry	NF	Persian	16	Worm Eaten	Missing	Missing
26	Ibtale-zarurat	Munshi Tek Chand Bahar	Lriterature	1886	Persian	66	good	Not Missing	Not missing
27	Sharh e gulistan-e Sadi		Literature	1184 AH	Persian	164	Bad	Missing	Missing
28	Bustan-e Sadi	Sk Sadi	Poetry	NF	Persian	140	Bad	Missing	Missing
29	Tuhfatus Sultaniya	Hasan Ibne Gul Mohammad			Persian	13	Bad	Not Missing	Missing
30			Religion		Arabic	11	Worm Eaten	Not Missing	Not Missing
31	Quran		Religion		Arabic	53	Worm Eaten	Missing	Missing

32	Unknown		Literature		Persian	114	Worm Eaten	Missing	Missing
33	Madhamalat	Manjhan	Literature		Persian	30	Good	Not Missing	Not Missing
34	Ms not avlble		Rhetoric		Persian	28	Bad	Missing	Missing
35	Afzal ul Mubin	Shah Wali Allah Mohaddis Dehlawi	Religion		Arabic	21	Bad	Not Missing	Not Missing
36	Unknown		Poetry		Urdu	6	Bad	Not Missing	Not Missing
37	Baghistan Wa		Literature		Persian	140	Good	Missing	Not missing
38	Unknown		Poetry		Persian	42	Good	Missing	Not Missing
39	Unknown		Poetry		Urdu	18	Worm Eaten	Missing	Missing
40	Panjganj		Grammar		Persian	10	Worm Eaten	Missing	Missing
41	Mufid ultalibin	Fazle Ahmed	Religion		Persian	34	Worm Eaten	Not Missing	Not Missing
42	Maktabate Abul fazl Allami	Abul Fazl	Correspondance		Persian	57	Worm Eaten	Not Missing	Not Missing
43	Inshae Matlub	Shaikh Mubarak	Correspondance		Persian	6	Worm Eaten	Not Missing	Not Missing

44	Unknown		Correspondance		Persian	8	Worm Eaten	Missing	Missing
45	Roqate Abul Fazl	Abul Fazal	Correspondance		Persian	8	Bad	Missing	Missing
46	Unknown		Correspondance		Persian	12	Bad	Missing	Missing
47	Unknown		Religion		Urdu	14	Bad & Worm Eaten	Missing	Missing
48	Unknown		Jurisprudence		Persian	8	Good	Not missing	Missing
49	Shamsula ‘Qaed	Ishaq bin Sadr uddin	Religion		Persian	55	Bad	Not missing	Missing
50	Unknown		Miscellaneous		Persian	30	Bad	Not missing	Missing
51	Misc Letters		letter		Persian	36	Bad	Missing	Missing
52	Trikh-e-Muzaffari etc		History		Persian	92	Bad	Not Missing	Missing
53	Unknown				Arabic	8	Good	Not Missing	Not Missing
54	Unknown		Judiciary		Persian	22	Bad	Missing	Missing
55	Musnawi Rumi	Maulana Jalalludin Rumi	Poetry		Persian	197	Worm Eaten	Missing	Missing

56	Unknown		Prose		Persian	138	Worm Eaten & water damaged	Missing	Not Missing
57	Dastur ul Insha	Yar Md qalandhar	Prose		Persian	144	water damaged	Not Missing	Not Missing
58	Letters		Letters		Persian	18	Worm Eaten	Not Missing	Not Missing
59	Letters		Letters		Persian	17	Bad	Missing	Missing
60	Arabic Grammar		Arabic Grammar		Persian	39	Bad	Not Missing	Not Missing
61	Unknown		Religion		Arabic Persian Etc		Bad	Missing	Missing
62	Unknown		Letters		Persian	7	Bad	Missing	Missing
63	Bustan-e Sadi	Sk Sadi	Poetry		Persian	23	Bad	Not missing	misising
64	Gulistan-e Sadi	Sk Sadi	Literary Text		Persian	35	Bad	Missing	Missing
65	Sharh-e Manavi VOl iv		Commentary	H61 AD	Persian	65	Bad	Missing	Not missing
66	Insha-e Khalifa		Prose		Persian	17	Bad	Missing	Not missing
67	Unknown				Persian		Bad	Missing	Not missing

68	Qadet ariqqa t	Alibi n Hass amud din	Religio n		Arabic	55	Wor m eaten	Not missin g	Not miss ing
69	Atbaq uzzah ab & Musa bba'Q asida-e burda h	Sharf uddin abdul mom in			Arabic		Good	Not missin g	Not miss ing
70	Unkn own		Religio n		Arabic	277	Bad	Missi ng	Mis sing
71	Fathur Rahm an	Zaka riya Ansa ri			Arabic	48	Good		
	Abdur ul Mutta qat	Hsan As-sagha ni			Arabic	22	Good		
	Al masla kul wasat	Abdu llah Ibrah im			Arabic	24	Bad		
	Al aman				Arabic	57	Good		
	Janah ma Najah				Arabic	16	Wate r dama ged		
72	Puthi Hazrat Shah	Ghul am Asgh ar Huss aini	Poetry		Urdu	10	Bad & wor m eaten	Not missin g	Not miss ing
73	Mazh ab-e Ishq	Lal Neha l Chan d			Urdu	43	wor m eaten	Missi ng	Mis sing

		Lahori							
74	Unknown		Religion		Urdu	154	Bad & worm eaten	Missing	Missing
75	Burhane Quani	Abdur Rahim Sultan Husain	Religion		Urdu	38	Good	Not missing	Not missing
76	Unknown		Religion		Urdu	19	worm eaten	Missing	Missing
77	Majmaul Azkar	Majed Baksh	Religion		Urdu	106	worm eaten	Missing	Missing
78	Not avlble								
79	Qasede Zaheer Faryabi	Zaheer Faryabi	Poetry		Persian	31	worm eaten	Not missing	Not missing
80	Badiul Insha	Yusufi	Insha (Letter writing)		Persian	8	worm eaten	Missing	Missing

There are about eighty number of Oriental manuscript among a huge collection of Lipika Manuscriptorium of Visva-Bharati. Research oriented work has not yet been doen on these manuscript since people deciphering this language are very few in this field.These collection manily has manuscript of Arabic,Persian and Urdu language. Some are very valuable and some of them are copies of the famous wok .There are fifteen manuscript in Arabic Language, fifty nine manuscript in Persian Language and nine manuscript in Urdu language. Most of

them are worm eaten but they have been beautifully restored and preserved by the Staff of Lipika Manuscriptorium, mainly tissue paper laminated. For each bundle number of folios are mentioned but language has not been deciphered hence content is not known. Therefore it is the duty of research scholar to find out content analysis and develop a descriptive catalogue so that all over world can come to know about the Collection of Rabindranath Tagore and get benefitted. One such bundle contains Five different collection of Arabic Manuscript together . Among the Persian Manuscript Collection of Siekh Sadi such as Gulistan-e Sadi, Busatn-e Sadi are worth mentioning.Masnawi-e Rumi by Md Jallaludin Rumi finds a good place.Correspondences of Abul Fazl are praiseworthy.Diwan-e Hafiz by Hafiz Shirazi is a classical piece.Tuti nama by Zia Nakhsahabi is admirable.

Conclusion:

A descriptive catalogue and content analysis of the whole collection is under process by the author and to be surfaced very shortly which is a comprehensive and detailed study for the subject and open new avenues of Research for the generations to come. It was the need of time to bring the collection on surface for research purposes and further progress for the availability upon the completion of the Descriptive catalogue will help for the online publication of these manuscript .So that the whole world can access these manuscript at the ease of the reader for further development and research on te subject.

References:

1. Dasgupta, U.(2010).Rabindranath Tagore: My life in My Words. Gurgaon: Penguin Books. 56-62p.
2. Dasgupta,U. Santiniketan and Sriniketan, Calcutta: VB Publishing dept, p.20
3. Dasgupta,U.(1998) Santiniketan and Sriniketan. Kolkata:VB Granthana Vibhag,p.34-38.
4. Ghosh,S.K. Rabindranath Tagore,1986. Delhi:Sahitya Akademi,p.21.
5. Sanyal,H. Santiniketan 1901-1951, Calcutta: VB Publishing Dept,p.36
6. Shah,S.N.Q. (2014) compiled Catalogue of Urdu Manuscripts: Nazm Urdu of Rampur Raza Library, Rampur
7. Shaikh,K.B. and Sarfaraz,A. (1935) A descriptive Catalogue of the Arabic, Persian and Urdu Manuscripts in the Library of the University of Bombay
8. A Guide to Arabic, Persian, Turkish, and Urdu Manuscript Libraries in India
9. Author(s): Omar Khalidi Source: MELA Notes, No. 75/76 (Fall 2002-Spring 2003), pp. 1-59 Published by: Middle East Librarians Association Stable URL: http://www.jstor.org/stable/29785767
   Accessed: 29-08-2016 07:48 UTC

Tarique Jameel Ansari

Research Scholar, Department of Museology,

Aligarh Muslim University, Aligarh

HISTORY OF ALIGARH HERITAGE-1
HABIB MANZIL

ABSTRACT

"Heritage" in the broadest sense is that which is inherited. Everything which the ancestors bequeath may be called heritage: landscapes, structures, objects, traditions. Humans have understood the concept of heritage ever since they developed artefacts and language.

On my most recent visit to Habib Manzil Aligarh, I realized that these pre-Partition houses were gradually disappearing. I met with Lutf Ur Rahman Sherwani (Ayaz Sherwani)[1] and his family, who wanted to talk about the rich history of their homes, the culture and ways of life they embodied, and the measures they were currently taking to secure a future for their homes and themselves.

INTRODUCTION

The history, traditions, qualities that a country and society had for many years & that are considered an important part of culture, whatever we inherit from our past can be called as heritage.

Heritage means whatever we inherit from our past or many things to different people .It may be tangible, intangible, natural, cultural, moveable and immoveable.

The World Heritage Convention aims to promote cooperation among nations to protect heritage from around the world that is of such outstanding universal value that its conservation is important for current and future generations.

The present district of Aligarh, year 2001 (in the state of Uttar Pradesh) is situated in the middle portion of Doab, or the land between the Ganga and Yamuna rivers[2]. The principle town in the Aligarh district for the last many centuries has been its headquarters, Aligarh, 126 KM south east of Delhi. It is known till the 18th century by the earlier name of Kol. After the British occupation of Aligarh in September 1803, the present Aligarh district was

[1] Landlord of Habib Manzil

[2] SIDDIQI, JAMAL MUHAMMAD. Aligarh district a historical survey (from ancient to 1803) New Delhi, Munshiram Manoharlal 1981.

formed in 1804. Like other parts of Doab, Aligarh has a hot and dry climate. The mean temperature for December and January, the coldest months is 59F and 54 F, and for May and June, the extreme hot months, 90F and 93F in the shade. Both Akbar and Jahangir visited Kol on hunting expeditions; Jahangir clearly mentions the forest of Kol, where he killed wolves. From the study of the place-names of the district, it appears that the district was once fairly well covered by forest, thickets and grooves[1].

The early history of the district, indeed down the 12th century A.D. is shrouded in obscurity. An explanation is, perhaps needed of the name of the District headquarters, Aligarh and its earlier name Kol (Koil). Kol, Muhammadgarh, Sabitgarh, Ramgarh and 'Aligarh' have been the different names assigned to Koil at different times[2]. Most of the heritage buildings in Aligarh city, but Habib manzil have own importance among all of them according to the contribution of Aligarh Muslim University also[3].

HABIB MANZIL

Habib Manzil was constructed in 1933, its construction began in 1922. It took 11 year to wake it. It was constructed by MOLVI SADR YAR JUNG HABIBUR REHMAN KHAN SHERWANI. Be work was supervised by his son ALHAJ OBAIDUR REHMAN KHAN SHERWANI-ex treasurer and pro-chancellor of Aligarh Muslim University. In be absence of Sadr Yar Jung when he was in Hyderabad officiating as Minister of religious affairs and education of be Riya sat of Nizam of Hyderabad. The design of "HABIB MANZIL" is influenced by building of Hyderabad by virtue of Sadr Yar Jung's story in Hyderabad. Habib Manzil is be one of first building constructed of cement in Aligarh along with Prof. Irfan Habib's house and Allah Wali kothi in Dhodhpur by the Ford and Mc Donalds cement company. The first cement company of India[4].

[1] SIDDIQI, JAMAL MUHAMMAD. Aligarh district a historical survey (from ancient to 1803) New Delhi, Munshiram Manoharlal 1981.

[2] JAI PRAKASH AGRWAL. Aligarh Parichy.

[3] SIDDIQI, JAMAL MUHAMMAD. Aligarh district a historical survey (from ancient to 1803) New Delhi, Munshiram Manoharlal 1981

[4] Field survey of Habib Manzil building

The wood used for doors, windows is Bhutanese saal brought from Bhutan. The total area of the place is 25 bighas, the building area is waqf property who's Mutawwali is Prof. Rizaur Rehman Sherwani and the first floor is co-owned by Ayaz Sherwani.

Habib Manzil is situated at Marris Road in the vicinity of Nawab Chhatari's kothi and women's college Aligarh Muslim University Aligarh.

Habib Manzil was constructed for residential purpose in the city as first Mutawalli lived at his village Habibganj district. Aligarh, which was also his riyasat.

Presently is used for residential and commercial use as marriage home in one of empty space of the buildings.

The building has played host to Qaid-e-Azam Mohammad Ali Jinnah, Liyaqat Ali Khan, President of Yugoslavia, Marshal Tito, President of Egypt, Jamal Abdul Nasser, President and vice-President of Indonesia Mr, Sukarno and Mohammed Hatta, President Tanku Abdur Rehman of Malaysia, Prince Abdur Rehman of Saudi Arabia, King of Oman, Zahir Shah of Afghanistan as mey were guests of Aligarh Muslim University and Vice- chancellor Mr Zakir Hussain stay at this building[1].

Habib Manzil as a officiating as unofficial guest house of Aligarh Muslim University as Aligarh Muslim University had no building to serve as guest house of these dignitaries.

[1]Field survey of Habib Manzil building

Farzana Zeeshan

Research Scholar, Department of History,

Aligarh Muslim University, Aligarh

Mirat-ul-Akhbar: A Dynamic Persian Newspaper in Colonial India

Abstract

Raja Ram Mohan Roy is one of the makers of modern India. He is known as the pioneer of Indian language journalism. He published several periodicals in different languages named the *Brahmanical Magazine, Samvad Kaumudi* and *Mirat-ul-Akhbar*.This paper intends to discuss the significance of *Mirat-ul-Akhbar*in Indian journalism. *Mirat-ul-Akhbar* was one of the important newspapers of Raja Ram Mohan Roy. It was a weekly newspaper published in Persian language. Raja Ram Mohan Roy addressed many issues through his newspaper. He used his newspaper as an instrument to bring reform.

Key words: Journalism, *Mirat-ul-Akhbar,* Newspaper, Persian, Raja Ram Mohan Roy.

Raja Ram Mohan Roy is known as one of the builders of modern India. He published many newspapers and magazines in different languages in colonial India.This paper intends to highlight the importance of the Persian weekly *Mirat-ul-Akhbar*. It was a significant endeavour of Raja Ram Mohan Roy in the field of journalism in colonial India.

Raja Ram Mohan Roy was a great social and religious reformer. Rabindranath Tagore eulogized him in the words that "Ram Mohan was the only person in his time, in the whole world of man, to realize the significance of the Modern Age. He knew that the ideal of human civilization does not lie in the isolation of independence, but in the brotherhood or interdependence of individuals as well as nations in all spheres of thought and activity."[1]

Raja Ram Mohan Roy was the most important forerunner of Indian journalism.[2]It is mention worthy that "Journalism was one of the pursuits that attracted Raja Ram Mohan Roy to propagate important causes- social, religious

[1] Saumyendranath Tagore, *Builders of Modern India:Raja Ram Mohan Roy,* Publications Division, New Delhi, 1973,pp. 105-116.

[2] Raja Ram Mohan Roy is known as 'the Father of Indian language journalism'.

and political."[1]In order to propagate his ideas, he started in or around 1821 several important periodicals in different languages named the *Brahmanical Magazine, Samvad (Sambad) Kaumudi* and *Mirat-ul-Akhbar.*[2]Saumyendranath Tagore rightly observed that "All the publications that Ram Mohan started espoused important causes- social, religious and political. It was he who endowed the press with a social purpose. The crusading tradition that he established grew into a mighty power during the freedom movement."[3]

The *Brahmanical Magazine* was a weekly journal in English language. It was edited by Shiva Prasad Sharma.[4] The Serampore Christian missionaries had started a criticism of the Vedanta Philosophy through newspaper *Samachar Darpan.*[5]

Raja Ram Mohan Roy launched the *Brahmanical Magazine* as a rejoinder to the criticism of *Samachar Darpan.* The motto of the magazine was declared to be "the vindication of the Hindu Religion against Christian missionaries".[6]

The *Samvad (Sambad) Kaumudi*[7] or *the Moon of Intelligence* was a weekly journal in Bengali language. In the columns of the journal, Raja Ram

[1]*Selected Works of Raja Ram Mohan Roy,* Publications Division, New Delhi, 1977, p. 90.

[2]Nadig Krishna Murthy, *Indian Journalism,*University of Mysore, Mysore, 1966. p. 40; See also, S. K. Aggarwal, *Press at the Crossroads in India*, UDH Publishing House, Delhi, 1988,pp. 15-16; J. Natarajan, *A History of Indian Journalism,*Publications Division, Delhi, 1955.pp.14-15; G. N. S. Raghavan, *Press in India,*Gyan, New Delhi, 1994,p. 12; Sharad Karkhanis, *Indian Politics and the Role of Press,*Vikas Publishing House, 1981.p. 29; Sushila Agrawal, *Press Public Opinion and Government in India,*Asha Publishing House, Jaipur, 1970, p. 33

[3]Saumyendranath Tagore, *Builders of Modern India:Raja Ram Mohan Roy,*op. cit., p. 104.

[4] Shiva Prasad Sharma was a friend of Raja Ram Mohan Roy.

[5]Nadig Krishna Murthy, *Indian Journalism,*op. cit., p. 40; See also, G. N. S. Raghavan, *Press at the Crossroads in India*, op.cit., pp.15-16; J. Natarajan, *A History of Indian Journalism,*op. cit., pp. 14-15; G. N. S. Raghavan, *Press in India,*op. cit., pp. 13-15; Sharad Karkhanis, *Indian Politics and the Role of Press,*op. cit., p. 29.

[6] S. K. Aggarwal, *Press at the Crossroads in India*, pp. 15-16; See also, Nadig Krishna Murthy, *Indian Journalism,* p. 40; J. Natarajan, *A History of Indian Journalism*, pp. 14-15; G. N. S. Raghavan, *Press in India,* p. 15-16; Sharad Karkhanis, *Indian Politics and the Role of Press,* p. 29.

[7] In 1828, when Raja Ram Mohan Roy established the *Brahmo Samaj, Samvad Kaumudi* was its mouth piece.

Mohan Roy described the higher principle of Hinduism and denounced the *Sati*[1] system[2] of India.[3]

Mirat-ul-Akhbar or *Mirror of News* was a Persian weekly newspaper of Raja Ram Mohan Roy. At that time, Persian was the court language in Bengal.Persian possessed the same position in society as does English presently. It was on account of this that Raja Ram Mohan Roy undertook the publication of a weekly newspaper in Persian.[4]

Mirat-ul-Akhbar was launched in 1822 from Calcutta (now Kolkata).[5]A. R. Desai observed that *"Mirat-ul-Akhbar* was mainly the organ of the propaganda of social reform, and a critical discussion of religious and philosophicalproblems."[6]

In the prospectus of the newspaper, Raja Ram Mohan Roy was very specific about his editorial duties of serving the dual purpose of educating the public opinion as well as making the rulers aware of the pitiable condition of Indian society. He declared:

> "My only object is that I may lay before the public such articles of intelligence as may increase their experience and tend to their social improvement; and that to extent of my abilities I may indicate to the rulers a knowledge of the real situation of their subjects and make the subjects acquainted with the established laws and customs of their rulers: that the rulers may more readily find an opportunity of granting relief to the people; and the people may be put in possession of the means of obtaining protection and redress from their rulers."[7]

Welcoming editorially the commencement of the Persian Weekly launched by Raja Ram Mohan, the *Calcutta Journal* of Mr. James Silk

---

[1] *Sati* was the horrible custom of the burning of widows alive with the bodies of their dead husbands. It was prevalent among the Hindus.

[2]Bhowani Charan Banerjee was an orthodox Hindu. He launched a rival weekly journal entitled *Samachar Chandrika*. Through the journal, he appreciated and defended the Sati system. He opposed all the social and religious reform measures supported by Raja Ram Mohan Roy.

[3]Nadig Krishna Murthy, *Indian Journalism,* p. 40; See also, S. K. Aggarwal, *Press at the Crossroads in India*, pp. 15-16; J. Natarajan, *A History of Indian Journalism*, pp. 14-15; G. N. S. Raghavan, *Press in India,* p. 12; Sharad Karkhanis, *Indian Politics and the Role of Press,* p. 29; Sushila Agrawal, *Press, Public Opinion and Government in India,* p. 36.

[4]Upendra Nath Ball, *Ram Mohun Roy: A Study of His Life, Works and Thoughts,*U. Ray & Sons, Calcutta, 1933, p. 181.

[5]*Mirat-ul-Akhbar*newspaper was to be published from Dharamtola on every Friday.

[6]A. R. Desai, *Social Background of Indian Nationalism,*Popular Prakashan, Bombay, 1976,p. 223.

[7]Nadig Krishna Murthy, *Indian Journalism,* p. 45.

Buckingham remarked that "the Editor is a Brahmin of high rank, a man of liberal sentiments, and by no means deficient in loyalty, well versed in the Persian language, and possessing a competent knowledge of English; intelligent, with a considerable share of general information and an insatiable thirst after knowledge."[1]

Mirat-ul-Akhbar, being aimed at a more cultivated public, possessed somewhat higher intellectual gravity. The effective editorials, most of them composed by Raja Ram Mohan Roy himself, focused their attention on significant political, social, religious, and philosophical questions, and discussed them thoroughly and in a very serious vein.[2]*Mirat-ul-Akhbar*newspaper drew the attention of the people as it dealt with all interesting topics and important issues. The nature of the newspaper gleaned from the contents of the first issue:

1. The Editorial note in which the Editor informs the general public that though such a lot of newspapers a published in Calcutta, there was none in Persian for the benefit of those who did not know English or Bengali.
2. Government regulation respecting the period of absence, that the servants of the Company could avail themselves of, on account of their health.
3. Differences with China.
4. Trial of John Hayes.
5. Release of prisoners on the King's Birthday
6. Cause of resentment between Russia and the Sublime Porte.
7. Exploits of Ranjit Singh.
8. Shipping Intelligence.
9. Report of crops in India
10. Pair of elephants for sale.
11. Price of Indigo and Opium.
12. Proposal of an English school in Delhi.[3]

In *Mirat-ul-Akhbar* much space was devoted to International affairs. The articles in this newspaper were primarily written by Raja Ram Mohan Roy. The editorials reflected his intense vision. These editorials translated into English were published in the Calcutta journal of James Silk Buckingham.[4]

---

[1]Amal Home (ed.), *Rammohun Roy: the Man and His Work,* Satish Chandra Chakravarty, Calcutta, 1933, p. 77.
[2]Iqbal Singh, *Rammohun Roy,* Asia Publishing House, Bombay, 1958, p. 290-291.
[3]Upendra Nath Ball, *Ram Mohun Roy: A Study of His Life, Works and Thoughts,*op. cit., pp. 181-182.
[4] G. N. S. Raghavan, *Press in India,* p. 15-16; See also, Nadig Krishna Murthy, *Indian Journalism,* pp. 41, 44-45; S. K. Aggarwal, *Press at the Crossroads in India*, pp. 15-16; J. Natarajan, *A History of Indian Journalism,* pp. 14-15; Sharad Karkhanis, *Indian Politics and the Role of Press,* p. 29; Sushila Agrawal, *Press, Public Opinion and Government in India,* p. 33.

The selected topics were very comprehensive, not merely to suit all tastes, but also to afford sufficient instruction. The newspaper*Mirat-ul-Akhbar* dealt with politics and current themes and issues. It also published articles on historical, literary and scientific subjects. It is mention worthy that the attention of the public was not only drawn to the issues and problems of India, however, also to the issues and problems, engaging the attention of the people in different parts of the world, like the Irish question, the Chinese problems, the struggle in Greece, etc.[1]

It was an extremely unusual phenomenon, Raja Ram Mohan Roy's *Mirat-ul-Akhbar,* not confined to giving the news of the day, such as floods, storms, robberies, construction of buildings and bridges; nor to write about burning or popular subjects such as *sati* or elopements; but to discuss the merits of the English constitution. It was something totally unprecedented. No othernewspaper, before this weekly, had ever dealt with either the advantages or the disadvantages of the English or any other form of the government. It was not a popular topic, and failed to possess the potentiality of developing into one.[2]

Raja Ram Mohan Roy vehemently opposed the British occupation of Ireland and in his *Mirat-ul-Akhbar* he wrote against this. Even, he also sent funds to help the famine-stricken people of Ireland.[3]

The comments appeared in the *Mirat-ul-Akhhar* related to the death of Bishop Middleton touched the Christian susceptibilities. In a Minute drawn up by W. B. Bayley of the Supreme Council regarding the tendency of the native Press the attitude of the newspaper is referred as 'exceedingly offensive'. A significant article on the Irish situation dealt with all the root causes of discontent, the Church question, the absent landlordism, the tithe, and other things. It exhibited the thorough grasp of the author of all the complexities that disturbed the British statesmen. The writer could strike all notes, from the serious to the satirical. He expressed his views and observations boldly and courageously.[4]

The press in India was coming under many rigorous rules. The influence of Raja Ram Mohan Roy's paper as well as critical writings of several other newspapers annoyed the rulers. William Butterworth Bailey, the Chief Secretary to the Government, made a catalogue of 'objectionable passages' in newspapers and submitted a lengthy minute on 10 October, 1822 in which he concentrated his main attack on *Mirat-ul-Akhbar.* About the press in India, Bailey frankly confessed, "The liberty of the press, however essential to natives of a free State,

[1]Upendra Nath Ball, *Ram Mohun Roy: A Study of His Life, Works and Thoughts,* p. 182.
[2]Subarna Ghosh and Asoklal Ghosh, *British India's First Freedom Movement, 1820-1830,* Firma KLM Pvt Ltd., Calcutta, 1933, p. 86.
[3]Saumyendranath Tagore, *Raja Ram Mohan Roy,* Sahitya Akademi, New Delhi, 1966, p. 37.
[4]Upendra Nath Ball, *Ram Mohun Roy: A Study of His Life, Works and Thoughts,* pp. 182-183.

is not, in my judgment, consistent with the character of our institutions in this country and with the extraordinary nature of their interests."[1]

The immediate fallout of the report was the notorious ordinance which the acting Governor-General Adam promulgated. It is known as Adam's Gag. The ordinance laid down:

> "Henceforth, no one should publish a newspaper or a periodical without having obtained a license from the Governor-General-in-Council, signed by the Chief Secretary. The application for license should give the name or names of printer and publisher, of the proprietors, their place of residence, the location of the press and the title of the newspaper, magazine, register, pamphlet or other printed books or paper."[2]

Raja Ram Mohan Roy stopped the publication of *Mirat-ul-Akhbar* as a protest against press regulation. In the last issue of the newspaper, he stated the reasons to discontinue the publication of the *Mirat-ul-Akhbar* in the prevailing conditions. He described three major difficulties to take this step:

First- Although it is very easy for those European Gentlemen, who have the honour to be acquainted with the Chief Secretary to Government, to obtain a License according to the prescribed form; yet to a humble individual like myself, it is very hard to make his way through the porters and attendants of a great Personage, or to enter the doors of the Police Court, crowded with people of all classes, for the purpose of obtaining what is in fact, already in my own option. As it is written:

آبرو که بصد خون جگر دست دهد

با مید کرم خواجه به دربان مفروش

(The respect which is purchased with a hundred drops of heart's blood,

Do not thou, in the hope of a favour, commit to the mercy of a porter)[3]

Secondly- To make Affidavit voluntarily in an open Court, in the presence of respectable Magistrates, is looked upon as very mean and censurable by those who watch the conduct of their neighbours. Besides the publication of a Newspaper is not incumbent upon every person, so that he must resort to the

[1]Sunit Ghosh, *Modern History of Indian Press,*Cosmo Publications, New Delhi, 1998, p. 68.

[2]Sunit Ghosh, *Modern History of Indian Press,*op. cit., 1998, p. 69.

[3]Sophia Dobson Collet, *The Life and Letters of Raja Ram Mohan Roy,*Sadharan Brahmo Samaj, Calcutta, 1962, p. 455.

evasion of establishing fictitious Proprietors, which is contrary to the Law, and repugnant to Conscience.[1]

Thirdly- After incurring the disrepute of solicitation and suffering the dishonour of making Affidavit, the constant apprehension of the License being recalled by the Government, which would disgrace the person in the eyes of the world, must create such anxiety as entirely to destroy his peace of mind. Because a man by nature liable to err, in telling the real truth cannot help sometimes making use of words and selecting phrases that might be unpleasant to Government. Here, however, I prefer silence to speaking out:

گدای گوشه نشینی تو حافظا مخروش

رموز مصلحت خویش خسروان دانند

(Thou, O Hafiz, art a poor retired man, be silent

Princes know the secrets of their own Policy)[2]

Raja Ram Mohan Roy and five other distinguished citizens of Calcutta submitted a memorial to the Supreme Court for hearing objections against it. The petition came to be known as 'Areopagitica of the Indian history'. The petition was rejected. Having failed to get any redress, Ram Mohan Roy made an 'appeal to the King-in-Council'. However the Privy Council rejected the appeal.[3]The activities of Ram Mohan and the five leading citizens of Calcutta in connection with the Press Ordinance of 1823 constitute a landmark in the history of India's struggle for freedom.[4]

In fact the daring act of Ram Mohan and his five associates inaugurates a new trend of political activity which was destined exercise special identity in India for nearly a century. As R. C. Dutt has justly observed that "it was the start of that system of constitutional agitation for political rights which their countrymen have learned to value so much in the present day."[5]

Raja Ram Mohan Roy not only used his newspaper as a platform forpolitical or polemical discussion. He looked upon them as a means of popular education, and through them he always tried to transmit useful knowledge to Indians. So, it was for this reason that he fought so hard to save his newspaper from the threatened extinction.[6]

---

[1]Sophia Dobson Collet, *The Life and Letters of Raja Ram Mohan Roy,*op. cit., p. 456.
[2]ibid.
[3] R. C. Majumdar, *The British Paramountcy and Indian Renaissance,* Part,II,BharatiyaVidya Bhawan, Bombay, 1961, p. 232.
[4] L. S. S. O'Malley (ed.), *Modern India and the West,* Oxford University Press, London, 1941, pp. 198-199, See also, R. C. Majumdar, *British Paramountcy and Indian Renaissance,* Part, II, op. cit., p. 233.
[5] L. S. S. O'Malley (ed.), *Modern India and the West,* op. cit., pp. 198-199; See also, R. C. Majumdar, *British Paramountcy and Indian Renaissance,* Part, II, pp. 233-234.
[6]Amal Home (ed.), *Rammohun Roy: the Man and His Work,*op. cit., p. 25.

To conclude, one has to acknowledge that the contribution of Raja Ram Mohan Roy's *Mirat-ul-Akhbar* is especially outstanding. *Mirat-ul-Akhbar* exhibited effective journalism in Vernacular language. It heralded a new era in journalism in India.

Bibliography:-

- Aggarwal, S. K., *Press at the Crossroads in India*, UDH Publishing House, Delhi, 1988.
- Agrawal, Sushila, *Press, Public Opinion and Government in India,* Asha Publishing House, Jaipur, 1970.
- Ball, Upendra Nath, *Ram Mohun Roy: A Study of His Life, Works and Thoughts,* U. Ray & Sons, Calcutta, 1933.
- Collet, Sophia Dobson,*The Life and Letters of Raja Ram Mohan Roy,* Sadharan Brahmo Samaj, Calcutta, 1962.
- Desai, A. R., *Social Background of Indian Nationalism,* Popular Prakashan, Bombay, 1976.
- Ghosh, Subarna, *British India's First Freedom Movement, 1820-1830,* Firma KLM Pvt Ltd., Calcutta, 1933.
- Ghosh, Sunit, *Modern History of Indian Press,* Cosmo Publications, New Delhi, 1998.
- Home, Amal , *Rammohun Roy: the Man and His Work,* Satish Chandra Chakravarty, Calcutta, 1933.
- Karkhanis, Sharad, *Indian Politics and the Role of Press,* Vikas Publishing House, 1981.
- Majumdar, R. C., *The British Paramountcy and Indian Renaissance,* Part,II, BharatiyaVidya Bhawan, Bombay, 1961.
- Murthy, Nadig Krishna, *Indian Journalism,* University of Mysore, Mysore, 1966.
- Natarajan, J., *A History of Indian Journalism,* Publications Division, Delhi, 1955.
- O'Malley, L. S. S., *Modern India and the West,* Oxford University Press, London, 1941.
- Raghavan, G. N. S., *Press in India,* Gyan, New Delhi, 1994.
- *Selected Works of Raja Ram Mohan Roy,* Publications Division, New Delhi, 1977,
- Singh, Iqbal, *Rammohun Roy,* Asia Publishing House, Bombay, 1958.
- Tagore, Saumyendranath, *Builders of Modern India:Raja Ram Mohan Roy,* Publications Division, New Delhi, 1973.
- Tagore, Saumyendranath, *Raja Ram Mohan Roy,* Sahitya Akademi, New Delhi, 1966.

Daud Ibrahim

Research Scholar, Department of History

Aligarh Muslim University, Aligarh

Conditions of women in medieval India: In context of Sufism

No study of any civilization could be complete without studying the status and conditions of women in that particular civilization. The tools to examine the greatness of any civilization is:- To study the status of women and their rights in historical context,and it is in this context, it is pertinent to study and examine the status of women and their rights during medieval period. I have tried my best to throw some lights on these issues. And an attempt has been made to underline the status and conditions of women in medieval India through *Sufism*.

Sufism played an important role to enrich the culture of India. *Sufis* played an important role to promote the composite culture of India too. This composite culture is one of the greatest contribution of medieval India. *Sufi* saints has promoted spirituality through love and affection in contrast of fundamentalism and superstition. They have opened their doors irrespective of gender, caste, creed or religion.Fromthe very beginning*Rabia al-Adaviyya*[1]played an important role to promote *Sufism*and established herself as a *Sufi* saint.[2] As a matter of fact, from the very early stage of *Sufism* women played an important role to promote *Sufism* in India.

Pre-medieval India the condition of women is noticeable, for example *Parda* system, *Sati* system, *Jauhar* and child marriage etc have weakened the condition of women. It is another matter rulers like Muhammad bin Tughlaq and Akbar have tried their best to stop these customs,and in that period, *Sufi* saints have tried to bring equality betweenmen and women on the ground through spirituality. In the light of these things, the quote of the great *Shaikh Nizam ud-Din Auliya* is very important to condemn the discrimination between men and women.

"When a Lion comes out of den or forest then no one ask the about the sex of lion. And like this ancestors of human beings should show love and affection to almighty and obey his command irrespective of gender."[3]

---

[1]Rabia was born in 739 A.D in Basra. Rabia is known for her selflessly and unconditional love to God. Rabia has given a theory of complete devotion to God.; S.A.A. Rizvi, *A History of Sufism in India*, vol-1, Delhi 1978, p-30

[2]Ibid.

[3]Shaikh Abdul HaqMuhaddisDehalvi, *Akhbar ul- Akhyar*, urdu trans. By Maulana Subhan Mahmood and Maulana Muhammad Fazil, Akbar Book Sellers, Lahore, 2004, p.565

In medieval period, there were many female saints who were fame. Bibi Sarah was known as a female saint who was the mother of Shaikh Nizam ud-Din Abul Moid.[1]According to Shaikh Abdul HaqMuhaddisDehalvi (d.1642 AD), there was a time when there wasdrought in Delhi, then Nizam ud- din took a thread from the cloth of his mother (Bibi Sarah) and then prayed and then it started raining in Delhi.[2] The mother of Baba Farid ud-Din Ganj i- Shakar (d.1271) was a devout female *Sufi* saint. It is told about her spiritual power that once she was offering *Namaz* in the night and while she was praying, a thief came into her house and see her, then thief became blind. The thief apologized to her and she forgave him and cured his eyes. The thief was very much impressed by her spiritual power and noble act. Next day he came to her house with his all family members and accept Islam.[3]

Baba Farid have described about another women Bibi Fatima Saam, who was resident of Delhi, as a highly spiritual woman. Bibi Fatima used to call Baba Farid and his brother Nazeebud-Din as her brothers. According to *Akhbar ul-Akhyar*, to fed the hungry and to drink the thirsty is better than offering *Namaz* in thousand nights and fasting.[4] After the death of Bibi Saam, Shaikh Nizam ud-Din Auliya used to go to her *Mazar* for prayer and his spiritual peace.[5] Mother of Shaikh Nizam ud-Din Auliya, Bibi Zulekha, is a lady of great spirituality. The caring and nurturing of Shaikh Nizam ud-Din Auliya and his education and spiritual training was under her guidance. Shaikh Nizam ud-Din himself used to go to her *Mazar* regularly and for spiritual guidance, he used to be there.[6]

Shaikh Naseer ud-Din Chirag i-Dehalvi (d. 1356AD) described about one sufi women Bibi Fatima,had one maid who used to offer two *Roti* and one glass of water to her in the evening by her acquired wealth through labour, and that stuff is sufficient for Bibi Fatima for whole day. She devoted every minute of her life to God. According to Shaikh Naseer ud-Din, the life of Bibi Fatima is the best example of true saint.[7]

According to Shaikh Abdul HaqMuhaddis, Bibi Auliya was famous Sufi saint for her devotion to God during the time of Muhammad bin-Tughlaq. Son and husband of Bibi Auliya were too Sufi saints. Sultan Muhammad bin-Tughlaq had immense respect and belief for her.[8]

---

[1]Ibid
[2]ibid
[3]*A History of Sufism in India*, vol-1, p.139
[4]*Akhbar ul-Akhyar*, urdu trans., pp.565-66
[5]Ibid, p.565; Bibi Fatima's cottage was in old Indraprastha. From the 14th-16th century, it was famous as a sacred site, but in the 17th century, it lost his glow and glory.; see, *Akhbar ul-Akhyari*urdu trans., pp.565-568
[6]K.A. Nizami, *The life and times of Shaikh Nizamuddin Au*liya, Idara I Adbiyat, delhi, 1991,p.23; *Akhbar ul Akhyar*urdu trans., pp.568-70
[7]*A History of Sufism in India*, vol-1, p.403
[8]*Akhbar ul-Akhya*rurdu trans., p.570

Female Sufi in the form of *Khalifa*[1]

In the *Silsila* of *Sufis,* there is a description of women *Khalifa* too. Although to become a *Khalifa*for a women what kind of difficulties had to been faced, is described by Shaikh Abdul QuddusGangohi (d.1537 AD).[2] Even though what we found is that from the very beginning of Sufism in India, women has been appointed as *Khalifa.*

Early Chishti Sufi saint Khwaja Moinuddin Sizzi Chishti (d.1235 AD) daughter Bibi Hafiz Jamal has been described as one of the forty *Khalifa.*[3]According to *Bazmi-Sufiya*, Bibi Jamal used to teach women folk about different *Shariyat* and also used to give them spiritual education. According to some experts, she had right to teach disciple of the sect.[4]The*Khalifat* of Bibi Hafiz Jamal is confirmed by *Mirat ul-Asrar* (written by Shaikh Abdurrahman Chishti) and *Khazinat ul-Ashfiya* (Shaikh Ghulam Sarwar Lahori).

And like this, we found another female Sufi saint HazratSyyadaJanab Khatoon (d.1342 AD) who is popular as Roshan Bibi. She was called *Pirani* who may be the female version of *Pir*. In West Bengal, in her tomb *Urs* (anniversary) is celebrated in the month of *chaith*in every year.[5]

According to *Mirat ul-qaunen*, Bibi Maimuna is described one of those six Sufis who memorized the whole *Quran*.[6]In addition to that we found female Sufi order (*Silsila*). Baan Bibi of Bengal who is Sufi and in whose name Bibi community had been developed which was confined to female only.[7]

In 15th-16th century, famous *Sabiri* Chishti saint Abdul QuddusGangohi appointed his own disciple Babu Islam Khatoon to teach the disciple.[8] Like this, we found another female Khalifa Musammat Bibi Nusrat in the biography of saint Shahbaz Mohammad Devri written by Abdul Gaffar Ansari.[9]

There are two examples of female Khalifa in 18th century too. The famous Naqshbandi Saint Mirza Mazhar Jane Janan (d.1781AD) had described it. First

---

[1]The meaning of the word Khalifa is representative. In Sufism the meaning of Khalifa is to appoint his own disciple as spiritual representative and gave him the right to teach the other disciples.

[2]Sayyad Hasan Askari, HazratAbdul QuddusGangohi, Patna University Journal, vol-11,1957, p.16

[3]P.M. Currie, *The Shrine and Cult of Mu' In Al-Din Chishti of Ajmer*, Oxford University Press,1989, pp.22-24

[4]J.A. Subhan, Sufism its Saints and Shrines, New York, 1970, p.206; V.R. Jones and L. Bevan Jones, *women inIslam*, Lucknow, 1941, pp.307-309

[5] Amit day, Sufism in India, CalcuttaRatnaPrakashan, no dated, pp.8-10

[6]Maulvi Ghulam Nabi Firdausi, *Mirat ul-Qaunain*, pp.235-236

[7]Jane Smith, Women in contemporary Muslim, Associated University presses, Cranbury,1975, p.198

[8]Sayyad Hasan Askari, p.16

[9]Musammat Bibi is also mentioned in *Tazkirai-Sadiqa*. It was the 31st successor of Shahbaziya Khanqah located in Bhagalpur. See, Abdul Gaffar Ansari, Hazrat Maulana Shahbaz, p.17

was his wife and second was his close's *Khalifa*SanaullahPanipati's wife. These two women had the right to teach the disciples.[1]

It is cleared from the above-mentioned examples that women were appointed as *Khalifa.* Although these kind of sources where women is appointed as Khalifa is limited. For example,Ruth Roded has said in his study of women that many women had been given the title of Shaikh but these women were not engaged in*Piri*- disciple traditions, though they were taking care of Khanqah and used to teach the disciples or resident who were residing there.[2] Baba Farid had told that if women will be made *Khalifa* in Sufi order then his daughter Bibi Sarifa was the perfect choice.[3] In medieval period, Sufism provided solace to many burning questions related to women. And through its liberal teaching and philosophy, it became possible to break many barriers and could achieve some equality in public places.

Sama Mahfil and Women

Usually, women were prohibited to enter into these kinds of mehfil and their participation were not encouraged. Even though we have found some examples of Sufi female singer. Claudia Liebeskind have mentioned in his study of Chishti order that a branch of Chishti order, *KarimiaNaiemia Dargah* Salon, UP, only female *Sufi* singer were singing for female only.[4]Like this we have the example where women were allowed as audiences although their presence in Sufi Sama was limited.[5]

In short, it can be said about Sama that as a rule, women were prohibited to enter into these kinds of programmes and during medieval period this was the exclusive domain of men.

Women's role in Khanqah

In medieval period, we found the different role of women in managing the Khanqahs in Sufism. According to Amir Khusro, disciple of saint Nizam ud-Din Auliya, different kinds of system were established to participate the women in Khanqah.[6] Bibi Rani is the leading example who was the disciple of Shaikh Nizam ud-Din Auliya and used to take care of his disciples.[7]

Sufism and Women Education

There are many glaring examples of women education and it was encouraged during Sufi order. For example, mother of Shaikh Nizam ud-Din Auliya has

---

[1]Muhammad Umar, Islam in Northern India during eighteenth century, MunshiramManoharlal, New Delhi, 1993, pp.80-83

[2]Ruth Roded, Women in Islamic Biographical Collection: From Ibn Sa'adto Who's Who, Lyne Rienner Publishers, London, 1994, p.106

[3]A History of Sufism in India, vol-1, p.150

[4]Claudia Liebeskind, *Piety on its Knees: Three Sufi Traditions in South Asia in Modern Times*, Oxford University, Delhi Press, 1998, p.151

[5]Amir Hasan Sizzi, Fawaid al-Fawad, English trans. Spirituality and literary discourses of Shaikh Nizamuddin Auliya by Ziaul Hasan Farooqi, New Delhi, 1996, p.435

[6]A. Rashid, Society and Culture in Medieval India 1206-1556, Calcutta, 1969, p.140

[7]ibid

attended higher spiritual education. She herself educated her son and brought him to Delhi. Like this, Hafiz Bibi Jamal had memorized the whole Quran. Bibi Hafiza Jamal or Bibi Fatima mother of Shaikh Sar fud-Din bu Ali Qalandar Panipati was a famous Sufi saint. She had memorized the whole Quran that's why she is popularly known as Bibi Hafiza. Her *Dargah* which is in Panipat is famous as a '*maiejiki Dargah'*.[1]

Khanqah of Shaikh Sarfud-Din Yahya Muneri who was from Firdausi Order in Bihar was famous for the centre of education.[2]Father-in-law of Shaikh Muneri, PirJagjot who was saint of Suhrawardi Order, encouraged his four daughters for education. Later these four women became fame as Sufi Saint.[3]In present time too, people acknowledge the early Sufi Saint of Firdausi Order as their role model.

Conclusion

It is crystal clear by studying the Sufi literature that women were given equal rights and space in spiritual field and great Sufi Saints has strengthen the position of women in the society. In *ZamatKhana* (Khanqah) of Baba Farid everyone was equal irrespective of gender. Like this, Shaikh Nizam ud-Din Auliya equally done *Ba'it* (submission) to men and women. Two female disciple of Nizam ud-Din Auliya is mentioned in his early disciples.

In *Malfuz*literature, we found that Sufi Saints were liberal and treated men and women equally. In fact, Sufi Saints and in their Khanqah while women and men were treated equally in spiritual field, and on the otherhand, attempts were made to create an environment where women can be trained to claim the equality in their behaviour in public places.

Like this, it can be said that it is the impact of Sufism which could be noticed in the Mughal family.

In medieval period, Sufism played an important role to make and provide women their due respect and rights in the society. It is due to Sufism, our society became more open, inclusive, liberal and reformative. Same kind of work has been done by bhakti Saints. In short, it can be said that during medieval period, the seeds of women-men equality, liberal, society, inclusive growth has been sown by Sufi- bhakti Saints.

[1]Aziz ud-din Hussain Hamdani, *SarfuddinShaikh Bu Ali Qalanderpanipati his life and teaching*, IdaraiAdbiya, Delhi, 2010. P.11

[2]Syyad Shameem Munammi, Hazrat Makhdoom Jahan Shaikh Sarfud-Din yahyaMuneri: Jeevan aur Sandesh, Baikas Shareef Khanqah i- Muazzam, 1998, p.4

[3]Kelly Pemberton, Women Mystics and Sufi Shrines in India, Ph.D. Dissertation, Columbia University, 2000, p.176

Sadira Shahnaz

Research Scholar, Department of History

Aligarh Muslim University, Aligarh

Bhakti Movement in Awadh: A Historical Study of Jagjivan and Satnami Tradition

In the scenario of India, during medieval period emerged *bhakti* movement which was an idea of worship of one God those who is incorporeal and insentience. This is very difficult to put here an exact definition of *bhakti.Srimadabhagwatgeeta* remarked some characteristic of a *bhakt*. In this text Krishna counted many qualities of devotee viz. devotion to a God, worship a *sagun* deity, fully dedication, good behaviour along with other people etc.[1] It may also be said that the definition of bhakti as *'personal devotion to personal God'*.[2] The word *bhakti* came from root word *bhaj*mean to cherish or to surrender. It was an emotional devotion and affection towards to universal God which became in the form of arbitrary and attribute. Yusuf Husain also divided into two category the period of *bhakti* on the basis of chronological way i.e. from early medieval to twelfth century and after till sixteenth century.[3] At the time of thirteenth century, the scenario of India became changed because of Islam entered in India with the idea of 'universal brotherhood'. Therefore, the lower caste of people intensely leans towards Islam. It may be also said that, the branch of *nirgunbhakti* was the resolution of Islam. The practice nature of universal brotherhood was followed by Sufi saint of India. The emergence of bhakti movement may be traced in earlier times of *Upanishad*. In the Vedic text named *Rig-Veda* also remarked some mantras into the devotion of lord Vishnu and make a prayer for the happiness, health and wealth.[4] But contemporary scholar argues that the birth of bhakti movement emerged in the area of south India with the spearhead of Shankracharya's (8th c.) *Advaitvada*.[5] The bhakti saint of south India were divided into two branches viz. *Alvara*, the follower of Vishnu, and

---

[1]Shivanand (ed. & tr.) *GeetaDivyamrit,*SarvaSevaSamghaPrakashan, Varanasi, 2007, pp. 190-198. The Geeta also describe about karma and wisdom philosophy. The aim of all philosophy of karma, wisdom and bhakti are moksha.

येतुसर्वाणिकर्माणिमयि संन्यस्य मतपराः । अनन्येनैव योगेनमां ध्यायन्तउपासते

[2]Tara Chand, *Influence of Islam on Indian culture,* The Indian Press (Publication) Pvt. Ltd., Allahabad, 1936, p. 19.

[3]Yusuf Husain, *Glimpses of Medieval Indian Culture,* Asia Publishing House, Bombay, 1957, pp. 06-07.

[4]N. N. Bhattacharya (ed.), *Medieval Bhakti Movement in India,* MunshiramManoharlal, Publishers Pvt. Ltd., Delhi, 1989, p. 58.

[5]Krishna Sharma, *Bhakti and the Bhakti Movement a New Study in the in the History of Ideas,* Munshiram Manohar Lal Publishers Pvt. Ltd., New Delhi, 1984, p. 07.

Nayanara who were the devotee of Shiva.[1] After that, Ramanuja became the most important saint who carried to bhakti in north India and introduced it as *Vishistadvetavad*.[2] In the twelve and thirteenth century, Madhvacharya, Nimbarkacharya, and Vallabhacharya established their philosophical ideology and demarcated the path of love along with *Brahm*. [3] The bhakti movement became in two streams i.e. *nirgun* and *sagun* (attribute) and each branch also divided into two categories viz. in *nirgun* were *gyanasrai*and *premasari*, while in the *sagun* stream there were *Ramabhakti* and *Krishnabhakti*. The partisan of *nirgun* tradition were believed into the characteristics of unseen God *(brhama)*, which is unlimited, unshaped, and could not caught by any immunization and who is immortal.[4]

Jagjivan was born in 1672 A.D. in a Chhatriya family at house of Chandel Thakur by caste, in the village Sarhada(Kotwa) in Barabanki district.[5]He was a follower of Satnami tradition and their disciplesalso became a part of that tradition after his spiritual teacher. Jagjivan's followers say they were actually disciples of a VisvesvaraPuri; based on their principles, they established their *Satnami* community and were residents of Mahatma Puri called Kashi. But there is no trace of this VishveshvarPuri. Jagjivan had spent a household life. Because of the envy of some people, he had to leave the Sarhada and settled in Kotwa, where he stayed till the end. Jagjivan died in 1761 A.D. They died in Kotwa, the *samadhi* of Jagjivan is also present in Kotwa village itself.

Jagjivan penned even books named '*Shabdsagar*', '*Gyanprakash*', '*Prathamgrantha*', '*Agampaddhati*', '*Mahapralay*', '*Premgrantha*' and *Aghvinash*. Of these, only '*Shabdsagar*' is published in two parts in the name of Jagjivan's Bani from the Belvedere press, Prayag. This volume is a collection of various verses of Jagjivan, giving a beautiful introduction to his simple heart and strong Godliness. In this volume, they have given the name of God mostly '*sat*'. He has also revealed his anguish to him as *nirgun,* eternal, doer, and supreme indulgent, supernatural man. They depend on themselves in all respects and for all things as the same one. Say that whatever we do is by the same. That is why they consider the free stage to be suspended for the same grace and insinuation, and pray to him again and again for this purpose. They consider the most important means of attracting him to his memory of '*Satnam*'. Based on its in sound, we also see the views of the Gagan Mandal. They also describe the *tamasa* that I have seen myself, just as I will look, I will not hide.[6]They advise seekers that it is not advisable to distinguish themselves by doing *Satnam* and

[1]N. N. Bhattacharya, op. cit., p. 174.
[2]Tara Chand, op. cit., pp. 80-84.
[3]Tara Chand, op. cit., p. 67.
[4]BabuLahana Singh, *Kabir Kasauti,*Lakshmivenketeshwar Steam Press, Mumbai, Samvat 1982, p. 10. In this text, Kabir also remarked some features of the Para-Brahma.
[5]William Crooke, The Tribes and Castes of the North Western Provinces and Oudh, Government Printing Press, Calcutta, 1896, vol.4, p.299
[6]Jagjivan Bani, p.99-100

Bhajans. By saying everything in manifest form, all his happiness is lost and all knowledge of Sant mat is destroyed. They drink the nectar of the *satnam* juice and give more emphasis on the mind being merry. They say that the uniqueness of that experience should not be even in the state of our daily life,[1] but also in the world, it should be considered a new one from the world.[2] He considered it preferable to follow moral ideals for mutual behaviour within society. He has considered the truth, non-violence, benevolence and life as the best, and has mostly given many sermons by aiming towards these things. In one place in his book called '*Mahapralay*', he said, 'the pure great man is also the most isolated among all, he has no attachment to anything. He knows what he can know. No investigation is required, he does not come, neither learns nor teaches, cries, sighs, he argues himself. He has no happiness, nor does it hurt, he does not anger, nor provides forgiveness. There is no foolish monk for him. Jagjivan says whether there is anyone who is so devoid of weakness and does not fall into vain promises even living in human society.[3]

There were many disciples of Jagjivan, at least two of whom are also told to be Muslims. His great Hindu disciples are Gosai Das, Dulandas, Devidas, Khemdas, one *Upadhyay* and a *chamar* more famous. There are also some versed letters of Jagjivan written in the name of Dulandas and Devidas, five of them have been ranked in the second part of the Bani published by belvedere press, Prayag. Gosaidas is said to be the first disciple of Jagjivan.[4]The four great disciples of Jagjivan,Gosaidas,Dulandas, Devidas and Khemdas are known as Charpava. There are separate sects of these four and their disciple traditions have also been distinguished.

Jagjivan describes the glory of guru and says who can sing the glory of all scriptures and evidences. The Vedas and Purana all say, all the views may be different, but proof can only be the word of the guru. So, there is welfare in the steps of that guru.[5]

Sant Jagjivan said that devotion cannot happen without guru's grace. All external pageantry like Yagya, Vrat, Tirtha, Veda Gyan, Pranayama etc. are all futile.

Jagjivan was very impressed with Kabir. Like Sant Kabir, Jagjivan also fiercely opposed religious pageantry. He has portrayed social anomalies through religious sentiments. Jagjivan has described the social inconsistences prevailing in his era. Under the 'Chetavni' title, they say themselves through the mindset of the egoistic people who consider themselves to be the greatest: 'There is a way in the world that no one believes in the world like himself, there is a plethora of things here, they constantly earn by committing a lot of sin. They have been

[1]Jagjivan Bani, p.53
[2]Jagjivan Bani, p.101
[3]H.H. Wilson: Religious Sects of Hindus, p.358
[4]Sant Parchai
[5]Guru and Shabd Mahima, Shabd 2

saying, who is like us, and because of a little wealth, the have wandered away. At the end of the time, they are compelled to leave everything and regret why Ram was not remembered. Jagjivan says, o earthly arrogant man! You understand fully walk on the path of truth. This whole world is false, so you can take your mind and Bhajan Ram.[1]

Thus, it can be said that Jagjivan stakes social anomalies and religious superstitions. According to him. Whoever follows the words of the Guru in inner terms and in mind is the true worldly man. His own conduct is the interest of the society.

Beerbhan, the founder of the *Satnami* sect, was a contemporary of*sant*DaduDayal. *Satnamis* also call themselves "Sadh". Beerbhan preached monotheism. The name given by him to God was *Satnam*, i.e., he whose name is truth. The *Satnamis* are against the caste-system and untouchability. They inter-dine and inter-marry amongst themselves. Divorce is permitted among them. The *Satnamis* are against idol-worship and lay stress on meditation, moral character and the equality of all human beings. They established 12 commandments, which was take of from other religions like Hindu and Muslim, and follower of *Satnami*devotees, that commandments noted in *Adi Updesh*, the Bible of the *Satnamis*.[2]

Similarly, the term *Satnami* was used for those who emphasised on the recitation of s*atnam* (true name). Almost all the*nirguna*bhakti sects emphasised on the importance of the recitation of the name *satnam*.[3] Thus the word *satnami* also had wider acceptability.

[1]Jagjivan Bani, Part-1, Shabd-33, p.44-45

[2]Pandit Sunderlal, How India Lost Her Freedom, Sage Publication, Delhi,2018, p.

[3]Muhsin Fani, Dabistan-i-Mazahib, Lithographed, Munshi Nawal Kishore, p.200